ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

سوانح اور علمی و ادبی خدمات

ممتاز اختر مرزا

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

HaSnain Sialvi

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

سوانح اور ادبی خدمات

مصنفہ

ممتاز اختر مرزا

پیش لفظ

ڈاکٹر ممتاز حسن
ستارۂ پاکستان

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ لاہور

بار اوّل ——————— 1961

تعداد ——————— ایک ہزار

محمد اشرف ڈار (ایڈمنسٹریٹو آفیسر)

نے حمایتِ اسلام پریس لاہور سے

چھپوا کر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کے لیے شائع کیا

امی جان اور ابا جان

کے نام

جن کی دعا میرے لیے انشراح صدر

کا باعث ہوئی

اچھے بہن بھائیوں اور پُر خلوص دوستوں

کے نام

جن کی ہمدردانہ حوصلہ افزائی

کام کی راہیں ہموار کرتی رہی

پیش لفظ

خلیفہ عبدالحکیم ایک جامع کمالات اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ یہ ہمہ جہتی اور ہمہ گیری اسلامی ثقافت اور روایت کا حصہ ہے اور خلیفہ صاحب کو اگر اس روایت کا نمایندہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

خلیفہ صاحب کی طبیعت فکر اور وجدان دونوں سے یکساں طور پہ ہم آہنگ ہے اور یہ دو مختلف النوع قوتیں ان کی ذات میں ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک ہی قوت بن گئی ہیں۔ وہ علم اور شعور کے کسی شعبے میں بھی قدم زن ہوں، فکر اور وجدان ایک مشترک تخلیقی عنصر کی حیثیت سے ان کے ہمراہ نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں وہ فکر جو تصوف کے ہمدوش ہے، فکر جو شعر میں جاری و ساری ہے اور وہ فکر جو اسلامی اقدار کی تشریح و تعبیر کا ذریعہ ہے، وجدان اور باطنی کیفیات سے الگ نہیں۔ یہی سبب ہے کہ افکار میں منہمک ہونے کے باوصف خلیفہ صاحب کا تعلق "دل" سے ہمیشہ قائم رہا۔ عام گفتگو اور فکری موشگافیوں میں وہ جہاں ہیگل، کانٹ اور برگساں جیسے فلسفیوں کے حوالے بے تکلف اور برمحل دیتے تھے، وہاں سلطان باہو کا یہ مصرعہ بھی اکثر اُن کی زبان پہ رہتا تھا:

دل دریاؤں سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے

خلیفہ صاحب ایک متبحر عالم ہونے کے باوجود ایک محفل آرا، شگفتہ بیان، بذلہ سنج اور خوش طبع انسان تھے۔ ان کی شگفتگی اور خوش طبعی دراصل ان کی انسان دوستی اور

انسان نوازی کی مظہر تھیں۔ ظرافت اور بذلہ سنجی نے اُن کی شخصیت میں ایک ایسی لچک اور لطافت پیدا کردی تھی جو ان کے وسیع اور وقیع علم کو ثقالت اور یبوست کا جامہ پہننے نہیں دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مثالی معلّم تھے جس استاد پر اس کا علم بوجھ بن جائے وہ دوسروں تک بیزاری اور بے کیفی کے سوا کچھ منتقل نہیں کرسکتا۔ افکار کا وہ نادر سرمایہ جو خلیفہ صاحب کے دماغ کی زینت تھا ان کے سر کا گھٹڑ یا کمر کا پشتارا نہ بن سکا اور یہ ان کی عظمت کا ایک اہم پہلو تھا۔

خلیفہ صاحب ہر شخص کی انفرادی صلاحیت کا اندازہ کرکے اس کی قدردانی کرکے اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا جانتے تھے۔ کسی ادارے یا مجلس کی سربراہی یا کسی تحریک کی قیادت کے لیے جو چیز لابدی ہے، وہ یہی ہے کہ قائد اپنے ہر پیرو کی صلاحیتوں پر نظر رکھے اور ان کی نشوونما میں کوشاں رہے ہر ایک سے وہ کام لے جو وہ دوسروں سے بہتر کرسکتا ہو۔ ہر ایک کو اپنے آپ سے قریب رکھے اور کسی کو ایک دوسرے سے متصادم نہ ہونے دے۔ خلیفہ صاحب جب حیدرآباد سے آنے کے بعد ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ناظم مقرر ہوئے تو یہی وہ خوبیاں تھیں جنھوں نے ان کی کوششوں کو غیر معمولی کامیابی بخشی۔ وہ اس ادارے کے بانی بھی تھے اور معمار بھی۔ یہ ادارہ ان کی زندگی تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس سے ان کی وابستگی من تو شدم تو من شدی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ مجھ سے جب بھی ملتے ادارے ہی کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ اپنی ناگہانی وفات سے آدھ گھنٹہ پہلے تک وہ اسی ادارے کی فلاح و بہبود کی خاطر حکام بالا سے ملاقات کرنے میں مشغول تھے۔

خلیفہ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ عہد حاضر کے فکر و فلسفہ کی روشنی میں اسلامی افکار کی وضاحت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو ان کے کسی خیال یا رائے سے اتفاق نہ ہو لیکن ان کا علمی کام بجائے خود اتنا اہم ہے کہ اقبال کے بعد اسلامی فکر اور فلسفے کے میدان میں ان کا ہم پایہ مشکل سے دکھائی دے گا۔ انھوں نے اپنے شگفتہ اسلوب اور عام فہم اندازِ تکلّم سے فلسفے کے خشک اور دقیق مضامین کو عوام و خواص کے لیے آسان اور قابلِ فہم

بنا دیا ہے۔ وہ اسلامی افکار اور مذہبی نکات و رموز کو روایتی علما سے بہتر سمجھتے تھے اور بہتر سمجھا سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے لیے ان کی تحریریں ایک قابلِ قبول رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خلیفہ صاحب نے جس قدر لکھا اس سے کہیں زیادہ علمی صحبتوں میں گفتگو کے ذریعے بیان کیا۔ ان کی تحریروں کی ایک بڑی تعداد احباب کے تقاضے اور اصرار کی مرہونِ منت ہے۔ مگر یہ سب تحریریں ان کی پہلو دار شخصیت کا مکمل طور پر احاطہ نہیں کرتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ عبدالحکیم کی ساری گفتگوؤں اور ساری تحریروں کو بھی جمع کر پائیں تو ان میں ان کی شخصیت کا ایک جزوی پرتو نظر آئے گا۔ مگر خود عبدالحکیم اس نتیجے سے دور کھڑے مسکرا رہے ہوں گے۔ اگر وہ اتنے بلند پایہ مجلسی انسان نہ ہوتے تو ہمیں ان سے بہت سی اور تصنیفات کی توقع کرنی چاہیے تھی۔ آخر عمر میں انھیں لکھنے کا کچھ کچھ خیال ہو چلا تھا۔ مگر اس خیال کو استقلال نصیب نہ ہوا۔

خلیفہ صاحب کی ایک خوبی جو ہمارے دور میں نادر سے نادر تر ہوتی جا رہی ہے وہ ان کی ناقابلِ فراموش بے تکلفی اور زندگی سے بھرپور شگفتگی تھی۔ اگر آپ کی اور ان کی طبیعت میں کوئی قدرِ مشترک موجود ہو یا خود ان کے الفاظ میں آپ دونوں ایک ہی WAVE LENGTH پر ہوں تو ان سے دوستی ہونے دیر نہ لگتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ان سے وہ تعلقِ خاطر پیدا ہو سکتا تھا جو عام طور پر برسوں گزر جانے پر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ خود میری اور ان کی دوستی کچھ ایسی ہی نوعیت کی تھی۔

ایسی ہی ایک دوستی خلیفہ صاحب اور حافظ شیرازی کے درمیان بھی تھی۔ خلیفہ صاحب خود کہتے تھے: ”میں اور حافظ ایک ہی WAVE LENGTH پر ہیں“ خلیفہ صاحب اکثر زندگی کے مسائل اور اہم مرحلوں کے متعلق حافظ سے مشورہ طلب کرتے تھے۔ وہ دیوانِ حافظ سے نہ صرف فال لے کر اپنے پروگرام مرتب کرتے، بلکہ ”روحِ حافظ“ کو بھی ہر وقت اپنے قریب محسوس کرتے تھے۔ میں نے حافظ کا اتنا گہرا دوست کوئی نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

عزیزہ ممتاز اختر مرزا نے خلیفہ عبدالحکیم پر یہ کتاب لکھ کر ایک نہایت اہم علمی خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے نہ صرف مواد کی جمع آوری اور تحقیق و تفحص میں محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ بلکہ مواد کی مناسب تدوین اور تشکیل میں بھی ان کا سلیقہ قابلِ تعریف ہے۔ ممتاز اختر مرزا نے اس کتاب کے ذریعے اس انسان دوست مفکر، ادیب، شاعر اور معلّم کی زندگی اور اس کے فکری کارناموں کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنی علمی مساعی جاری رکھیں گی۔

ممتاز حسن

۱۳ جون ۱۹۷۱ء

حرفے چند

علامہ اقبال کے بعد دنیائے اسلام میں ڈاکٹر عبدالحکیم کے فلسفہ و فکر کو اہم مقام حاصل ہے۔ خلیفہ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت فلسفہ، ادب، تاریخ اور مذہب غرضیکہ علوم و فنون کے بے شمار گوشوں پر حاوی نظر آتی ہے۔ ایک مثل مشہور ہے کہ گھنے درخت کے نیچے گھاس بھی پروان نہیں چڑھتی، علامہ اقبال کے فکری اور شخصی مقام کے مدِنظر یہ باور کرنا ممکن نہ تھا کہ اس عظیم مفکر اور فلسفی کے بعد اس مقام کو کوئی اور شخص بھی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن خلیفہ عبدالحکیم کی شخصیت اور سوانح کا مطالعہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ خلیفہ صاحب نے اقبال کی زندگی کو مشعلِ راہ بنایا۔ ان کے سوجھائے ہوئے راستے پر چل کر ملتِ اسلامیہ کے لیے پیغامِ اقبال کو نہ صرف قابلِ فہم بنایا، بلکہ خود اقبال کی اس رباعی کی زندہ تعبیر بن گئے، جس میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

خلیفہ صاحب نے علامہ صاحب کی زندگی کے ہر شعبے سے اثر قبول کیا۔ انھیں اسلام کی محبت اور سوز و گداز بھی علامہ اقبال کی زندگی سے ملا اور مسلمانانِ پاک و ہند کی سربلندی اور استحکامتِ فکر کا جذبہ بھی۔ فلسفے اور مذہبی عقائد کے علاوہ ادب میں بھی خلیفہ صاحب نے علامہ اقبال کے اسلوب کو مدِنظر رکھا۔ اقبال سے متاثر شعرا کی

فہرست چاہے جس قدر بھی محدود کر دی جائے خلیفہ صاحب کا نام اس میں اوّلین رہے گا بلکہ خلیفہ صاحب کی شاعری کے بارے میں تو علامہ تاجور نجیب آبادی نے بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا :

"ڈاکٹر اقبال کے بعد پنجاب بھر میں آپ سے بہتر کوئی شاعر نہیں"

خلیفہ صاحب کا نظریۂ حیات اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی محبت سے سمجھا جا سکتا ہے۔

خلیفہ صاحب پر تحقیقی کام کا آغاز میں نے آج سے تین سال قبل کیا تھا۔ یہاں اس جگہ ان مصائب کا بیان برمحل نہیں بلکہ جو مواد کی فراہمی کے سلسلے میں پیش آئے۔ خلیفہ صاحب کے بارے میں جو کچھ مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مواد ملا اس میں سوائے خراجِ تحسین اور تعریف و توصیف کے کچھ نہ تھا۔ میں نے سوانحی کڑیوں کی فراہمی کے لیے جو ہفت خواں طے کیے ہیں۔ اس کا اندازہ باب اوّل کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ کاش کہ پاکستان میں خواتین کو بھی علمی کام کے لیے ایسی سازگار فضا میسر آ جائے جو مردوں کے لیے نام آوری کا سبب ہے۔

تحقیق و جستجو کے سلسلے میں جب مطبوعہ مواد نے بے بسی اور تشنگی ظاہر کی تو "صحیح مواد" حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ خلیفہ صاحب کے اہلِ خانہ، معاصرین، دوست اور عزیز و اقارب سبھی اس فہرست میں شامل تھے۔ میرا یہ دعویٰ کہ سوانح کی ہر کڑی میری ذاتی کوشش سے فراہم ہوئی، کچھ زیادہ درست نہیں ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ ان میں سے ہر شخص کی گفتگو افشائے راز کے سلسلے میں روشنی کی ایک کرن تھی، میرا کام ان کرنوں کو ایک وحدت میں پرو کر خلیفہ صاحب کی شخصیت کا ہالہ مرتب کرنا تھا۔ اب جہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سوانحی تحقیق کے سلسلے میں اب کوئی شعبہ تشنہ نہیں رہا، وہاں یہ بھی کہہ دینا مناسب ہے کہ ہر نئی دریافت کو بغیر جانچ پڑتال اور پرکھ کے قبول نہیں کیا گیا۔ کوشش کی گئی ہے کہ تمام واقعات حتی الامکان قرینِ صحت ہوں۔

حرفے چند

خلیفہ صاحب کے فکر و فلسفہ کی تعیینِ قدر اور ادبی تجزیے میں میری رائے کئی مقامات پر خلیفہ صاحب کے نقادوں سے مختلف ہو گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ایک تو میں نے خلیفہ صاحب کو اس قدر تفصیل سے پڑھا کہ شاید خلیفہ صاحب کے دوسرے مداحوں کو ان کی اس قدر تحریریں میسر نہ تھیں اور دوسرے میں نے ان کی شاعری اور ادب کے وسیع مطالعے کے بعد ان کے بارے میں ذاتی رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے خلیفہ صاحب کی ممکن الحصول تمام تحریروں کو پڑھا اور جمع کیا ہے۔ تنقیدی مباحث میں اس امر کا جا بجا ثبوت ملے گا۔

پچھلے چند سالوں میں خلیفہ صاحب کے فکر و فن پر جو کام ہوا ہے اس میں ایک اہم کام ان کے مجموعہ مقالات کی تدوین بھی ہے "مقالاتِ حکیم" جس کی اشاعت ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے ہوئی ہے، ہر چند کہ خلیفہ صاحب پر ایک قابلِ قدر کام ہے لیکن وہ بعض اعتبار سے تشنہ ہے۔ مثلاً اس مجموعے میں خلیفہ صاحب کے کئی اہم مقالے شمولیت حاصل نہیں کر سکے۔ بہر حال ہر کام اپنے وسائل کا مرہون ہوتا ہے۔ میں نے مطالعۂ حکیم کے دوران میں ان کے غیر مدون مقالات خطبات اور مکاتیب کو فراہم کیا ہے اور ان سے پورے طور پر استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب میں جن مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے حواشی میں ان کا ذکر موجود ہے جن حضرات سے انٹرویو لیے گئے ان کی فہرست بھی آخرِ کتاب میں درج ہے۔ اس جگہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض اقتباسات کو بعینہٖ نہیں لیا گیا۔ طویل اقتباسات کو بعض مقامات پر مختصر کر کے اور بعض اوقات بہ ادنیٰ تحریف یا ترمیم لیا گیا ہے اس سلسلے میں فاضل مصنفین سے معذرت خواہ ہوں۔

جس طرح میں نے پہلے عرض کیا اس کام کی تکمیل کی نیک نامی محض میرے حصے میں نہیں آنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کام کی تکمیل کا سہرا ان شفیق بزرگوں، ہمدرد عزیزوں اقارب

اور پُرخلوص دوستوں کے سر بھی ہے۔ جنھوں نے ہر مرحلے میں میری ہمت افزائی کی اور اس کٹھن کام کو میرے لیے آسان بنایا۔

مواد کی ابتدائی تدوین میں یونیورسٹی کے اساتذہ ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر افتخار احمد صدیقی، خواجہ غلام صادق، عبادت بریلوی گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ جیلانی کامران، پروفیسر صابر لودھی اور مجلس ترقی ادب کے جناب گوہر نوشاہی نے بہت اہتمام کی میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری، پنجاب پبلک لائبریری اور مجلس ترقی ادب کے عملے نے تحقیقی مصادر کی فراہمی میں میری مدد کی۔ میں ان اداروں کے سربراہوں کی احسان مند ہوں۔

خلیفہ صاحب کے اہلِ خانہ اور عزیز و اقارب بالخصوص ان کی صاحبزادی رفیعہ حسن اور بیگم خلیفہ عبدالحکیم نے مواد کی فراہمی میں مجھ سے زیادہ محنت اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ ان کا شکریہ ادا کرنا بھی مجھ پر واجب ہے۔

کتاب کی تکمیل کے دوران میں میرے گھر والے جن صبر آزما مراحل سے گزرے، ان کا تذکرہ بھی ایک طویل داستان ہے۔ ظاہر ہے جب کبھی کسی صاحب سے استفادے کے لیے جانا ہوا۔ میرے گھر کے کسی فرد کو میرے ساتھ ضرور کوچہ گردی کی غیر پسندیدہ زحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ میں سمجھتی ہوں اگر میرے ابا جان، امی جان کی دعائیں، طیع بھیا، فہمیدہ اور نسیم باجی کی حوصلہ افزائی اور میرے عزیز اظہر، منیر اور اشرف کی محنت میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ کام کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچتا۔ میں اپنے اہلِ خانہ اور ان تمام مخلص دوستوں اور عزیزوں کی احسان مند ہوں جنھوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائرکٹر جناب ایس ایم اکرام کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے کہ انھوں نے ازراہِ قدردانی اس کتاب کی اشاعت کو منظور فرمایا۔ ادارے کے عملے نے جس تعاون اور عزت افزائی کا ثبوت دیا، میرے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ مولانا حنیف ندوی صاحب نے تمام مسودے پر ایک نظر ڈال کر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا، میں مولانا کی سپاس گزار ہوں۔

لاہور
۵ جون ۱۹۷۱ء

ممتاز اختر مرزا

فہرستِ مضامین

فہرست مضامین

شمار	مضمون	صفحہ

باب اوّل

خاندانی حالات

ڈار خاندان کی وجہ تسمیہ

خلیفہ عبدالحکیم ڈار خاندان کی لاہوری شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈار خاندان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں محمد الدین فوق اپنی کتاب "اقوام کشمیر"[1] کی فصل چہارم میں لکھتے ہیں:-

"قدیم زمانہ میں ہندو راجہ جب تخت کشمیر پر متمکن تھے تو ملک کشمیر مختلف حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ہر حصہ پر شیر دل آدمی مقرر کیا جاتا تھا۔ اگر دشمن ادھر سے حملہ کرے تو محفوظ رکھے۔ یہ لفظ دواری سے نکلا ہے"

اس سلسلے میں فوق صاحب نے لفظ ڈار کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ سنسکرت میں دَر کو دوار اور محافظ دَر کو دوار پتی کہتے ہیں۔ نیز یہ کہ دار، ڈامر، دوار، دوارپتی وغیرہ الفاظ ایک ہی مصدر سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈار خاندان کا لاہور میں ورود

ڈار خاندان پہلے کشمیر میں آباد تھا۔ ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ہزاروں کشمیری مسلمانوں کی طرح خلیفہ صاحب کے دادا رمضان ڈار بھی ہجرت کر کے لاہور میں آبسے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں:-

"سکھوں کے زمانے میں صدیق ڈار اور رمضان ڈار دو بھائی یکے بعد دیگرے کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے۔ یہاں خدا نے انھیں عزت و آبرو بھی بخشی اور اولاد کی نعمت سے بھی مالا مال کیا"[2]

خلیفہ عبدالحکیم خلیفہ رمضان ڈار کے پوتے تھے۔ ان کا شجرہ نسب جو منشی محمد الدین فوق نے تاریخ اقوام کشمیر میں درج کیا ہے حسب ذیل ہے۔

---

1. اقوام کشمیر از محمد الدین فوق ۔ صفحہ ۴۳
2. شمس الدین صاحب، خلیفہ عبدالواحد صاحب، خلیفہ عبدالغنی صاحب اور جناب لطیف حسن (انٹرویو)

شاخ لاہور سری نگر کشمیر

یحییٰ ڈار سکنہ رانکر تحصیل پلوامہ وفات ۱۲۳۴ ھجری

پڑدادا جعفر ڈار

نا معلوم

شعبان ڈار

نا معلوم

سخی ڈار

رمضان ڈار (دادا) وفات ۱۸۸۱ء

منشی محمد اسماعیل مرحوم

خلیفہ رجب الدین مرحوم

(باپ) خلیفہ عبد الرحمٰن مرحوم

صدیق ڈار وفات ۱۸۷۵ء

ابراہیم ڈار

امیر بخش

وزیر محمد (مرحوم)

غلام محمد (مرحوم)

حاجی منشی نظام الدین

خان صاحب سراج الدین (مرحوم)

منشی معراج الدین

منشی غلام محی الدین

خلیفہ محمد عبد اللہ

خلیفہ عبد العزیز

خلیفہ عبد المجید

خلیفہ عبد الحق

خلیفہ عبد الرشید

خلیفہ عبد الواحد

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

خلیفہ عبد الغنی

تاج الدین صراف

شجرۂ نسب پر روشنی ڈالتے ہوئے منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں :-

اس خاندان کے شجرۂ نسب پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پنجاب میں آنے کے بعد بیک وقت بہت سے قابل افراد پیدا کیے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کشمیریوں کو استبداد کے پنجے سے چھڑا کر آزاد ماحول میں نشوونما کا موقع دیا جائے تو وہ اپنی فطری ذہانت اور غیر معمولی قابلیت کے حقیقی جوہر دکھا سکتے ہیں[1]۔"

خلیفہ کا لقب

خلیفہ کہلانے کی وجہ بقول محمد الدین فوق یہ تھی -

"کہ شروع شروع میں اس خاندان میں پشمینے اور ڈوری بافی کا کام کثرت سے ہوتا تھا۔ اور لوگوں کی معقول تعداد باقاعدہ طور پر اس فن کا اکتساب بھی اسی خاندان سے کرتی تھی۔ خاندان کے بزرگوں کو خلیفہ یعنی استاد کے نام سے پکارا جانے لگا۔ یہی لفظ "خلیفہ" اس خاندان کے افراد کے نام کا پہلا جزو قرار پایا[2]۔"

خلیفہ عبدالحکیم کے دادا خلیفہ رمضان ڈار ایک چھوٹے سے کارخانے کے مالک تھے، ان کے والد خلیفہ عبدالرحمٰن پرانی وضع کے آدمی اور کٹر مذہبی انسان تھے۔

خلیفہ عبدالرحمٰن سلیم الطبع، کم سخن، ہتین، بااصول اور صاف ستھری معاشرت کے قائل تھے۔ گلستان، بوستان کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا اور ان کا معمول تھا کہ ان کتابوں کے سبق آموز حصے اپنے بچوں کے گوش گزار کیا کرتے تھے۔ اس وقت خلیفہ عبدالحکیم گو بہت چھوٹی عمر کے تھے تاہم چونکہ اس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے بچپن ہی میں ان کو فارسی ادب سے گہرا لگاؤ پیدا ہوگیا۔

ڈار خاندان کی چند ممتاز شخصیتیں

۱ - خلیفہ رجب الدین ڈار

---

[1] - تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم از محمد الدین فوق صفحہ ۱۰۶

[2] - تاریخ اقوام کشمیر ۱۹۳۴ء از محمد الدین فوق صفحہ ۵۰۸

۲۔ منشی نظام الدین ڈار
۳۔ منشی اسماعیل وکیل ڈار

(۱) خلیفہ رجب الدین ڈار

اگرچہ آپ کی استعداد علمی معمولی درجہ کی تھی تاہم دینی و شرعی مسائل آپ کو از بر تھے۔ اندر قانونی نکات میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عوام میں آپ ان پڑھ وکیل کے نام سے مشہور تھے۔ لوگ اکثر آپ سے قانونی و شرعی مسائل پر استفسار کیا کرتے۔

یہ خاندان جو کشمیر سے ہجرت کرکے لاہور میں آباد ہوا۔ اگرچہ دولت و ثروت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت کا مالک نہ تھا مگر وجاہت و عزت کے لحاظ سے اس خاندان کو اپنے علاقے میں اہم مقام حاصل تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم کے چھوٹے بھائی خلیفہ عبدالغنی صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی ہجرت کے بعد اس خاندان کے افراد نے پیشہ چاولوں کا کاروبار شروع کیا بعد میں ڈوری باقی کا کام کرنے لگے۔ ان کا کہنا ہے کہ کشمیری بازار کا نام بھی اسی ڈوری باف کشمیریوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ تعجب ہے کہ اتفاق جمیل جو ۱۹۴۳ء میں اولڑ تاریخ اقوام کشمیر میں اس خاندان کے چاولوں کے کاروبار کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ صرف اس قدر تحریر کیا گیا ہے کہ لاہور آکر انھوں نے پشمینے کا کام شروع کر دیا۔

(۲) حاجی منشی نظام الدین ڈار

رابراہیم ڈار کے صاحبزادے تھے ۱۸۸۴ء سے دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل میں آپ نے ملازمت شروع کی۔ اپنی کارکردگی، قابلیت اور دیانت سے اس محکمہ میں ایسا نام پیدا کیا کہ ترقی کرتے بہاولپور، بھوپال، مالیرکوٹلہ، رامپور میں بھی اکاؤنٹنٹ جنرل کی حیثیت سے جاتے رہے۔ ریاست جودھپور میں فنانس منسٹر کے پرنسپل اسسٹنٹ رہے۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں پنشن لے کر لاہور میں مقیم ہوگئے اور سالہا سال تک انجمن حمایت اسلام کے آنریری فنانشل سیکرٹری رہے۔

(۳) منشی اسماعیل وکیل ڈار

آپ خلیفہ صاحب کے نانا اور اس وقت کے نامی وکیل تھے۔ ان کی قابلیت

کے جو ہر فوجداری مقدمات میں زیادہ ابھرے گر ہوتے تعلیم کے بہت حامی تھے۔ اردو اور فارسی ادب سے خاص شغف تھا۔ اسی علوی ذوق کی وجہ سے آپ نے اسی زمانے میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اُن کے پاس اردو اور فارسی کی کتابوں کا نایاب ذخیرہ تھا۔ حاضر جوابی، سخن فہمی، قادر الکلامی اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے یہ خاص طور پر مشہور تھے۔ منشی صاحب کی یہ خصوصیات ایسی تھیں جن کا اجتماع خلیفہ صاحب کی فطرت میں بتمام و کمال ہوا۔ خلیفہ صاحب خود کہا کرتے تھے۔

"ادھر ان کی وفات ہوئی اُدھر میں پیدا ہوا۔ گویا میرے جسدِ خاکی میں ان ہی کی روح نے حلول کر رکھا ہے۔"

خلیفہ عبدالحکیم کی پیدائش

خلیفہ صاحب کے سال پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال[1] محمد عبداللہ قریشی[2] اور بشیر احمد ڈار[3] نے آپ کی تاریخ پیدائش "۱۲ر جولائی ۱۸۹۴ء لکھی ہے"۔ محمد الدین فوق صاحب نے تاریخ اقوام کشمیر میں اور میاں شمس الدین صاحب نے اپنے انٹرویو میں آپ کی تاریخ پیدائش ۱۲ر جولائی ۱۸۹۴ء بیان کی ہے[4] لیکن عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کے درمیان ان کی تاریخ پیدائش کا جو اندراج ہوا اس کے مطابق خلیفہ صاحب ۸ر شوال ۱۳۰۲ھ مطابق یکم جولائی ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے تھے[5]۔

خلیفہ صاحب کی پیدائش ان کے جدی مکان میں ہوئی جو اندرون اکبری دروازہ محلہ چلہ بیبیاں میں واقع ہوئی ہے۔ بعض لوگ اسے پہل بیبیاں بھی کہتے ہیں۔ لاہور

[1، ۲، ۳] اقبال ریویو ۱۹۶۶ء (شمارہ ۴ ج ۶) ص ۱۷، ۱۲۵

[۳] ثقافت جون ۱۹۶۰ء (شمارہ ۶-۷) ص ۵۷

[۴] انٹرویو شمس الدین صاحب، تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم ص ۱۲۶

[۵] مراسلہ رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن)

مکتوب ۳ر ستمبر ۶۸ء۔ بحوالہ سول لسٹ ریاست حیدر آباد بنام راقم السطور

کے اس محلّے سے بڑی بڑی نامور شخصیتوں کا تعلق رہا ہے۔ خلیفہ عبدالواحد صاحب کا کہنا ہے کہ جس مکان میں خلیفہ صاحب کی پیدائش ہوئی یہ مکان مغلوں کی حویلی کا ایک حصّہ تھا۔ جس کا نام مغلوں کے زمانے میں مبارک حویلی تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابوالفضل اور فیضی کے والد شیخ مُبارک اس حویلی میں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ان ہی کے نام سے یہ حویلی منسوب ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم، خلیفہ عبدالرحمٰن کی دوسری بیوی کی اولاد میں سے تھے جن کا نام رحیم بی بی تھا۔ خلیفہ صاحب مزاحاً کہا کرتے تھے کہ میں رحمان و رحیم کی اولاد ہوں۔ خلیفہ صاحب کے ایک حقیقی بھائی عبدالغنی بھی بقیدِ حیات ہیں۔ سوتیلے بھائی خلیفہ ابراہیم کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ کی چار بہنیں تھیں جن میں سے صرف ایک بہن امیر بیگم زندہ ہیں۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

کہا جاتا ہے کہ آپ بچپن میں بات بات پر رو دیا کرتے تھے، اس لیے گھر والے اور اُن کے دوست انھیں "حکیم پِپی" کہا کرتے جس سے یہ اور زیادہ چڑا کرتے۔ لٹّو کا کھیل مرغوبِ خاطر تھا۔ مسجد وزیر خاں کے بالمقابل وسیع میدان میں لٹّو گھمانے کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ جنھیں یہ شوق سے دیکھتے۔ اس کے علاوہ پتنگ بازی کا بھی بے حد شوق تھا اور یہ شوق تو آخری عمر تک نہ چھوٹا۔ تعلیم کا آغاز ایک مسجد میں ہوا۔ خلیفہ صاحب کے ہم جماعت اور ہم محلہ جناب شمس الدین کا بیان ہے کہ

"خلیفہ صاحب کے مکان کے سامنے ایک مسجد تھی، جس کا نام مٹھا شاہ والی مسجد تھا۔ چار سال کی عمر میں (نومبر ۱۸۹۸ء) انھیں والد نے اس مسجد میں پڑھنے بٹھا دیا[ا]"

بعد ازاں پرائمری جماعت کی تعلیم کے لیے انجمن حمایتِ اسلام کے سکول واقع اندرون موچی گیٹ میں داخل ہوئے جو اس زمانے میں "لال کھوہ کا سکول" کہلاتا تھا۔ خلیفہ عبدالغنی صاحب

[ا] انٹرویو شمس الدین صاحب

نے "سکول میں داخلے کا سن ۱۸۹۹ء میں بیان کیا ہے"[۱]۔ لیکن اس بارے میں بھی میاں شمس الدین کی رائے مختلف ہے۔ موصوف نے ان کے پرائمری سکول میں داخلے کا سال ۱۹۰۱ء بیان کیا ہے اور یہی سن زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے۔

ہائی سکول میں تعلیم

تیسری جماعت کے بعد آپ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں چلے گئے اور یہیں سے میٹرک کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے سن کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد عبداللہ قریشی[۲]، محمد الدین فوق[۳]، اور شمس الدین صاحب کہتے ہیں کہ خلیفہ صاحب نے ۱۹۱۰ء میں میٹرک کیا۔ جب کہ پروفیسر حمید احمد خان اس سن کو ۱۹۱۱ء بیان کرتے ہیں[۴]۔ خلیفہ صاحب کے آئندہ تعلیمی مراحل اور دیگر امتحانات کے سنین پیشِ نظر رکھے جائیں تو پروفیسر حمید احمد خان کا بیان زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔

زمانۂ تعلیم ہی میں جب آپ کی عمر بارہ سال کی تھی آپ کے والد انتقال کر گئے۔ اس کے ساتھ ہی قرابت داروں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس کے بارے میں سلیم واحد سلیم لکھتے ہیں۔

"جب خلیفہ صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا تو آپ کے والد کے بھائیوں نے حکیم چچا اور دوسرے چچاؤں اور پھوپھیوں کا حصہ دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے ان سب کو سالہا سال غربت و عسرت میں زندگی بسر کرنی پڑی"[۵]۔

خلیفہ صاحب کی والدہ رحیم بی بی

باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو جانے کے بعد خلیفہ صاحب کی تعلیم و تربیت

۱۔ انٹرویو خلیفہ عبدالغنی صاحب

۲۔ مقالہ از عبداللہ قریشی، اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ ۱۰- جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۳۵

۳۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد سوئم از محمد الدین فوق ص ۱۶۶

۴۔ مقالہ از پروفیسر حمید احمد خاں ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ ص ۵۴

۵۔ مقالہ از سلیم واحد سلیم ادبی دنیا ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۸۹

کی ذمہ داری تنہا آپ کی والدہ پر آپڑی۔ آپ کی والدہ ایک صابر، متحمل مزاج اور عقل مند خاتون تھیں جنھوں نے شوہر کی وفات کے بعد گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا۔ اس وقت آپ کے مالی حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے دھان پر سے چھلکا اتارنے کا پرانا کام شروع کر دیا اور حوصلہ نہ ہارا۔ یہ آپ کی والدہ کی ہمت تھی کہ انھوں نے مالی مشکلات کے باوجود خلیفہ صاحب کے دل میں تحصیلِ علم کا شوق اور اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کا عزم بیدار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب ماں کا ذکر نہایت خلوص و احترام سے کیا کرتے تھے۔

آپ کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی۔ اپنے ہم جماعتوں میں ہمیشہ اوّل رہتے تھے۔ آپ اس زمانہ میں بھی پُررعب اور شخصیت کے مالک تھے اور بذلہ سنجی میں کچھ اس قسم کا ملکہ رکھتے تھے کہ ان کے ہم عصروں میں شاید و باید کسی کو نصیب ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر لڑکے ان کے منہ نہ آتے تھے اور ان کی فقرے بازیوں سے پہلو بچاتے تھے۔ نجم الدین صاحب جو خلیفہ صاحب کے ہم مکتب ہیں اپنا تاثر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"خلیفہ صاحب دسویں میں تھے اور میں نویں میں۔ خلیفہ صاحب جب بھی پاس سے گزرتے میں ڈر جایا کرتا۔ کیونکہ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ شرارت ناچتی رہتی اور ایک عجیب سی مسکراہٹ چہرے پر کھیل رہی ہوتی۔"[1]

اسی طرح پروفیسر ایم۔ ایم شریف مرحوم جو خلیفہ صاحب کے بچپن کے دوست اور ہم جماعت تھے لکھتے ہیں:۔

"جب میں اسلامیہ سکول میں آیا تو خلیفہ صاحب ساتویں جماعت میں تھے۔ میری ان سے واقفیت نہ تھی۔ جمعہ کے روز مولوی صاحب کا وعظ ہوا کرتا تھا۔ ایک دن میں خلیفہ صاحب کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ غلطی سے میری کتابیں خلیفہ صاحب کو چھو گئیں۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور گالی دی۔ اُدھر میں نے انھیں گھونسہ رسید کیا۔ میں دیہاتی لڑکا تھا اس لیے مجھے گالیاں نہ آتی تھیں۔"[2]

---

[1] انٹرویو: نجم الدین صاحب

[2] مقالہ از ایم ایم شریف۔ ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون۔ جولائی ۱۹۶۰ء ص ۳۵

خلیفہ صاحب کے معاصر دوستوں نے شریف صاحب کے اس بیان سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خلیفہ صاحب نے گھونسہ مارا تھا اور شریف صاحب نے گالی دی تھی۔ بہر حال اس واقعہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لڑکپن سے ہی خلیفہ صاحب کا مزاج خاصہ تیز تھا۔ بقول محمد الدین فوق کے "اسی زمانے میں آپ نے شعر و شاعری بھی شروع کر دی تھی۔ اس دور کی اپنی نظم کشمیری میگزین لاہور میں شائع ہوئی تھی"[1]

سکول کی ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ نجم الدین صاحب کا بیان ہے کہ ہمارے سکول میں ادبی محفل ہوا کرتی تھی۔ خلیفہ صاحب اس کے سیکرٹری تھے اور جب ان کے بعد میں سیکرٹری بنا تو خلیفہ صاحب کی روداد کی کاپی اپنی عبارت کے لحاظ سے اتنی رواں اور انداز تحریر کے لحاظ سے اتنی خوش خط تھی کہ میں صرف اس میں نام ہی تبدیل کیا کرتا اور باقی عبارت اسی طرح رہنے دیتا[2]۔ سکول کے زمانے ہی آپ اچھے مقرر تھے۔ اردو فارسی ادب کے مطالعے کا شوق بھی اسی زمانے سے تھا۔

ایف۔ اے

خلیفہ صاحب نے جن دنوں میٹرک پاس کیا ان دنوں پنجاب میں سر سید کی تعلیمی تحریک سے بہت دلچسپی اور وابستگی پائی جاتی تھی۔ اس زمانے کے اکثر بزرگ اپنی اولاد کو علی گڑھ میں تعلیم دلانے کی تمنا کیا کرتے تھے۔ مگر اس کے برعکس (غالباً مالی مشکلات کے سبب سے) آپ نے میٹرک کے بعد فورمن کرسچن کالج میں داخلہ لیا اور اپنے بہنوئی عطا اللہ بٹ کی ہدایات پر سائنس کے مضامین اختیار کیے۔ لیکن آپ کو سائنس سے کوئی رغبت نہ تھی۔ چنانچہ چند ماہ گزارنے کے بعد آپ نے اس کالج کو چھوڑ دیا۔ پھر علی گڑھ پہنچ کر فرسٹ ایئر آرٹس میں داخلہ لے لیا۔

تقریری انعام

آپ فرسٹ ایئر میں تھے کہ فی البدیہہ تقریر کرنے کا مقابلہ ہوا۔ جس میں ایم۔ اے

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم از محمد الدین فوق ص ۱۶۶

[2] انٹرویو: نجم الدین صاحب

کے طلباء نے بھی حصہ لیا آپ بھی اس مقابلے میں شریک ہوئے۔ (THE EFFECT OF SAR-ROUNDINGS ON CHARACTER) کے موضوع پر پانچ منٹ کی تیاری کے بعد دس منٹ کی تقریر کر کے اوّل انعام حاصل کیا، اور اس کی کالج بھر میں دھوم مچ گئی۔ ¹

سیفٹ ایئر میں آپ ڈیبیٹنگ یونین کے صدر ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی جونیئر طالب علم صدر منتخب ہوئے۔ ²

بی - اے

محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں کہ علی گڑھ سے ایف۔ اے کرنے کے بعد آپ ۱۹۱۲ء کے وسط میں سینٹ اسٹیفنز کالج دلّی میں داخل ہوئے۔ ³

لیکن پروفیسر حمید احمد خاں کا بیان ہے کہ ۱۹۱۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایف۔ اے کر کے دہلی آ گئے۔ اور یہی اندازہ زیادہ درست ہے۔ اس زمانے میں علی گڑھ کالج کا الحاق الہ آباد یونیورسٹی سے تھا۔

آپ کے فلسفے کے پروفیسر مسٹر سین تھے جو بعد میں رجسٹرار بن گئے تھے وہ آپ کی ذہانت کی وجہ سے آپ کے مداح تھے۔ فلسفے کی جماعت میں صرف پانچ چھ لڑکے تھے اس لیے اس مختصر سی جماعت کو لیکچر دینے کی غرض سے وہ اکثر خلیفہ صاحب کی قیام گاہ پر تشریف لے آتے اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

خلیفہ صاحب نے ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور بقول عبداللہ قریشی صاحب کے "پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آ کر فلسفے کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس امتیاز پر

---

¹ مقالہ از بیگم خلیفہ عبدالحکیم، ثقافت ج ۹ ش ۶، ۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۸۵،
نیز تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم از محمد الدین فوق ص ۶۶
اور مقالہ از عبداللہ قریشی اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۲۵

² انٹرویو: خلیفہ عبدالغنی صاحب

³ تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم از محمد الدین فوق ص ۶۶،
نیز مقالہ از عبداللہ قریشی اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۲۵۔

آپ کو تعلیمی وظیفے کے علاوہ مہاراجہ قاسم بازار کا تمغہ ملا۔[۱]

میاں فضل حسین مرحوم ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور کے سیکرٹری اور خواجہ جمال الدین بی۔اے انسپکٹر مدارس کشمیر تھے۔ اول الذکر نے آپ کو کالج میں پروفیسری کا عہدہ پیش کیا۔ اور موخرالذکر نے کہا کہ شیخ مقبول حسین ریونیو منسٹر کشمیر آپ کو اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بنانا چاہتے ہیں۔

مگر آپ نے علمی زندگی کو ترجیح دی اور کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔

اس سارے عرصے میں خلیفہ صاحب ایک ذہین طالب علم، سحر بیان مقرر اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے دوسرے طلبا سے ممتاز رہے۔[۲]

اس زمانے میں آپ کے پرنسپل پروفیسر رہ چکے تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو آپ کے کالج آئیں تو آپ نے ایک نظم کہی جس کا ایک شعر درج ذیل ہے۔

بن رہا ہے قصرِ تعمیرِ وطن
عرش کو چھونے لگی یہ تعمیر کیا

مسز سروجنی نائیڈو آپ کی ذہانت اور ذوقِ شاعری سے متاثر ہو گئیں اور حیدرآباد میں اکثر آپ سے ملتی رہیں۔ انہی دنوں گلمرگ (کشمیر) میں عید کا چاند دیکھ کر آپ نے ایک نظم کہی جو روزنامہ زمیندار میں چھپی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اس وقت چھٹے دارہ میں نظربند تھے نظم دیکھ کر پھڑک اٹھے اور یہ شعر تو اُن کے وردِ زبان ہو گیا۔

دل کی جمعیت سے لطف ساز بھی اور سوز بھی
آبروئے ملت کی ہو تو عید بھی نوروز بھی[۳]

شعر کا شوق تو بی اے میں کافی پختہ ہو چکا تھا اور ذہانت کا شہرہ دور دور تک

۱۔ مقالہ از عبداللہ قریشی، اقبال ریویو ج ۲ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۲۶

۲۔ انٹرویو عبدالحمید ملک صاحب

۳۔ مقالہ از عبداللہ قریشی، اقبال ریویو ج ۴ - ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۲۸

پہنچ چکا تھا مگر ایم۔اے میں تو اس جوہر کی تابانیاں نظروں کو چکا چوند کرنے لگیں۔ سینٹ سٹیفن کالج دلی ہی سے ۱۹۱۷ء میں ایم۔اے پاس کیا اور نہ صرف پنجاب بھر میں اوّل آئے بلکہ تمام فسٹ ڈویژن پاس شدگان میں بھی سرِفہرست رہے۔

"آپ کے ایم۔اے کے ممتحنوں میں علامہ اقبال بھی تھے اور خلیفہ صاحب فخریہ کہا کرتے تھے کہ اس خاص پرچے میں انھوں نے ننانوے نمبر پائے تھے"[1]

ایک پرچہ شاعرِ مشرق اقبال اور دوسرا منوہر لال کے پاس تھا۔ انھوں نے پرچے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ کسی ہندو کا ہوگا۔ علامہ اقبال کہنے لگے کہ مسلمان کا ہے۔ چنانچہ اس بحث میں علامہ اقبال کی جیت ہوئی۔ انھیں خلیفہ حکیم کی ذہانت پر بے حد اعتماد تھا۔ ایم۔اے کے امتحان میں انھوں نے رومی پر ایک مقالہ لکھا۔ جو آج تک پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ خلیفہ صاحب کا ایم۔اے میں رومی کو منتخب کرنا اور ان پر ایک بصیرت افروز مقالہ لکھنا اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ خلیفہ صاحب کو رومی سے بطورِ خاص عقیدت تھی۔ یہ مقالہ رومی کے فلسفیانہ افکار سے متعلق تھا۔

جب آپ ایم۔اے میں حصولِ تعلیم میں مشغول تھے تو برکت علی محمڈن ہال کے ایک مشاعرے میں آپ نے امیر مینائی کی زمین میں ایک نظم پڑھی جو الفاظ کے دروبست اور مضمون آفرینی کے لحاظ سے ایک کہنہ مشق اور پختہ شاعر کا کلام معلوم ہوتی ہے۔

کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر
بارشِ تیرِ حوادث میں جگر پیدا کر

ایل۔ایل۔بی

۱۹۱۷ء میں ایم۔اے کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے اور اسی سال لاہور کے لاء کالج میں داخلہ لیا اور ساتھ ہی خواجہ احمد شاہ کے انگریزی اخبار "ابزرور" کی ادارت کے فرائض بھی اپنے ذمے لے لیے۔ اس اخبار کے سابق ایڈیٹر ملک برکت علی

---

[1] مقالہ از پروفیسر حمید احمد خاں ثقافت ج ۸ ش ۶-۷۔ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۵۴

تھے ۔ ملک صاحب نے ایک مضمون میں حکومت کو کھری کھری سنائیں ، تو انہیں قلم بندی کا حکم دے دیا گیا ۔ بعد ازاں جب خلیفہ صاحب اس اخبار کے ایڈیٹر ہوئے تو وہ ان سے بھی دو ہاتھ بڑھ گئے اور مضمون بعنوان (THE JUDGE SHIP OF PUNJAB CHIEF COURT) لکھا مضمون کا لب لباب یہ تھا کہ حکومت محض ان اشخاص کو بڑے بڑے عہدوں اور اعزازات سے نوازتی ہے جو خوشامدی ہوتے ہیں ۔ اس دور میں جوہر قابل حرف دیرینہ بن کر رہ گیا ہے ۔ خلیفہ عبدالغنی صاحب کہتے ہیں کہ اس مضمون میں خلیفہ صاحب کا اشارہ علامہ اقبال کی طرف تھا کیونکہ انہیں اپنی عدیم النظیر قابلیت کے باوجود حکومت نے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا ۔

" ان بے لاگ تنقیدوں سے متاثر ہو کر حکومت کے محکمہ احتساب نے سر مائیکل اوڈوائر کے اشارے پر اس اخبار کی ضمانت ضبط کر لی ۔"[1]

آپ نے ایل ایل بی کی سند تو حاصل کی مگر وکالت کے دھندوں سے دامن بچاتے رہے ۔ آپ کے دوست میاں شمس الدین صاحب نے آپ کے لا کرنے کا قصہ بڑے مزے سے سنایا ۔ کہنے لگے "تکیہ سادھواں میں رات کے وقت محفل جمتی جس میں ہمارے سب دوست شرکت کیا کرتے ۔ ان دنوں ہمارے دوست قاضی مختار احمد لا کی تیاری کر رہے تھے ۔ خلیفہ صاحب نے ان سے کہا اگر تم مجھے پڑھا دیا کرو یا کم از کم میرے سامنے لا کی کتابیں پڑھ دیا کرو تو میں بھی لا کا امتحان دے دوں ۔ قاضی صاحب نے ازراہ مذاق کہا کہ مجھے دس روپے ماہوار دے دیا کرو تو میں یہ فریضہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں ۔ خلیفہ صاحب نے یہ شرط منظور کر لی ۔ اب صورت یہ تھی کہ قاضی صاحب لا کی کتابیں پڑھتے تھے اور خلیفہ صاحب کمال دل جمعی اور یکسوئی سے لا کے مضامین ذہن نشین کرتے جاتے تھے ۔ اسی طرح شب و روز گزرتے رہے ۔ بالآخر امتحان سر پر آ گیا ۔ دونوں حضرات امتحان میں شریک ہوئے ۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ نتیجہ نکلا تو قاضی صاحب فیل اور خلیفہ صاحب اچھے نمبروں پر کامیاب ہو گئے ۔

---

[1] مقالہ از عبداللہ قریشی : اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۶ء ج ۶ ش ۴ ۔ ص ۱۲۶
نیز دیکھیے ۔ تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم از محمد دین فوق ص ۱۶۷
اور انٹرویو خلیفہ عبدالغنی صاحب ۔

ایل ایل بی کرنے کے بعد چونکہ آپ نے وکالت کا پیشہ اختیار نہ کیا بلکہ ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ لہٰذا بیچ بیچ میں انھیں فرصت کے لمحات میسر آجاتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اپنے دوست ملک عبدالمجید صاحب کے ہمراہ مسوری جانے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات سو سو روپیہ لے کر یہاں سے روانہ ہوئے اور کرنال سے ہوتے ہوئے مسوری جا پہنچے اور تاج ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے روز جب بل آیا تو پندرہ روپے کا تھا۔ اس پر خلیفہ صاحب بولے بھئی یوں تو گزارہ نہ ہوگا۔ یہ تاج ہوٹل ہمیں محتاج کر دے گا۔ اس لیے بارلو گنج میں ایک بنیے کی دکان کے اوپر دو کمرے اور غسل خانہ بیس روپیہ ماہوار کرایہ پر لے لیا کھانا کھانے کے لیے مسوری آنا پڑتا اور کبھی کبھی انھیں خود بنیان تولیہ وغیرہ دھونے پڑتے۔

عبدالمجید ملک صاحب کو تیراکی کا بہت شوق تھا۔ بارلو گنج کے قریب لڑکوں کے سکول میں ایک تالاب تھا جس میں یہ تیراکی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اپنے دوست کو دیکھ کر خلیفہ صاحب کے دل میں بھی شوق نے چٹکی لی، مگر تھے اس فن سے ناواقف چنانچہ ان کو ایک ترکیب سوجھی۔ کمرے میں گئے اور بستر کی چادر اٹھا لائے۔ اس کا ایک سرا اپنی کمر سے باندھ لیا اور دوسرا ملک صاحب کو تھما دیا کہ بوقت ضرورت کھینچ لیں۔ اس حالت میں جو پانی میں کودے تو ڈوبتے ہی چلے گئے۔ بڑی مشکل سے ملک صاحب نے انھیں باہر نکالا۔ ادھر ملک صاحب کے حواس قائم ہوئے ادھر خلیفہ صاحب کی جان میں جان آئی۔ اس کے بعد خلیفہ صاحب نے کبھی تیرنے کی جرأت نہ کی۔ ملک صاحب کہتے ہیں "مجھے بار بار اس خیال سے دہشت ہوتی کہ خدانخواستہ اگر یہ ہونہار شاعر و ادیب ڈوب جاتا تو قوم کو کتنا عظیم نقصان اٹھانا پڑتا"[1]۔

ابھی مہینہ پورا نہ ہوا تھا کہ خلیفہ صاحب کو حیدرآباد سے ملازمت کی پیش کش ہوئی اور انھیں اچانک بارلو گنج چھوڑنا پڑا۔ جب یہ دونوں دوست وہاں سے نیچے آگئے۔

---

[1] انٹرویو عبدالمجید ملک صاحب

تو باوجود تلاش کے انھیں "بنیا" نہ مل سکا۔ اس لیے لاہور آ کر انھیں پینی آرڈر کرنے پڑے[1]

ملازمت کا پہلا دور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک

اگست ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج قائم ہوا۔ اور آپ ۱۹۱۹ء میں علامہ اقبال[2] کی سفارش پر فلسفہ اور منطق کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے[3]

محی الدین زور لکھتے ہیں کہ عثمانیہ یونیورسٹی اکتوبر ۱۹۱۸ء کو قائم ہوئی اور تعلیم کا باقاعدہ آغاز ۱۷ اگست ۱۹۱۹ء کو ہوا[3]"

جامعہ عثمانیہ کے ریکارڈ میں اس تقرر کی تاریخ ۱۱ اگست ۱۹۱۹ء درج ہے۔ تنخواہ کا گریڈ ۴۰۰ ــ ۳۰۰ روپے تھا۔ لیکن ۳۵۰ روپے سے آغاز ہوا۔ خلیفہ عبدالغنی صاحب کہتے ہیں کہ جب یہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو علامہ اقبال کو فلسفے کی پروفیسری کی پیش کش کی گئی۔ علامہ اقبال نے خلیفہ عبدالحکیم سے فرمایا کہ "چیف منسٹر سر اکبر حیدری کا خط آیا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کھل رہی ہے اور انھیں فلسفے کے لیے پروفیسر کی ضرورت ہے۔ اس کا جواب میں نے سر اکبر حیدری کو لکھ دیا کہ میں ایسا آدمی بھیجنا چاہتا ہوں جس کی بابت آپ محسوس کریں گے کہ وہ بھی اقبال ہے" علامہ صاحب کا خلیفہ صاحب پر اعتماد بالکل بجا تھا۔ چنانچہ آپ ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے اور وہیں سال یونیورسٹی سے اسکالرشپ لے کر ۱۹۲۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی عبدالغنی، اپنی اہلیہ اور چھ سالہ بچے عارف اور بہنوئی ڈاکٹر عطا اللہ بٹ ایم بی بی ایس ڈی (برلن) کے ہمراہ یورپ روانہ ہوئے۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

انھوں نے فلسفہ رومی پر تحقیقی کام کا آغاز کیا اور پروفیسر RICKETS کی زیرنگرانی رومی کی مابعد الطبیعیات (MATAPHYSIC OF RUMI) پر مقالہ لکھا (جو ۱۹۳۳ء

---

[1] انٹرویو عبدالحمید ملک صاحب

[2] مقالہ از خواجہ بدر اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ ص ۱۷

[3] عہد عثمانی میں اردو کی ترقی از زور ص ۹۲

میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوا)

تین سال بعد ۱۹۲۵ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرکے واپس آئے پروفیسر ایم۔ ایم شریف نے ثقافت میں خلیفہ صاحب کی واپسی کا سن ۱۹۲۴ لکھا ہے لیکن محمد عبداللہ قریشی، پروفیسر حمید احمد خان اور شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اپنے مقالوں میں ۱۹۲۵ء درج کیا ہے۔ اس کی تصدیق عثمانیہ یونیورسٹی کے ریکارڈ سے بھی ہوتی ہے[1]۔

ملازمت کا دوسرا دور ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۳ء تک

جرمنی سے واپسی کے بعد خلیفہ صاحب عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ فلسفہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس تقرر پر آپ کی تنخواہ کا گریڈ ۵۰۰-۱۰۰۰ تھا جس کا آغاز ۶۵۰ روپیہ سے ہوا۔ "علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ یہ دور بڑے سکون اور اطمینان اور خوش وقتی" کا دور تھا۔ خلیفہ صاحب اسی زمانہ کو اپنی زندگی کا خوش گوار ترین دور کہا کرتے تھے[2]۔

خلیفہ صاحب کی شادی تو ۱۹۲۰ء میں یورپ جانے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ جب وہ بیگم حکیم کو حیدرآباد لے کر گئے تو آپ کے صاحبزادے عارف حکیم چار ماہ کے تھے۔ اس سے پہلے آپ پروفیسر ہارون خان شروانی اور عبدالرحمن کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ کے آنے کے بعد علیحدہ مکان لے کر رہنے لگے۔

حیدرآباد میں خلیفہ صاحب کا بنگلہ

کچھ عرصہ بعد آپ نے اپنا ذاتی بنگلہ بنوایا جو بہت شاندار تھا۔ اس وقت حیدرآباد میں جرمن

---

[1] مقالہ از عبداللہ قریشی، اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۲۶
مقالہ از پروفیسر ایم۔ ایم شریف ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۳۶
مقالہ از پروفیسر حمید احمد خان صاحب ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۴۴
مقالہ از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، نقوش لاہور نمبر، فروری ۱۹۶۲ء ص ۹۳۶
تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم از محمد الدین فوق ص ۱۶۸

[2] تاثرات از شاہد حسین رزاقی، ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۵

ڈیزائن کے بنگلوں کا بہت رواج تھا۔ مگر اس طرز کے مکان گرم ممالک کے لوگوں کے لیے مفید نہ تھے
خلیفہ صاحب کا مکان مغلوں کی عمارت کی طرز پر تعمیر ہوا تھا۔ جس میں کھلے کھلے برآمدے، خوب
صورت محرابیں اور ستون تھے۔ پلاٹ کا رقبہ آٹھ ہزار مربع گز تھا۔ اور پانی کثرت سے ملنے کی وجہ
سے خانہ باغ بہت شاداب تھا۔[1]

حیدرآباد میں علمی و تدریسی کام

عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ اس لیے خلیفہ صاحب کو لیکچر اردو میں دینا پڑتا تھا۔ خلیفہ صاحب کا بیشتر وقت مطالعہ اور درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا۔ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کم تھی۔ تاہم اس عرصہ میں آپ نے چند گراں قدر علمی مقالے لکھے اور دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کی فرمائش پر چار درسی کتابوں کے ترجمے کیے جن کی تفصیل تراجم کے سلسلے میں پیش کی جائے گی۔ شعر و سخن کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آپ کی غزلیں مجلہ عثمانیہ میں چھپتی تھیں۔ مقالے بھی اس مجلے میں اشاعت پذیر ہوتے۔

خلیفہ صاحب کا شمار عثمانیہ یونیورسٹی کے فاضل ترین اساتذہ میں ہوتا تھا۔ آپ فلسفے کے ماہر تھے۔ آپ کی استادانہ صلاحیت کے بارے میں حبیب اللہ رشدی کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے پروفیسروں میں تین حضرات کو معیاری قرار دیا تھا۔
پہلا نمبر این۔ بی دیلنکر کا تھا دوسرا خلیفہ عبدالحکیم کا اور تیسرا اے ایس میرل کا۔[2]

خواجہ بدر صاحب کا بیان ہے: "خلیفہ صاحب خشک لیکچر بازی کے رسمی طریقہ کو ناپسند کرتے تھے۔ آپ کا انداز تدریس یہ تھا کہ طلبا کی جماعت میں فلسفیانہ مسائل و مباحث پر بے تکلف گفتگو کرتے۔ جیسے صحبت میں تبادلہ خیالات ہو رہا ہے۔ اس سے طلبا میں ذوق تجسس بیدار ہوتا وہ بحث میں حصہ لیتے اور سوالات کرتے۔ خلیفہ صاحب ہر سوال کے جواب میں علم و حکمت کے موتی رولتے تھے اور طلبا ان کی دلچسپ تقریر سننے میں محو ہو جاتے۔ کسی کو پتہ نہ چلتا تھا اور

---

[1] مقالہ از افسر اقبال قریشی ثقافت، ج ۸ ش ۶، ۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۸۰

[2] مقالہ از حبیب اللہ رشدی اقبال ریویو ج ۷ ش ۴ جنوری ۱۹۶۷ء ص ۳۲

ایک گھنٹے کی مدت ختم ہو جاتی تھی۔[1]

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں جو لوگ اُن کے درس سے فیضیاب ہوئے اُن میں شامل ہونے کی عزت مجھے بھی حاصل ہے۔ بی اے میں تاریخ اور فلسفہ کا بڑا حصہ میں نے خلیفہ صاحب سے پڑھا۔ اس زمانے میں انھوں نے ویبر کی تاریخ فلسفہ کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اُردو تھا اس لیے خلیفہ صاحب کے لیکچر اُردو میں ہوتے تھے۔ لیکن اُردو کی درسی کتابیں میں نے کبھی اُن کے سامنے نہ دیکھیں بلکہ کانٹ کی THE CRITIQUE OF PURE REASON کا جرمن ایڈیشن آپ کے سامنے ہوتا آپ جرمن عبارت کو برجستہ اُردو میں ترجمہ کرتے اور کانٹ کے مطالب کی تشریح کرتے جاتے اس میں ایک خاص لطف ہوتا۔ کیونکہ آپ نہ صرف کانٹ بلکہ اپنے آپ میں ڈوب کر بات کرتے۔ رومی۔ سعدی۔ حافظ۔ غالب اور اقبال کے بے شمار شعر یاد تھے۔ کانٹ کے مابعد الطبیعیاتی فلسفے کی شرح در حدیث دیگراں سُن کر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی اور خود خلیفہ صاحب اس کیفیت میں سرشار نظر آتے۔[2]

حیدر آباد میں آپ کے مشاغل

یہ زمانہ خلیفہ صاحب کی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ شام کے وقت بنگلے میں کلب کی سی کیفیت پیدا ہوتی۔

خلیفہ صاحب کی بذلہ سنجی، مزاح آفرینی، حاضر جوابی اور شاعری سے فضا گُھمگما اٹھتی۔ آپ کی بیاض میں ہر قسم کی نظمیں ہوتیں کبھی رات کے دو ڈھائی بجے خلیفہ صاحب کے گنگنانے کی آواز آجاتی، اسی وقت شعر موزوں ہو جاتے اور اگلے دن مغرب کے وقت سنا بھی دیتے۔[3]

یہ خلیفہ صاحب کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ہی تھی جس کی وجہ سے مولوی سید ابراہیم صاحب سے خوب خوب چوٹیں رہتیں۔ ان کے استدلال کے طریقے خلیفہ صاحب کے

---

[1] مقالہ از خواجہ بدر۔ اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ ص ۱۹

[2] مقالہ از پروفیسر حمید احمد خاں ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ ص ۵۴-۵۵۔

[3] مقالہ از ہارون خاں شروانی ایضاً ص ۷۳

استدلال کے طریقوں سے بہت مختلف تھے اور بحث ہوتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے دو ٹیل میز کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں اور کوئی ایک دوسرے کو پکڑ نہیں سکتا۔[۱]"

"ایک زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کا کلب نوبت پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں ٹینس اور ملکی و مقامی سیاست کے ساتھ ساتھ جھگڑا بھی چلتا۔ جھگڑے کے معاملے میں ڈاکٹر عبدالحق اور خلیفہ صاحب کی شخصیتوں میں اتحاد تھا۔ جب دونوں میں نوک جھونک ہوتی تو کلب کے ممبر لطف اندوز ہوتے۔[۲]"

حلقۂ احباب

قیام حیدرآباد کے زمانے میں خلیفہ صاحب پروفیسر وحیدالدین سلیم پانی پتی مرحوم کے اعلیٰ ادبی ذوق سے متاثر تھے اور ان سے اکثر صحبت رہتی تھی۔ نعتوں سے جو لگاؤ خلیفہ صاحب کو پیدا ہوا خواجہ بدر صاحب کا خیال ہے کہ وہ وحیدالدین سلیم صاحب کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "ان کی زندگی کے اس رخ کی تعمیر پر وحیدالدین سلیم صاحب کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہے۔[۳]"

ان کے علاوہ آپ حیدرآباد میں بہادر یار جنگ سے بہت متاثر تھے۔ آپ ان کے عزم و حوصلہ، خلوص اور تعلق رازی صفات کے بہت مداح تھے۔ ہارون خاں شروانی بھی اچھے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی اور خلیفہ صاحب کی شادی ایک ہی دن ہوئی تھی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے دوران میں آپ کی دوستی ڈاکٹر عبدالحق سے مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالحق سیاہ فام تھے اور خلیفہ صاحب گورے چٹے، خوش وضع، خوش شکل۔ دونوں علم و ادب کے پروانے اور یہی وجہ اشتراک ان میں گہری دوستی کا سبب بن گئی۔ روزانہ شام کو دونوں ایک ساتھ ٹہلنے جاتے اور دیکھنے والوں کے لیے سامانِ تفریح

---

[۱] مقالہ از ہارون خاں شروانی ثقافت ج ۸ ش ۶۔ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۴۲

[۲] مقالہ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں ایضاً ص ۷۷

[۳] مقالہ از خواجہ بدر اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۸

مہیا ہو جاتا۔ ایک سُرخ و سفید اور دوسرا کالا کلوٹا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مسکراتے باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں۔

"بعض طالب علموں نے اُنھیں "بلیک اینڈ وائٹ" (BLACK AND WHITE) کا لقب دے رکھا تھا۔[1]"

کشمیر میں ملازمت ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک

۱۹۴۳ء میں جب امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل کی اسامی خالی ہوئی تو حکومتِ کشمیر نے حضور نظام سے آپ کی خدمات مستعار لے کر آپ کو موقع دیا کہ آپ اپنے آبائی وطن کی تعلیمی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد آپ ناظم تعلیمات بھی مقرر ہوئے

"اُن سے پہلے خواجہ غلام السیدین اس عہدے پر رہ چکے تھے۔ خلیفہ صاحب کو یہ عہدہ پسند نہ تھا۔ وہ ڈائرکٹری کے کام کو ہیڈ کلرکی سے موسوم کرتے تھے اور کہتے مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ حکومتِ کشمیر مسلمان ڈائرکٹر رکھ کر اپنے ڈھب کا کام چاہتی ہے۔ خلیفہ صاحب سچے دل سے اپنے آبائی وطن کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مگر حکومتِ کشمیر تعلیم کو تجارتی طریقہ پر لانا چاہتی تھی۔ مہاراجہ کشمیر اور خلیفہ صاحب کی پالیسی میں بڑا اختلاف تھا۔ اس لیے آپ ۱۹۴۷ء میں استعفیٰ دے کر حیدر آباد چلے آئے۔[2]"

بشیر احمد ڈار ثقافت ۱۹۶۰ء میں لکھتے ہیں کہ آپ ۱۹۴۶ء میں ریٹائر ہو گئے مگر یہ بیان درست نہیں۔ کیونکہ عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے مراسلے کے مطابق خلیفہ صاحب ۱۴؍ جون ۱۹۴۹ء کو ریٹائر ہوئے تھے اور خلیفہ صاحب کی بیگم آپ کے بھائی عبدالغنی صاحب اور آپ کی صاحبزادی بیگم رفیعہ حسن بھی اس بات پر متفق

۱؎ مقالہ از حبیب اللہ رشدی۔ اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۷

۲؎ تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم از محمد الدین فوق ص ۱۸۰

نیز مقالہ از قاضی ایم اسلم۔ اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۴

اور مقالہ از عبداللہ قریشی ایضاً ص ۱۲۶

ہیں کہ آپ ۱۹۴۶ء میں ریٹائر نہیں ہوئے بلکہ حکومتِ کشمیر نے آپ کی خدمات کچھ مُدت کے لیے مستعار لی تھیں اور میعاد ختم ہونے پر آپ واپس حیدرآباد چلے گئے تھے۔

قیامِ کشمیر میں سیاسیات سے دلچسپی

کشمیر میں قیام کے دوران میں خلیفہ صاحب کے شیخ عبداللہ سے گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں انھوں نے کچھ سیاسی قسم کی پیغام رسانی بھی کی۔ گویا آپ نے بالواسطہ سیاست میں حصہ لیا۔ شیخ عبداللہ نیشنل کانگرس سے تعلق رکھتے تھے اور کانگرس کے حامی تھے۔ مسلم کانفرنس قائدِاعظم اور مسلم لیگ سے وابستہ تھی اور ان دونوں کے درمیان شدید اختلاف تھا۔ خلیفہ صاحب چاہتے تھے کہ ان دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے[1]۔

کشمیر میں آپ درجہ اول کے اسٹیٹ سبجیکٹ (STATE SUBJECT) قرار دیے گئے اور زمیندار بھی۔ آبائی زمینداری تو آپ کے دادا رمضان ڈار کے دیگر اقارب کے پاس رہی۔ البتہ کشمیر کی چند سالہ زندگی نے ان کے قلب و ذہن کو اتنا موہ لیا کہ آپ نے ذاتی جائداد پیدا کر کے نسیم باغ میں ایک بنگلہ تعمیر کر دیا۔ یہ وہی نسیم باغ ہے جس کے متعلق میاں محمد شاہ دین مرحوم نے یہ شعر کہا ہے۔

جی چاہتا ہے ہو میرا مسکن نسیم باغ
مر جائیے تو ڈل کے کنارے مزار ہو

آپ کا ارادہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد یہاں بیٹھ کر باقی زندگی لکھنے پڑھنے میں بسر کریں گے۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا کشمیر کے حالات دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ فسادات اور افراتفری سے خلیفہ صاحب کو بھی نقصان پہنچا۔ چنانچہ وہاں کی سکونت کا ارادہ ترک کر کے جبری نقل مکانی اختیار کرنی پڑی انھیں مکان و جائداد سے زیادہ افسوس کتابوں کے اس قیمتی ذخیرے کا تھا جو انھوں نے

---

[1] مقالہ از خواجہ بدر اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۰
نیز انٹرویو رفیعہ حسن صاحبہ

ربع صدی کے عرصے میں جمع کیا تھا۔

ملازمت کا تیسرا دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک

جب آپ کشمیر سے حیدر آباد واپس آئے تو آپ کو عثمانیہ یونیورسٹی میں میر شعبہ فنون (ڈین آف آرٹس) مقرر کیا گیا۔ دو سال حیدر آباد میں گزارنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۴۹ء میں لاہور آ گئے۔ خلیفہ صاحب کا حیدر آباد کو متعدد بار خیرباد کہنا بھی ان کی بے نیاز طبیعت کا غماز ہے۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی لکھتے ہیں۔

"یہ بھی خلیفہ صاحب کی جدت یا جودت تھی کہ انھوں نے تین مرتبہ حیدر آباد کو خدا حافظ کہا اور تینوں دفعہ اپنا تمام اثاثہ فروخت کیا۔ ایک مرتبہ تعلیمی رخصت پر یورپ کا سفر، پھر سری نگر کی ملازمت۔ غرض ہر مرتبہ لغوی اور اصطلاحی دونوں اعتبار سے خلیفہ صاحب سبکدوش ہو کر گئے۔ یہاں تک کہ حیدر آباد کا بنگلہ بھی فروخت کر دیا۔ اسٹاف اور طلبا میں ہردلعزیز تھے۔ اس لیے ہر مرتبہ دعوتیں اور عصرانے ہوتے۔ آپ نے اس بات کو کبھی نہ چھپایا کہ وظیفے کے بعد آپ پاکستان جا رہے ہیں۔ ہردلعزیزی کا یہ عالم کہ والس چانسلر بنفسِ نفیس آپ کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔"[1]

لاہور میں قیام

قیامِ پاکستان کے بعد آپ مستقل طور پر لاہور میں رہنے لگے لیکن لاہور میں ان کا قیام کئی لحاظ سے فائدہ مند ثابت ہوا۔ لاہور ہمیشہ سے برِصغیر کا اہم ثقافتی مرکز رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں خلیفہ صاحب نے اپنے پرانے رفیق غلام محمد مرحوم (گورنر جنرل پاکستان) کی مدد سے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔

یہ ادارہ آپ کے لیے مقصدِ حیات کا درجہ رکھتا تھا مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کا اصل مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظریات کو عملی شکل دینے کی کوشش کی جائے اس مقصد کے حصول کے لیے بقول اقبال اجتہادِ فکر کی انتہائی ضرورت تھی۔ مغربی تعلیم کے لادینی

---

[1] مقالہ از پروفیسر ہارون خاں شروانی ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۴۷

اثرات سے مسلمان نوجوانوں کا ذہن مسموم ہو چکا تھا۔ اسلام کی قدیم تعبیر اُن کے لیے بے اثر ہو چکی تھی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کی خوبیوں کے باوجود اس کے عملی فوائد سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس طبقے میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے ۱۹۵۰ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ وجود میں آیا جس کا بنیادی مقصد اسلام کی ابدی تعلیم اور مسلمانوں کے ثقافتی اور عملی کارناموں کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق پیش کرنا تھا اور بتانا تھا کہ اسلام کا دامنِ فکر اس بارے میں صرف یہ کہ تنگ نہیں ہے بلکہ اس لائق ہے کہ اس دور کے مسائل کو حل کر سکے۔ مسلمانوں کے تہذیبی و علمی ورثہ کو نئی پود کے ذہنوں میں مرتسم کرنے کے علاوہ اس ادارہ کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ قدیم و جدید طبقے میں جو فاصلے پیدا ہو گئے ہیں اُن کو حتی المقدور دُور کیا جائے۔ اور نئے اور پرانے دبستانِ علم میں ربط و تعاون کی ایسی موثر فضا پیدا کی جائے کہ جہاں قدیم و جدید علوم کے جاننے والے ایک ساتھ مل بیٹھ کر تحقیقی کام جاری رکھ سکیں۔

خلیفہ صاحب نے اس نازک دور میں ملک و قوم کی یہ نہایت ہی قابلِ قدر علمی خدمت انجام دی۔ یہی نہیں زندگی کے آخری دس سال ادارہ کے استحکام کے لیے وقف کر دیئے یہ اُن کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ کیونکہ تصنیف و تالیف کا بیشتر کام اس دور میں ہوا۔ اسی زمانے میں اُن کے قلم کے جوہر کھلے اور انھوں نے ایسی کتابیں اور مقالے لکھے جو جدید اسلامی افکار کی تاریخ میں ایک روشن ترین باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں سینٹ ہال میں اقبال ڈے منایا گیا اور خلیفہ صاحب نے اس میں "اقبال عاشقی کا گناہ گار نہ تھا" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ آپ کے زورِ کلام اور معنی آفرینی نے لوگوں کو خصوصیت سے متاثر کیا۔

۱۹۵۱ء میں آرٹ کونسل میں اقبال ڈے منایا گیا جس کی صدارت خلیفہ صاحب نے کی۔

۱۹۵۲ء میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی نوٹرے ڈیم (NOTER DAME) کی دعوت پر آپ امریکہ گئے۔ جہاں ایک بین الاقوامی مذاکرے میں حصہ لیا۔ اس کا موضوع تھا "اسلام میں تصورِ قانون"۔ آپ کا یہ خطبہ بعد میں دوسرے اراکین کی تحریروں کے ساتھ کتابی شکل

میں شائع ہوا[1]۔"

امریکہ سے واپسی پر اپریل ۱۹۵۲ء میں خلیفہ صاحب ایران گئے۔

"۲۱ اپریل کو سفارت خانۂ ایران میں یوم اقبال کی تقریب تھی جس میں خلیفہ صاحب نے بھی شرکت کی۔ جلسے کے صدر علامہ اکبر دہ خدا مرحوم تھے۔ اس جلسے میں خلیفہ صاحب نے فارسی زبان میں تقریر کی جس میں حاضرین کو بتایا کہ اقبال نے ملائیت پر کیسی نکتہ چینی کی ہے۔ یہ ان کی پہلی فارسی تقریر تھی۔ اگرچہ لہجہ ایرانی نہ تھا، مگر زبان صاف اور آواز بلند تھی جس سے حاضرین کو سمجھنے میں دقت نہ ہوئی آپ کی بذلہ سنجی لطیفہ گوئی کی وجہ سے ہال قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ یہ تقریر باقی پروگرام کے ساتھ ریڈیو تہران سے نشر کی گئی اور پڑھے لکھے طبقے پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا[2]۔"

عبدالحمید عرفانی صاحب کا کہنا ہے "کہ ایران کے اس مختصر دورے میں خلیفہ صاحب کئی ایرانی علما و اکابر سے ملے اور علامہ دہ خدا جیسی بزرگ ہستیاں بھی خلیفہ صاحب کی ذہانت اور ان کے علم و فضل سے متاثر ہوئیں[3]۔"

بقول ان کے "پاکستان اور ایران کے سیاسی روابط کا یہ ابتدائی دور تھا۔ خلیفہ صاحب نے اپنی گفتگو سے دونوں قوموں کے لسانی اور ثقافتی رشتوں کو استوار کیا اور اس طرح پاکستان اور ایران کے درمیان دوستی کی راہیں ہموار کرنے میں خلیفہ صاحب نے بہت اچھا کردار ادا کیا[4]۔"

بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ میں شرکت ۱۹۵۴ء

اشتراکیت اور مادیت کی یلغار سے خوف زدہ ہو کر مغربی ممالک کے عیسائیوں نے کوشش کی کہ دنیائے اسلام کے مفکرین ان کے ساتھ مل کر اس لادینی نظامِ فکر کا مقابلہ کریں۔ جب ان کی طرف سے اس قسم کی پیش کش کی گئی تو مسلمانوں نے اسے قرآن مجید

۱۔ مقالہ از بشیر احمد ڈار ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۵۹۔

۲۔ مقالہ از عبدالحمید عرفانی ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۶۴

۳۔ انٹرویو عبدالحمید عرفانی صاحب

۴۔ انٹرویو عبدالحمید عرفانی صاحب

کی دعوت سمجھ کر فوراً دستِ تعاون بڑھایا۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں لبنان کے شہر بحمدون میں ایک بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ کا پہلا جلسہ ہوا جس میں خلیفہ عبدالحکیم نے بھی شرکت کی۔ انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں ایک ایسے مذہب سے وابستہ ہوں جس کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی ہر بڑی جمعیتی قوم کے پاس خدا کے پیغمبر خدا کا پیغام لے کر آتے رہے ہیں۔ ان تمام پیغمبروں کی کتابوں اور ان کے مذاہب کی توقیر اور تصدیق بغیر قلب و ذہن میں اس وقت تک جب میں نہ تھا تب اس کا قائل نہ تھا کہ دین کی صحیح حقیقت کو پا سکتا۔ اسی اجتماع میں انھوں نے اس اہم مسئلہ پر گفتگو کی کہ اسلام کس طرح دنیا پیدا کر کے اپنی روحانی اور اخلاقی اقدار کو پہنچا سکتا ہے۔ خلیفہ صاحب مرحوم نے فرمایا۔ کہ اس معاملے میں اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت ہے۔ اور اس میں اس کام کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ نئی نسل کے سامنے اپنے نظریۂ حیات کو بہترین شکل میں اور موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق پیش کر سکے۔ اگر ہم نے کوشش کی تو بہت جلد مسلمان تہذیب و تمدن کے علمبردار بن سکتے ہیں اور باقی اقوام کے ساتھ امن و انصاف اور دوستی کی بنیاد پر زندگی کی شمع روشن کر سکتے ہیں۔[1] اس سلسلے میں خلیفہ صاحب نے حسبِ ذیل نکات کی تشریح کی[2]

(۱) اسلام کا اساسی عقیدہ کہ اس ذاتِ گرامی پر ایمان لایا جائے جس نے پوری کائنات کو پیدا کیا۔ اور اس کی پرورش اور پرداخت کا اہتمام کیا ہے

(۲) یہ کائنات اپنی بوقلمونی کے باوجود ایک ہے۔

(۳) ان تمام ابدی حقائق کو جاننا ضروری ہے جو تمام مذاہب کا مشترک سرمایہ ہیں۔

(۴) وحدتِ انسانیت دین کی روح ہے۔

---

[1] مقالہ از بشیر احمد ڈار، ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۵۹

[2] نوٹ :- یہ مقالہ خلیفہ صاحب نے انگریزی میں لکھا تھا جس کو رفیق ادارہ مولانا محمد حنیف ندوی نے عربی کے قالب میں ڈھالا۔ دیکھیے مذاکرات المؤتمر الاسلامی المسیحی الاول بحمدون لبنان ۲۲ تا ۲۷ اپریل ۱۹۵۴ء۔

(۵) غیب پر ایمان لانا چاہیے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ اس میں غیر محدود مضمرات ارتقاء پائے جاتے ہیں۔

(۶) اخلاق کے ابدی سانچوں کو ماننا چاہیے۔

(۷) اس حقیقت پر ایمان لانا چاہیے کہ انسانی "انا" غیر فانی ہے اور تمام روحانی اقدار کی محور و مرکز ہے۔

(۸) اس چیز کی حقانیت پر ایمان لانا ضروری ہے کہ عقل اگر تعصبات سے پاک ہو تو اس میں صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ابدی قوانین کا سراغ لگا سکے۔

(۹) یہ بھی ضروری ہے کہ عقل و وحی میں تضاد نہ مانا جائے

(۱۰) قوتِ ارادہ کے اختیار کو تسلیم کیا جائے، کیونکہ انسانی روح کی یہی بہت بڑی خصوصیت ہے۔

(۱۱) انفرادی ذمہ داریوں کو قبول کیا جائے۔

(۱۲) دعا کی تاثیر برحق ہے۔ اس کے ذریعے روحانی و نفسی امراض کی اصلاح ممکن ہے

(۱۳) اور اگر اللہ سے تعلق استوار ہو جائے تو روحانی ثروت و ارتقا کے بے شمار ابواب کھل جاتے ہیں[1]

اس مجلس کا پہلا جلسہ ۱۹۵۴ء میں ہوا اور دوسرا جلسہ دو سال بعد لبنان میں ۱۹۵۶ء میں ہوا "جہاں فیصلہ ہوا کہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور شیخ بہجت بیطار متحدہ امریکہ اور کینیڈا کا دورہ اس انجمن کے نمائندے کے طور پر کر کے وہاں کے لوگوں کے سامنے اسلامی دنیا کے نقطۂ نظر کی تشریح کریں اور اسلام کے امن و آشتی کے پیغام کو اُن تک پہنچائیں"

پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام بین الاعلیٰ اسلامی مجلسِ مذاکرہ بھی منعقد ہوئی جس میں ایران کے چند علماء جن میں ڈاکٹر رضا زادہ شفق، پروفیسر سعید نفیسی اور پروفیسر فروزاں فر بھی شامل تھے " مذہبی معاملات میں خلیفہ صاحب کی بلند اور وسیع نظر اور مشرق و مغرب کے فکری اور ادبی علوم سے گہری آشنائی سے یہ سب علما متاثر ہوئے[2]"

---

[1] مقالہ بشیر احمد ڈار۔ ثقافت جلد ۸ ش ۶-۷ ص ۵۹

[2] مقالہ از ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی ایضاً ص ۶۷

انڈیانا یونیورسٹی کنووکیشن

"۱۹۵۶ء کے شروع میں امریکہ کی انڈیانا یونیورسٹی نے خلیفہ صاحب کو کنووکیشن ایڈریس پڑھنے کی دعوت دی تھی اور امریکہ کے علمی حلقوں میں اس ایڈریس کو بہت اہمیت دی گئی۔[۱]"

"۱۹۵۷ء کے کنووکیشن میں یونیورسٹی نے انھیں ایل۔ایل۔ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔[۲]"

خطبہ جلسہ عطائے اسناد

۲۰ مارچ ۱۹۵۸ء میں خلیفہ صاحب نے اسلامیہ کالج لاہور میں جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھا۔ یہ خطبہ خلیفہ صاحب کی شگفتہ مزاجی اور بلند فکری کا ایک دلکش نمونہ ہے۔

ڈاکٹر نگینہ کاظمی کو پاکستان آنے کی دعوت

۱۹۵۸ء میں خلیفہ صاحب نے اس خاتون کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ یہ ایران کی مشہور علم دوست، روشن خیال خاتون اور ایران پاکستان کی ثقافتی انجمن کی بانی ہیں۔

خلیفہ صاحب نے پاکستان میں ان کو تقریباً تمام تاریخی مقامات دکھائے اور ثقافتی مجلسوں سے آشنا کیا۔ ڈاکٹر کاظمی ان کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوئیں کہ وہ ان کی ملاقات پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ "سیر کے دوران میں گرد و پیش کی ہر شے کے متعلق موصوف کے حکمت آمیز فقرے اور شعر میرے لیے سبق آموز بھی تھے اور دلچسپ بھی۔[۳]"

"خلیفہ صاحب کو اکثر غیر ممالک سے لیکچر دینے کی دعوتیں آتی رہتی تھیں۔ اور وہ انھیں قبول بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ سے واپسی پر لندن ٹھہرے۔ وہاں سے وطن واپس آنے کی بجائے سپین چلے گئے۔

---

[۱] مقالہ از انور اقبال قریشی ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۸۳

[۲] مقالہ از پروفیسر حمید احمد خاں ثقافت جون، جولائی ۱۹۶۰ء ج ۸ ش ۶-۷، ص ۵۵

[۳] مقالہ از ڈاکٹر نگینہ کاظمی ایضاً ص ۹۱

خلیفہ صاحب نے اسپین کی خوب سیر کی، قرطبہ دیکھا۔ غرناطہ گئے۔ الحمرا کی زیارت کی۔ جامع قرطبہ میں نماز پڑھی۔ وہاں سے ایک خط رفقائے ادارہ کے نام لکھا جس میں اپنی سیاحت کے ذکر میں چند سطروں کے بعد لکھا تھا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

گویا چند الفاظ میں پورا سفرنامہ لکھ ڈالا۔[1]

زندگی کے آخری دور میں جب آپ کا قیام لاہور میں رہا آپ نے بیرونی ممالک کے دورے بھی کیے اور اپنے ملک کی ذہنی زندگی کی نیز انفرادی طور پر بھی بہت اہم اور مفید کام سرانجام دیتے رہے۔ خلیفہ صاحب نے فلاسفیکل کانگریس کے پہلے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور نہایت اعلیٰ خطبۂ صدارت پڑھا۔

آپ ہندوستان کی فلاسفیکل کانگریس کے مابعد الطبیعیات کے سیکشن اور سائیکولوجی کے سیکشن کے صدر رہے۔[2]

۱۹۵۹ء میں آپ نے "نفسیات واردات روحانی" تالیف کی۔ فکر و تحریر کی ان کاوشوں کے ساتھ دینی، علمی اور قومی خدمت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ فقہی مسائل پر حکومت کی طرف سے جو کمیشن مقرر ہوتے رہے خلیفہ صاحب اپنی فطری وسیع النظری کے باعث ایسے ہر کمیشن کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں آپ کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ ثقافتی خطبات دینے کے لیے امریکہ بھیجے گئے۔ اسی عرصہ میں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے عہدے کی پیش کش دو تین مرتبہ ہوئی لیکن اپنے علمی مشاغل کے ساتھ اس منصب کے فرائض کو ہم آہنگ خلیفہ صاحب کو مشکل نظر آیا۔[3]

---

[1] مقالہ از رئیس احمد جعفری ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۹ء ص ۱۰۲
[2] مقالہ از پروفیسر ایم۔ ایم شریف ایضاً ص ۳۷
[3] مقالہ از پروفیسر حمید احمد خاں ثقافت جون، جولائی ۱۹۶۰ء ج ۸ ش ۶-۷ ص ۵۵۔

ایک بین الاقوامی ادارہ

"WORLD BROTHERHOOD OR FRIEND OF THE MIDDLE EAST" کے نام سے قائم ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام انسانوں کو ملک، مذہب، ملت، رنگ زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ یہ کوشش خالص اسلامی تھی۔ خلیفہ صاحب بھی اس ادارہ کے سرگرم رکن تھے۔ آپ کا دل ہر قسم کے تعصبات سے خالی تھا۔ دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں کے متعلق انسانی نقطۂ نگاہ سے سوچتے تھے۔ کبھی اختلاف مذہب و ملت کو درمیان میں نہ لاتے۔

زکوٰۃ کمیشن

حکومت پاکستان نے اسلامی قوانین کو جدید زمانے کی معاشرتی ضرورت کے مطابق تشکیل دینے کے لیے زکوٰۃ کمیشن بٹھایا جس کے ممبر خلیفہ صاحب بھی تھے۔ اس کمیشن کا مقصد یہ تھا کہ زکوٰۃ کی عملی صورتوں کو اس طرح منظم کیا جائے کہ اس سے معاشرتی فلاح و بہبود کا کام لیا جا سکے۔ مثلاً زکوٰۃ میں ابن السبیل کی مد بھی شامل ہے جدید رجحان کے علما موجودہ زمانے میں سڑکوں کی توسیع و مرمت، رابطہ، تار، ڈاکخانہ، ہوائی جہاز اور بحری جہاز کے اڈوں کو ابن السبیل کی مد کے مترادف قرار دیتے تھے۔ مگر قدیم فکر کے علما اس سے متفق نہ تھے۔ اس طرح ایک عمدہ کام سرانجام نہ پا سکا۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے عائلی کمیشن کی تشکیل کی تو خلیفہ صاحب اس کے بھی رکن بنے۔

فیملی لا کمیشن

خلیفہ صاحب اسلام کے بارے میں روشن خیال تھے۔ خاص طور پر عورتوں کے

مقالہ از بشیر احمد ڈار صاحب ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۶۰

انٹرویو ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب

حقوق کے بارے میں قرآن و حدیث سے استدلال کے سلسلے میں چھان بین اور تحقیق و تفحص کے قائل تھے۔ بطور فیملی لا کمیشن سیکرٹری آپ کی یہ کوشش رہی کہ ایسی احادیث جمع کریں جو اسلامی روح کی صحیح ترجمانی کر سکیں۔ وہ جانتے تھے کہ کٹر ملا اور قدامت پرست شیوخ کسی بات کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک ان کے لیے قرآن و حدیث سے سند نہ لائی جائے۔ وہ روشن خیالی کے لیے بھی ایسی ہی سند چاہتے تھے۔ اس فیملی لا کمیشن کے رُوحِ رواں خلیفہ صاحب تھے۔ اس کمیشن کی رپورٹ کے بعد گورنمنٹ نے ۱۹۶۰ء میں فیملی لا آرڈیننس جاری کیا جس میں عورتوں کے حقوق کی قابلِ قدر نگہداشت کی گئی۔

خلیفہ صاحب تقریباً ہر شام غیر ملکیوں کو درسِ قرآن بھی دیا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں ۱۹۵۸ء میں آپ آسٹریلیا بھی گئے۔ آپ پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے ممبر بھی تھے۔ اپنی ذہانت و قابلیت کی وجہ سے بہت قابلِ قدر ضوابط کا اضافہ کرتے رہتے تھے۔ ایم۔ اے اردو کے امتحان میں چھٹے پرچے کے ممتحن بھی رہے۔ وقار عظیم صاحب کہتے ہیں۔ "وہ نمبر کھلے دل سے دیا کرتے تھے"[1]

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

آپ کو اپنے ادارے، اپنے مقصد اور کام سے بہت لگن تھی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے مدیر موسس کی حیثیت سے انھوں نے ایک وسیع دائرۂ فکر و عمل قائم کیا۔ آپ کی علمی کاوشوں کا ثبوت وہ گرانمایہ کتابیں ہیں جو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے چند برسوں میں کثیر تعداد میں شائع کیں۔

ڈاکٹر محمد باقر صاحب اقبال ریویو میں لکھتے ہیں کہ ایک بار میں نے ان کے کام کی تعریف کی، تو انھوں نے بڑی صدق دلی سے فرمایا۔ تنہا خود کام کرنا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا اپنے گرد ان آدمیوں کو جمع کرنا جو آپ کے کام کو آگے بڑھائیں۔ پھر دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ شبلی نے بہت کام کیا ہے۔ اس لیے میں ان کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ مگر دارالمصنفین کی تاسیس شبلی کا ایک ایسا کارنامہ ہے۔ جو ان کی اپنی

---

[1] انٹرویو جناب ممتاز حسن صاحب و سید وقار عظیم صاحب

تالیفات کے مقابلے میں بہت وقیع ہے۔[1]

خلیفہ صاحب بھی آخر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اور انھوں نے بشیر احمد ڈار، شاہد حسین رزاقی، محمد حنیف صاحب ندوی، رئیس احمد جعفری اور مولانا جعفر شاہ پھلواری ایسے مایہ ناز مصنف اپنے ارد گرد جمع کر لیے جو آج تک مفید تصنیفات سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

ایک دن خلیفہ صاحب نے ڈاکٹر محمد باقر صاحب سے پوچھا آپ نے کبھی سوچا کہ میں نے اس کا نام اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کیوں نہ رکھا۔ اسلامک کلچر انسٹی ٹیوٹ کیوں رکھا۔ محمد باقر صاحب فرمانے لگے "بظاہر تو کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ آپ نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نام رکھ کر ادارے کا دائرہ عمل وسیع تر کر لیا ہے۔ کہنے لگے آپ ٹھیک سمجھے۔ اگر میں اس کے نام کو صرف اسلامی تحقیق تک محدود کر لیتا تو ہم مذہب کے دائرے سے باہر نہ نکل سکتے۔ اسلامی ثقافت کے نام نے ادارے کے لیے کام کی بہت سی راہیں سجھائی ہیں۔ ان میں مذہب بھی شامل ہے۔"[2]

۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کی بات ہے کہ خلیفہ صاحب نے ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب کو پارٹی دی۔ دراصل یہ ممتاز حسن صاحب کی خواہش تھی۔ کیونکہ وہ خلیفہ صاحب سے تصوف کے موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ اس پارٹی سے ممتاز حسن صاحب کی مراد پوری نہ ہوئی۔ وہ تو خلیفہ صاحب کی صحبت کے دلدادہ تھے اور چاہتے تھے کہ خلیفہ صاحب سے اکیلے میں ملیں تاکہ بہت طویل گفتگو ہو۔ اس لیے خلیفہ صاحب نے دوبارہ کراچی میں ملنے کا وعدہ کیا۔

---

[1] مقالہ از محمد باقر صاحب اقبال ریویو ج ۲ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۹

[2] ایضاً ص ۱۰

"چنانچہ ۱۹۵۹ء میں آپ انٹرنیشنل کانگرس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور اسلام کا نظریہ پیش کیا۔ وہاں کچھ مغربی محقق بھی آئے ہوئے تھے۔ خلیفہ صاحب نے ان کے کام پر تنقید بھی کی اور خامیوں کی نشاندہی بھی کی۔"[1]

وفات

خلیفہ صاحب ان دنوں کراچی گئے ہوئے تھے اور جناب ڈاکٹر باقر صاحب بھی اتفاق سے کراچی ہی میں موجود تھے۔ باقر صاحب خلیفہ صاحب سے ملنا چاہتے تھے تاکہ لاہور کی خبروں سے آگاہ ہو سکیں۔ انہیں معلوم ہوا کہ آپ ممتاز حسن صاحب کے ہاں مقیم ہیں اور اب انہیں سے ملنے گئے ہیں۔ وہاں فون کیا تو ممتاز حسن کی سیکرٹری کی آواز آئی اور خلیفہ صاحب کے بارے میں پوچھنے پر اس نے ممتاز حسن صاحب سے بات کروا دی۔ ممتاز حسن صاحب بولے کہ باقر صاحب آپ کہاں ہیں؟ "میں ڈاکٹر رشید کے گھر میں ہوں" باقر صاحب نے کہا۔ ممتاز حسن گھبرائی ہوئی آواز میں بلاتوقف بولے "آپ فوراً پہنچیں خلیفہ صاحب کو غش آگیا ہے" جب باقر صاحب وہاں پہنچے تو خلیفہ صاحب صوفے پر بیٹھے تھے اور ڈاکٹر انجکشن لگا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ نبض دیکھی، دھڑکن دیکھی اور یاس و اضطراب سے بھرپور چہرہ ان کی جانب کر کے سر کو منفی انداز میں جنبش دی۔ ڈاکٹر محمد باقر صاحب کہتے ہیں:

"میرے سینے سے بے اختیار ایک کراہ نکلی، فوت ہو گئے؟" "ہاں" ڈاکٹر نے پاس ہی پڑا ہوا ایک تولیہ خلیفہ صاحب کے چہرے پر ڈال دیا اور میں ممتاز حسن کے بلاوے پر ان کے پاس پہنچا۔ ممتاز حسن صاحب بے حس و حرکت سر جھکائے بیٹھے تھے میں نے ان سے تفصیل پوچھی تو انہوں نے کہا "ابھی ابھی خلیفہ صاحب آئے اور کہنے لگے میں حافظ مجید سے مل کر آرہا ہوں۔ پھر باتھ روم کا پوچھا میں نے بتا دیا آپ یہاں خلاف معمولی دیر لگانے کے بعد لوٹے اور آ کر میری میز کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں کاغذات

---

[1] انٹرویو۔ ممتاز حسن صاحب

سنبھال رہا تھا۔ اس لیے خلیفہ صاحب سے کہا آپ تشریف رکھیں کام ختم کرلوں تو فراغت سے باتیں کریں گے۔ جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو مجھے یہ بات خلیفہ صاحب کی طبیعت کے پیشِ نظر خلافِ معمول نظر آئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر کہہ رہے تھے "OH MY HEART THIS HAS NEVER HAPPENED BEFORE" (او میرا دل ایسے کبھی یہ کیفیت نہ ہوئی تھی) ممتاز حسن صاحب نے انہیں صوفے پر لٹا دیا اور کرنل جعفر کو فون کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر بھیج دیا اور بس۔

یوں ہنستا کھیلتا انسان ایک منٹ میں اس دنیا سے رشتہ توڑ کر قوم کو عظیم صدمے سے دوچار کرکے رخصت ہو گیا۔[1]

مگر خلیفہ صاحب کی موت عین ان کی خواہش کے مطابق ہوئی وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے تو خدا سے سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ اے خدا مجھے ایڑیاں نہ رگڑ وانا۔ بس اتنا حکم دینا کہ حکیم آجا! اور میں آجاؤں گا۔ آخر وہی ہوا ایک منٹ کے اندر اندر خلیفہ صاحب کو بلاوا آگیا۔ اور خلیفہ صاحب نے بھی قادرِ مطلق کے حضور لبیک کہہ کر الغائے عہد سے سبکدوشی حاصل کی ہے

موت ان لوگوں سے کیا آ کے تجھے لینا ہے
موت سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں (ورق)

اُس وقت سوا ایک ہو چکا تھا۔ خلیفہ صاحب کے بھائی عبدالغنی اور اُن کے عزیز حمید غنی صاحب کو فون کیا گیا۔ کار منگائی گئی اور لاش لے جانے والا صندوق لایا گیا۔ ڈاکٹر باقر اور حمید غنی لاش کو صندوق میں ڈالنا چاہتے تھے۔ مگر لاش پھسل پھسل جاتی تھی انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے جو شخص چلتا پھرتا اور ہنستا بولتا اس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اب ریت کے ذروں کی مانند بکھرا پڑا تھا۔

---

[1] مقالہ از ڈاکٹر باقر صاحب اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۳-۱۴

ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں "خلیفہ صاحب، زندگی میں جب کبھی محوِ گفتار ہوتے تو ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا اور یہ جسدِ بے جان، مرنے کے بعد بھی ہم سے نہیں سنبھالا جا رہا تھا"۔

بالوسی کے عالم میں اُن کی کلائی سے گھڑی اُتار کر لاش سے الگ کی گئی تو ڈھائی بجے تھے۔ اُس کی ٹک ٹک بدستور جاری تھی۔ مگر گھڑی والے کے دل کی ٹک ٹک زمان و مکاں کے قیود سے دور ایک ایسی صدا سے سرمدی بن چکی تھی جو صرف نیک ارواح کا مقدر ہے۔ وزارت داخلہ کے ملازموں نے ہماری بے بسی دیکھ کر لاش کو سنبھالا اور صندوق میں ڈالا۔

باقر صاحب نے تھرموس خلیفہ عبدالغنی کو دے دیئے نوٹ اور فائل خود اٹھا لیے جو صوفے کے ایک طرف پڑے ہوئے تھے اور نچلی منزل میں آ گئے۔ باقر صاحب کہتے ہیں "صندوق ایمبولینس کار میں رکھا گیا۔ میں نے نوٹ ساتھ رکھ دیئے، فائل بستر میں رکھ دی اور بیل بستہ میں ڈال کر بند کر دیا اور سوچ رہا تھا کہ اب یہ بستہ اس کا مالک کبھی نہ کھول سکے گا"۔[۱]

خلیفہ صاحب یوں سفروں میں چھوڑ کے چل دیئے جیسے اس دنیا سے کبھی کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔

کراچی جانے سے پہلے کی بات ہے کہ خلیفہ صاحب کی بھتیجی اختر باجی اور اختر باجی کی بیٹی نغمہ خلیفہ صاحب کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ خلیفہ صاحب باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ "انسان اپنی زندگی میں تین ادوار سے گزرتا ہے۔ بچپن کا زمانہ صبح سے مناسبت رکھتا ہے۔ دوپہر جوانی ہے اور شام بڑھاپا۔ لیکن اگر ابر چھا جائے تو شام جلد تاریکی میں بدل جاتی ہے۔ اب میں زندگی کے اس دور میں ہوں کہ اگر مطلع صاف رہا تو ٹھیک ہے

---

[۱] مقالہ از ڈاکٹر باقر صاحب اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۲-۱۳-۱۴-۱۵
نیز انٹرویو ڈاکٹر باقر صاحب

اور اگر ابر چھا گیا تو ہونے والی ہو کر رہے گی۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب کو پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ اب ان کی زندگی کے آخری دن ہیں۔[1]

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۵۹ء کا دن آپ کی زندگی کا آخری دن تھا۔ اسی دن آپ کا جسم خاکی بذریعہ ہوائی جہاز لاہور لایا گیا اور ۳۱ر جنوری ۱۱ بجے کے قریب ۴۴ وارث روڈ سے آپ کا جنازہ اٹھایا گیا اور آپ کے جسد خاکی کو میانی صاحب کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ لوحِ مزار پر حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر کندہ ہے ؎

بر سرِ تربتِ ما چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندانِ جہاں خواہد بود

اس ضمن میں یہ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ صاحب کے کراچی جانے سے قبل ان کی بیوی رفیعہ نے جب دیوانِ حافظ سے فال کے طور پر رجوع کیا تو حافظ کا یہی شعر نکلا جو لوحِ قبر پر مرتسم ہے۔ دوبارہ سہ بارہ جب بھی رجوع کیا تو یہی شعر نکلا۔

خلیفہ صاحب کی موت کا عظیم حادثہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ ایسے عالم، ادیب اور مفکر کی موت پوری قوم اور ملک کے لیے عظیم صدمہ ہے۔ کیونکہ صدیوں کے بعد خلیفہ صاحب ایسا جامع کمالات انسان اس دنیا میں آتا ہے۔

آں کسے کہ خدمتش ہمت عزم او ستند
مرگش نہ مرگ یک تن و لی مرگ امتے است

خلیفہ صاحب کی موت سے سارے پاکستان بلکہ پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ ان کی یاد میں متعدد جلسے منعقد ہوئے۔ جن میں ان کو باقاعدہ خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

خلیفہ صاحب کی موت پر ممتاز شخصیتوں کے تاثرات

ملکی اور غیر ملکی ادیبوں اور مفکروں نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں تعزیت کے خطوط

---

[1] انٹرویو اختر باجی (بھتیجی خلیفہ صاحب)

لکھے جن میں ان کے فکر، فلسفے اور ادب کے بارے میں ارفع و اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا۔
پیر غلام دستگیر نامی نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کو خلیفہ صاحب کی یہ تاریخِ وفات لکھ کر دی ہے

"از جہاں شد ناگہاں عبدالحکیم | شد بلند از رحلتش آہ و بقا
بہر تاریخش چو نامی فکر کرد | گفت ہاتف نامیا گو برملا

رحلت عبدالحکیم سعد بخت

ارتحالِ خواجہ اہلِ وفا"[1]

۱۳۷۸ھ ۱۹۵۹ء

جب خلیفہ کی ناگہانی موت کی خبر ایران پہنچی تو ان کے صدہا جاننے والوں کو دلی صدمہ ہوا۔

انجمن فرہنگی ایران، پاکستان کی طرف سے پاکستان کے اس عظیم المرتبت ادیب اور عالم کی یاد میں ایک جلسہ ہوا جس میں ایران کے علما فضلا اور شعرا نے شرکت کی اور ایران کے گرامی قدر شاعر آقائے سرمد نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔ اس میں خلیفہ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آپ کی علمی بصیرت اور علم و فکر کا ذکر کرتے ہوئے آقائے سرمد نے کہا "یقیناً ایسی عظیم الشان شخصیت کی رحلت باعث صد افسوس و درجۂ ملال ہے مگر

الاجرم در مرگِ اہلِ معرفت
گفت باید" اے دریغا عالمے

کسی حق شناس کی موت پر بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم یہ کہیں "آہ عالم کی موت عالم کی موت ہے"۔

آقائے سرمد کے بعد ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے خلیفہ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ خلیفہ صاحب کو دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا تھا۔

---

[1] مقالہ از غلام دستگیر نامی ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۲۴

می شنیدم کہ جاں جانانی
بینم اکنوں ہزار چندانی

انھوں نے خلیفہ صاحب کی موت کو ایک عظیم صدمہ قرار دیتے ہوئے کہا افسوس صد افسوس! یہ گنجینہ علم و معرفت بے سروسامانی کے عالم میں ہمارے ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ پیغام تعزیت ایران کو دوں یا پاکستان کو کیونکہ تمام ملتیں خلیفہ صاحب کے حادثہ ارتحال سے غمزدہ ہیں۔ خدا مرحوم کو بہشت جاوداں میں جگہ دے اور ان کے خاندان اور احباب کو صبر و تحمل کی توفیق عطا کرے۔

اُن کے بعد عبدالحمید عرفانی صاحب نے خلیفہ صاحب کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے۔ ان کی زندگی عظمت و فکر اور علمی آثار کا یہ تفصیلی احاطہ کیا اور بعدازاں اپنے احساسات ایک نظم کی شکل میں پیش کیے۔

"ای حکیم اے مایۂ دانش وراں — ایکہ بودی افتخار دوستاں
ای دریغ آں گرمی گفتار تو — ای دریغ آں کلک گوہر بار تو
از دم تو امتزاج دل نشیں — یافت فکر شرق یا مغرب زمیں
حرف تو از عشق و از بازار عشق — فکر تو دانندۂ اسرار عشق
بہر تبلیغ محبت ہر زماں — گاہ جفت شرقیاں گہ غربیاں
تو بہر جمعیتی نالاں شدی — بہر انساں چشم تو گریاں بُدی
قال تو مارا زبان حال بود — یادگار رومی و اقبال بود
اے حکیم اے ہم نشین اولیا — مرگ تو گامیست در راہ بقا
اے حیات عاشقاں در مردگی — دل نیابی جز کہ در دل بردگی[1]"

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب نے خلیفہ صاحب کی وفات پر اپنے تاثرات اس رباعی میں پیش کیے ؎

---

[1] مقالہ از عبدالحمید عرفانی صاحب ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۷۰

"مے خانۂ اقبال کا ساقی نہ رہا — وہ عارفِ رومی و عراقی نہ رہا
مجموعۂ علم و فضل و شعر و حکمت — تھا ایک حکیم وہ بھی باقی نہ رہا"[1]

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم جو خلیفہ صاحب کے بھتیجے ہیں۔ آپ کی وفات پر عظیم صدمے سے دوچار رہے اور پھر آپ کی جدائی میں نالۂ فراق لکھا۔ جس سے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

یہ کہہ رہی ہیں عزیزوں کی اشکبار آنکھیں — کہ اب تلاش کریں کیسے اس مسافر کو
کہ جس کے نغمے وہ بانگِ درا تھے جس کے سبب — کچھ اور آگے بڑھے دشتِ زیست کے رہرو
جو خوشہ چین ضیا میں فریفتہ تھے تمام — یہ کہہ رہے ہیں نگینے اشک آنکھ سے بہہ کے
گیا ہے زیرِ زمیں آج وہ دُرِ نایاب — حیات جس کی تجلی کو تا ابد ترسے
بھتیجے آپ کے جن کو نشانِ منزل تھے — وہ ان صحیفوں کو اب حرزِ جاں بنالیں گے
مگر وہ لوگ جو خود آگ کے تھے شیدائی — چراغ آپ کا اب کس طرح نکالیں گے
اجل پہ تف ہے کہ اب بےگھری ہوا تیرہ خاک — کہ جن سے زیست تاحیات مستعار لیتی ہے
فغاں یہ خاک کہ وہ پھول ابھی ہوں نذرِ عدم — کہ جن سے رنگ حروف خود بہار لیتی ہے[2]

جسٹس ایس اے رحمان جو خلیفہ صاحب کے مخصوص قدر دانوں میں سے ہیں۔ انھیں خلیفہ صاحب کی وفات پر انتہائی صدمہ پہنچا۔ انھوں نے اپنے تاثرات کچھ یوں بیان کیے ہیں۔

"۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کی صبح تھی اخبار میرے ہاتھ میں تھا۔ ایک دم میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ خلیفہ صاحب کی کراچی میں ناگہانی وفات کی روح فرسا خبر سیاہ الفاظ میں آنکھوں میں تیرنے لگی۔ بیوی نے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا کیا ہوا؟ میں نے کہا خلیفہ صاحب چل بسے۔ چند لمحوں تک فضا پر سکتہ سا طاری رہا۔ پھر اضطراری طور پر انا للہ و انا الیہ راجعون کے الفاظ میری زبان پر جاری ہو گئے۔"

---

۱ انٹرویو افتخار احمد صدیقی صاحب۔

۲ مقالہ از ڈاکٹر سلیم واحد سلیم، ادبی دنیا۔ نمبر ۱ اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۱۰۷ - ۱۰۸

. . . یہ تھا اس انسان کا انجام جس کا ہنستا ہوا چہرہ میں نے چند روز قبل دیکھا تھا اور اس وقت بھول کر بھی خیال نہ آیا تھا کہ ہماری آخری ملاقات ہے"۔[1]

اختر حسین صاحب جو اس وقت وزیرِ تعلیمات و اطلاعات تھے خلیفہ صاحب کی موت پر غم کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

"ڈاکٹر خلیفہ صاحب فضل و کمال اور ایک ایسے فلسفی تھے جن کے کارناموں کی قدر میرے دل میں ہے۔ ان کی ناگہانی موت نے قوم کو ایک ایسے ممتاز فاضل کی خدمات سے محروم کر دیا ہے۔۔۔ ان کی رحلت کا احساس اور شدید ہو تا ہے۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ جس کام کا انھوں نے آغاز کیا۔ اس کی تکمیل کے لیے مشکل سے ان کا کوئی جانشین بروئے کار آئے گا۔ میں اس غم و اندوہ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا مرحوم کی روح پر خیر و برکت برسائے"۔[2]

وزیرِ تعلیم جناب حبیب الرحمٰن صاحب ان الفاظ میں خلیفہ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی وفات سے مجھے شدید صدمہ ہوا۔ میرے لیے یہ حادثہ اس لیے زیادہ سنگین وہ تھا کہ جس دن خلیفہ صاحب کا انتقال ہوا۔ وہ اسی صبح کو مجھ سے ملے تھے۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کو ترقی دینے کی تجویز پر گفتگو کی تھی۔ آپ مشہور و معروف ماہرِ تعلیم اور اسلام کے سچے پرستار تھے وہ تمام عمر ملک و ملت کی خدمت پوری قابلیت سے انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنی نعمتیں نازل فرمائے"۔[3]

ڈاکٹر اپیل بقد من نے جب یہ سنا کہ خلیفہ صاحب سفرِ آخرت اختیار کر چکے ہیں تو غم و اندوہ سے ان کی طبیعت نڈھال ہو گئی اور کہنے لگے۔

"میں اس عظیم نقصان میں جو ان کی رحلت سے ملک اور قوم کو پہنچا ہے۔ آپ کے ساتھ برابر کا شریک ہوں ذاتی طور پر اس کا اور بھی احساس ہے۔ کیونکہ اسلامی فکر سے آشنا ہونے کی خاطر

---

[1] مقالہ از الیس۔ ملے۔ رحمان صحیفہ تیسرا سال ش ۱۔ جون۔ جولائی۔ اگست ص ۲۸۷
[2] مقالہ از اختر حسین ثقافت ج ۸ ش ۶۔۷ جون۔ جولائی ۱۹۶۰ء ص ۲۱
[3] مقالہ از حبیب الرحمٰن ثقافت ج ۸ ش ۶۔۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۲۲

اس فاضل جلیل سے مزید راہ رسم پیدا کرنے کی فکر میں تھا۔[1]

پروفیسر رشید احمد صدیقی اس عظیم صدمے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پاکستان سے تین بڑے آدمیوں کا یکے بعد دیگرے علاحدہ اٹھ جانا بڑا دردناک سانحہ ہے یعنی خلیفہ صاحب، پطرس اور سالک جن کا بدل اس وقت دور دور نظر نہیں آتا۔ "آں عاشقانِ پاک طینت" پر خدا کی رحمت ہو۔"[2]

ان کے علاوہ ملک کے گوشے گوشے اور غیر ممالک سے بھی خلیفہ صاحب کے بارے میں تعزیتی خطوط موصول ہوئے۔ ان سب کو درج کرنا بے حد مشکل ہے۔ ان خطوط سے خلیفہ صاحب کی ہر دلعزیزی اور مفکرانہ عظمت کا ثبوت ملتا ہے۔

ازدواجی زندگی اور اس کی تفصیلات

خلیفہ صاحب کی شادی ۱۳ر جنوری ۱۹۲۰ء کو ہوئی اس وقت خلیفہ صاحب کی عمر ۲۱ سال اور خدیجہ بیگم کی عمر ۱۵ سال تھی۔ خدیجہ بیگم مولوی عبدالغنی کی صاحبزادی ہیں۔ کوئین میری کالج میں زیر تعلیم رہیں۔ اس سکول میں لندن کے سکول FINISHING کی طرح ادبی ذوق کے علاوہ گھریلو کام کاج اور ادب و تہذیب کی تربیت بھی دی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ خدیجہ بیگم تعلیم کے ساتھ کھانا پکانے اور سلائی کڑھائی میں بھی ماہر ہیں۔ خلیفہ صاحب چونکہ علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے اس لیے ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیگم شادی کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں۔ مگر بیگم خلیفہ صاحب کو مزید تعلیم جاری رکھنا مشکل نظر آیا۔

اولاد

شادی کے دو سال بعد جون ۱۹۲۲ء میں عارف حکیم پیدا ہوئے۔

عارف حکیم

عارف حکیم نے میٹرک لاہور کے مسلم سکول سے کیا۔ ایف۔ ایس۔ سی گورنمنٹ کالج

---

[1] مقالہ از ڈاکٹر ایرل بیغ من ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۳۰

[2] مقالہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی ایضاً ص ۳۲

لاہور سے کیا اور ایم۔ ایس۔ سی لکھنؤ یونیورسٹی سے۔ اس کے بعد فورسٹ اکیڈمی ڈیرہ دون سے ٹریننگ لے کر فورسٹ سروس میں آ گئے۔ لیکن وہ اس ملازمت سے خوش نہ تھے کیونکہ یہ باہر جانا چاہتے تھے تاکہ کوئی ایسا کام سیکھیں جس سے ملک کو فائدہ ہو۔ خلیفہ صاحب کی اجازت سے آپ کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور یہ کینیڈا چلے گئے جہاں پر انھوں نے آئل ٹیکنالوجی میں ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد وہیں کام کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً سات سات سال کا عرصہ انھوں نے وہاں گزارا۔ خلیفہ صاحب کی یہ خواہش تھی کہ یہاں آ کر رہیں بلکہ ایک بار شفقت سے خط پر شرط بھی لکھا کہ کینیڈا میں بہت گھوم چکے ہو اب واپس آ جاؤ۔ لیکن ہارون حکیم صاحب کا شوق اور لگن اس قدر شدید تھی کہ بیرونی ملک ہی میں رہنے کی ٹھان لی اور واپس نہ آ سکے۔ اسی دوران خلیفہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ عارف حکیم صاحب کی شادی شہناز حسین صاحب کی لڑکی سے ہوئی۔ آپ کی ایک لڑکی اور لڑکا ہے اور آج کل یہ پاکستان میں رہ رہے ہیں۔

صوفیہ

خلیفہ صاحب جب جرمنی گئے تو خدیجہ بیگم بھی ان کے ساتھ گئیں۔ وہاں ان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا نام صوفیہ رکھا گیا۔ بیگم خلیفہ، خلیفہ صاحب سے پہلے ہی پاکستان لوٹ آئیں کیونکہ ایک تو خلیفہ صاحب کی پڑھائی میں حرج ہوتا تھا اور دوسرے صوفیہ کو وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ یہاں آ کر صوفیہ کو چیچک کا ٹیکہ لگوایا۔ بچی چونکہ بہت کمزور تھی اس لیے اُسے بخار ہو گیا اور ساتھ ہی نمونیہ بھی۔ چند ماہ بعد وہ فوت ہو گئی۔

رفیعہ حسن

اس کے بعد حیدرآباد میں رفیعہ پیدا ہوئیں۔ ان کو فلسفے سے لگاؤ اپنے باپ سے وراثت میں ملا۔ ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ کالج سے انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ ان کا شمار کالج کی بہترین طالبات میں ہوتا تھا۔ خلیفہ صاحب خود کہا کرتے تھے "کہ میری ذہانت رفیعہ کے حصے میں آئی ہے" اس کے بعد ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم ای ڈی (MED

اور پھر مروس رہی گئے۔ دوران ۱۹۶۴ء میں انھوں نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
ان کی شادی دسمبر ۱۹۵۲ء میں اپنے خالہ زاد بھائی مسعود حسن سے ہوئی۔ یہ دس سال حیدرآباد یونیورسٹی میں سائیکالوجی کی لیکچرار رہی ہیں اور ۱۹۶۴ء سے لاہور میں یونیورسٹی کیمپس میں سائیکالوجی کی ریڈر ہیں۔

رفیعہ حسن صاحبہ کی اولاد

ان کے ہاں تین بیٹیاں ہوئیں جن میں سے دو بقید حیات ہیں۔ سب سے بڑی لڑکی کی پیدائش تو خلیفہ صاحب کی زندگی میں ہو چکی تھی لیکن صرف پندرہ سال کی عمر میں چند روز علیل رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ خلیفہ صاحب کو اپنی نواسی سے بہت پیار تھا۔ اس کو سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ کراچی جانے سے قبل "العقبیٰ" کی دو جلدیں تحریر کر دی تھیں۔ اس میں وہ سونے سے قبل خلیفہ صاحب سے ایک کہانی سنا کرتی تھی۔

خلیفہ صاحب روپیہ پیسہ کے معاملے میں خاصے محتاط تھے۔ فضول خرچی سے گھبراتے تھے۔ اکثر مطالعے میں مصروف رہتے اس لیے گھر اور بچوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکتے تھے۔ اکثر وبیشتر تنہا خاص خاص دوستوں کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اپنی بیگم کے ساتھ کم ہی جاتے۔ البتہ بیگم صاحبہ کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور انھیں کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ جو چاہیں نہیں کر سکتیں۔ خلیفہ صاحب اور خلیفہ بیگم کے مزاج اور عادات میں خاصا فرق تھا جس کی وجہ سے کبھی کبھی اختلاف ہو جاتا مگر اس اختلاف نے جھگڑے کی صورت کبھی اختیار نہ کی۔ بس زندگی ایک ہموار سی ڈگر پہ چلی جا رہی تھی۔

خلیفہ صاحب اپنے رشتہ داروں کا بھی خود ہی خیال رکھتے۔ اس معاملے میں بیوی پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپ کی ازدواجی زندگی بہت خوش گوار تھی۔ وہ اکثر اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے تھے کہ انھیں اپنے گھر کا اور بیوی بچوں کا بہت خیال رہتا ہے۔ اپنے علمی مشاغل اور فکری رجحانات کے باوجود ازدواجی

زندگی کے معاملات سے بھی غافل نہ تھے۔ خانہ داری کے انتظامات کی طرف متوجہ
ہو گئے تو بڑے بڑے کام خود ہی نمٹا لیتے۔

کینیڈا، امریکہ اور جاپان گئے تو بچوں، عزیزوں اور خدیجہ بیگم کے لیے ایسی چیزیں
لائے جن سے پتہ چلتا تھا کہ آپ کو صنفِ نازک کی پسند کا کس درجہ احساس ہے۔
ورنہ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ دریائے علم میں غوطہ زنی کے سوا آپ کو کسی اور بات
سے تعلق ہی نہیں۔

جب کبھی خدیجہ بیگم لاہور سے باہر جائیں آپ گھر کی نگہداشت عورتوں کی طرح
کرتے۔ خدیجہ صاحبہ جب حج کو تشریف لے گئیں تو اس شوق سے ذمہ داری کی صورت
اختیار کر لی۔ شاید اس وقت یہ خیال تھا کہ بیوی باہر گئی ہوئی ہیں۔ یہ سارے کام ان
کی عدم موجودگی میں انجام پا جائیں تاکہ انھیں کسی پریشانی کا سامنا نہ ہو۔ آپ بیوی
کی موجودگی میں بھی گھر کا خیال رکھتے۔ خوب صورت اور نفیس چیزوں سے انھیں فطری
لگاؤ تھا۔ اگرچہ اُن کے دل میں ایسے ٹھاٹھ کی مطلق آرزو نہ تھی جو غنیٔ حسن تعمیر تک
محدود ہو تاہم تعمیر میں بھی اس کا خیال ضرور رکھتے۔ فی الحقیقت وہ جمالیاتی ذوق کے
باوجود دل کے درویش تھے۔

نوکروں سے کبھی ناراض نہ ہوتے، بلکہ اُن کا خیال رکھتے اور مستعد فرض شناس
نوکروں کی بے حد تعریف کرتے۔ اگر کوئی کام وقت پر نہ ہوتا تو اُن سے یہ نہ کہتے کہ یہ کام
کیوں نہ ہوا۔ بچوں سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ کبھی ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ لیا۔ بات
میں بات پیدا کرنے اور دلآویز تدبیروں سے اپنی بات منوا لیتے اور کہتے "اگر میں مال ہوتا
تو بچے کو کبھی رونے نہ دیتا"۔ بلوغت کے بعد بچوں کے معاملات میں دخل نہ دیتے۔ اپنی
رائے کا اظہار کر کے کہتے اب تم لوگ سمجھ دار ہو۔ اپنی بُرائی بھلائی خود سمجھ سکتے ہو۔ عارف
حکیم باہر جانا چاہتے تھے۔ پہلے روکا پھر ان کا اصرار دیکھ کر بخوشی جانے کی اجازت دے
دی۔ امریکہ جانے کا اتفاق ہوا تو دونوں قریب تھے۔ ٹورنٹو گئے تو عارف کے کمرے میں ٹھہرے
اور ننھے بچے کی طرح اسے اپنے ساتھ سلایا۔ بیٹی کی شادی بڑے اہتمام سے کی۔ خلیفہ صاحب
جس طرح زندگی کے ہر میدان میں سرفراز و مطمئن رہے۔ اسی طرح ازدواجی زندگی بھی کامیابی اور
اطمینان سے بسر کی۔

باب دوم

شخصیت و کردار

خلیفہ صاحب کی عادات و معمولات

خلیفہ صاحب کے اوقات صبح کا ہی معمول یہ تھے۔ علی الصبح اٹھ کر پانچ میل چلنا پھر تھوڑی دیر ستانا سے فارغ ہو کر مطالعہ کرنا۔ آٹھ بجے کے قریب ناشتہ کرکے اخبار پڑھنا شیو بنانا اور پھر مطالعہ میں مصروف ہو جانا۔ حیدرآباد میں تھے تو گیارہ بجے یونیورسٹی پہنچ کر دو ڈیڑھ بجے واپس آجاتے لیکن لاہور میں جب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائرکٹر کے فرائض سنبھالے تو دس بجے تک پہنچ جاتے تو پھر سے ڈھائی بجے واپس آتے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کے بھی عادی تھے۔

قیلولہ کی عادت اس قدر مستقل تھی کہ اس دوران میں اگر کوئی ان سے ملنے آجاتا تو انکار کر دیتے۔ انور اقبال قریشی صاحب لکھتے ہیں۔

"(عثمانیہ) یونیورسٹی میں جب کبھی تیسرے پہر کوئی میٹنگ کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو میری اور خلیفہ صاحب کی رائے ہمیشہ اس کے خلاف ہوتی اور ہمیں کامیابی اس لیے ہو جاتی کہ ہم صاف کہہ دیتے کہ اس صورت میں ہم شرکت سے معذور ہیں۔ جب خلیفہ صاحب کو شروع شروع میں میری اس عادت کا پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ میاں بس اب ہماری دوستی پکی ہو گئی۔ تم بہت سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جو شخص دوپہر میں آرام نہیں کرتا وہ اپنی زندگی سے دشمنی کرتا ہے۔"

پروفیسر ہارون خاں شروانی لکھتے ہیں۔

لہ مقالہ از ڈاکٹر انور اقبال قریشی ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۸۰-۸۱

"دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے ان کا دوپہر کا قیلولہ ناغہ نہ ہوتا تھا"۔[1]

سہ پہر کو سو کر اٹھنے کے بعد چائے پینا بھی آپ کا روزانہ کا معمول تھا۔ بیگم خلیفہ عبدالحکیم لکھتی ہیں:

"شام کو اکثر و بیشتر وقت گھر پر ہی گزارتے تھے اور محوِ مطالعہ رہتے۔ کہتے تھے "خیر الجلیس فی الزمان کتاب" دنیا میں کتاب سے بہتر رفیق کوئی دوسرا نہیں۔"[2]

آپ کی زندگی کا یہ معمول آپ کے قیام لاہور کے دنوں میں دیکھنے میں آتا تھا لیکن حیدرآباد میں آپ شام کو اکثر یونیورسٹی کلب جایا کرتے تھے۔ پیدل چلنے کے زیادہ شوقین نہ تھے۔ البتہ تھوڑا سا ٹہلنا پسند ضرور کرتے تھے۔ کلب سے واپس آ کر کھانا کھاتے۔ کچھ دیر باتیں ہوتیں، بچوں سے گپ شپ ہوتی اور ان کی تعلیم کے بارے میں معلومات حاصل کرتے پھر پڑھنے بیٹھ جاتے اور رات کے بارہ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔

شادی سے پہلے آپ ہارون خاں شروانی اور وحید الرحمن کے ساتھ رہتے تھے۔ اس مکان کے عقب میں خانہ باغ تھا۔

"خلیفہ صاحب جامعہ کے اوقات سے علاوہ اپنا بیشتر وقت باغ میں بسر کرتے۔ ہمیشہ ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی، یا کاغذ پنسل جس پہ کہ کسی شعر کے نئے مصرعے موزوں ہوتے تو (یہ اشیاء) کمرے سے لانا نہ بھولتے"۔[3]

کام کرنے کا طریقہ

خلیفہ صاحب لکھنے پڑھنے کے کام سے اکتاتے نہیں تھے۔ اگر کبھی کام آ جاتا ہوتا تو اسے بارِ خاطر سمجھتے۔ بعض لوگ ان کے اس فعل کو کاہلی پہ محمول کرتے۔ مگر یہ بات ہرگز نہ تھی

---

[1] مقالہ از پروفیسر ہارون خان شروانی "الثقافت" ج ۸ ش ۶-۷ جون-جولائی ۱۹۶۰ء ص ۷۲

[2] مقالہ از بیگم عبدالحکیم "صحیفہ" تیسرا سال پہلا شمارہ ص ۲۹۱ نیز انٹرویو بیگم صاحبہ

[3] مقالہ از پروفیسر ہارون خاں شروانی "ثقافت" ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۷۲

ان کی قوتِ کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ جو کام وہ معمولی مدت میں کر سکتے تھے۔ دوسرا شاید ہی اسے برسوں میں انجام دے پاتا۔ صبح تصنیف و تالیف کا کام شروع ہوتا تو دوپہر کے ڈیڑھ بج جاتے۔ درمیان میں پندرہ یا بیس منٹ توقف کرتے اور کافی پی کر پھر کام میں مصروف ہو جاتے۔ شام کے وقت ایسی کتابیں مطالعہ کرتے جس سے محض ذہنی تفریح مقصود ہوتی۔

گرمیاں کبھی گرم مقامات پر نہ گزارتے۔ گرمی کی شدت ان کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے کام میں خلل انداز ہوتی تھی۔ گرمیوں میں ہمیشہ پہاڑ پر جاتے۔ دو چار ماہ یا جتنا عرصہ وہ پہاڑ پر رہتے۔ شاداں و شگفتہ رہتے اور کہتے کہ دفتر کے اوقات کی طرح یہاں فضول فون کی گھنٹی نہیں بجتی اور ہر پندرہ منٹ بعد کوئی ملنے والا نہیں آتا۔ اطمینان سے بیٹھ کر سوچ سکتا ہوں اور لکھ سکتا ہوں۔

گھر میں بھی اپنے لیے ایک گوشۂ تنہائی بنا لیا کرتے تھے۔ جہاں وہ بقیہ اوقات میں مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے آرام بھی وہیں کرتے۔ شور و غل اور نوکروں کے جھگڑوں سے کوسوں دور رہتے تھے۔ دماغی کام کے پیشِ نظر ان کے لیے ایک پرسکون ماحول ضروری تھا۔ اس لیے گھر میں سب کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ کسی قسم کا شور و غل ان کے لیے انتشارِ طبع کا باعث نہ بنے۔

آپ کے تصنیف و تالیف کے طریقِ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں۔

"وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ پہلے کتاب کے لیے مواد جمع کیا جائے اور پھر باقاعدہ مصنفانہ سلیقہ اور ہنر مندی سے ابواب و فصول میں پھیلایا جائے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی موضوع بھا جاتا اور اس پر طبع آزمائی کرنا چاہتے تو چند دن اس پر غور کرتے دو چار عمدہ کتابیں پڑھتے اور اس کے بعد ذہن و فکر کے اُن محفوظ ذخائر سے کام لیتے جن کو پہلے سے انھوں نے جمع کر رکھا تھا اور پھر لکھنا شروع کر دیتے۔"[۱]

۱۔ مقالہ از محمد حنیف ندوی صحیفہ، تیسرا سالنامہ، جون، جولائی، اگست ص ۳۲۴۔

خلیفہ صاحب کی کتب بینی

انور اقبال قریشی صاحب خلیفہ صاحب کے ذوقِ مطالعہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ خلیفہ صاحب سے ملاقات سے پہلے مجھے یہ زعم تھا کہ میں بہت پڑھنے والوں میں سے ہوں کیونکہ اوسطاً سو صفحے روز پڑھتا تھا۔ لیکن میرا مطالعہ زیادہ تر معاشیات تک ہی محدود تھا۔ خلیفہ صاحب کا دستور تھا کہ وہ ناشتے سے فارغ ہونے تک اپنے کمرے میں مطالعہ کرتے، ناشتے کے بعد باغ میں درخت کے نیچے آرام کرسی پر بیٹھ جاتے اور ساڑھے دس بجے تک پڑھتے۔ یونیورسٹی چلے جاتے اور پھر دوپہر آرام کرنے کے بعد اسی کرسی پر ڈٹ جاتے اور مغرب سے ذرا پہلے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پھر کلب چلے جاتے واپس آکر کچھ دیر گھر میں گپ شپ رہتی۔ پھر رات بارہ بجے تک مطالعہ جاری رہتا۔ اتوار یا دوسری تعطیلات میں زیادہ وقت باغ میں آرام کرسی پر پڑھنے میں گزارتے . . . بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن سال کے تین سو پینسٹھ دنوں تک اس عمل کو جاری رکھنا یقیناً بہت بڑی بات ہے۔[1]

سگریٹ نوشی

خلیفہ صاحب سگریٹ پیتے تھے حالانکہ وہ اسے ایک علت بھی سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ خلیفہ صاحب مولانا محمد جعفر پھلواری کو سگریٹ پیش کرنے لگے تو یہ الفاظ زبان سے نکلے:

"دیو ہے تو لعنت ہی کی مگر ابھی تک میں نے اسے ترک نہیں کیا"[2]

آپ ہمیشہ قینچی کا سگریٹ پیتے تھے اور یہی سگریٹ دوسروں کو بلا تامل پیش کرتے تھے۔ عبدالسلام خورشید نے بھی اقبال ریویو میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ایک دفعہ میں ان سے ملنے گیا تو میں نے سگریٹ نہ پیا۔ کیونکہ میں قینچی کا سگریٹ پیتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ یہ اسٹیٹ ایکسپریس کے سگریٹ پیتے ہوں گے اور یہ پیش کرنا زیادتی

---

۱ مقالہ از انور اقبال قریشی ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۵۲

۲ مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ، ج ۳ ش ۱، ص ۳۳۱

ہوگئی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ انھوں نے تمبیچی کی ڈبیا نکالی اور سگریٹ سلگا کر پینے لگے
بعد میں معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب مستقل اسی سگریٹ کے عادی ہیں۔[1]

شکل و صورت، لباس، غذا اور صحت

قاضی ایم اسلم لکھتے ہیں۔

"خلیفہ صاحب خوش لباس، خوش شکل اور گورے چٹے نوجوان تھے"[2]

انور اقبال قریشی کہتے ہیں۔

"عبدالحکیم صاحب ایک خوش رو، خوش وضع، سرخ و سپید تنومند، جامہ زیب اور نہایت خوش مزاج اور مخلص انسان تھے"[3]

ڈاکٹر نگینہ کاظمی خلیفہ صاحب کے بارے میں ان الفاظ کا اظہار کرتی ہیں۔

"میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی اور چہرے بشرے سے وقار ٹپکتا اور اس کی شخصیت کچھ ایسی اثر آفریں تھی کہ ہر ایک اس کی تعظیم اور پیشوائی کے لئے سروقد کھڑے ہوگئے اور ان کے لیے ایک نشست خالی کی"[4]

محمد وارث فرماتے ہیں۔

"اچھے خاصے جسم و ضخامت کے مالک اور ان کے بشرے سے شگفتگی ٹپکتی تھی"[5]

یا روان خان شیروانی صاحب ثقافت میں لکھتے ہیں۔

بہت سے فلسفی نوجوان شعراء کی طرح خلیفہ صاحب کے مزاج میں لاابالی پن تھا۔ مگر کپڑے وہ بہت نفیس پہنتے۔ تازہ ولایت پاس قسم کے لوگوں کی طرح پتلون کی شکن،

---

[1] مقالہ از عبدالسلام خورشید ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۲۵

[2] مقالہ از قاضی ایم اسلم اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱

نزد نگینہ [3] مقالہ از انور اقبال قریشی ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ج ۸ ش ۶-۷ ص ۸۰

[4] مقالہ از ڈاکٹر نگینہ کاظمی ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ج ۸ ش ۶-۷ ص ۸۹

[5] مقالہ از محمد وارث کامل ایضاً ص ۱۲۶

ٹائی اور کالر کا ہمیشہ خیال رکھتے۔[1]

ممتاز حسن صاحب کا کہنا ہے

”آپ صحت مند، خوش شکل اور خوش لباس تھے۔“

”گرمی میں پاجامہ قمیض پہنا کرتے تھے اور سردیوں میں کشمیری دُھسا اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ تقریبات میں شریک ہوتے تو قراقلی ٹوپی اور شیروانی پہنا کرتے تھے۔ ویسے عام طور پر کوٹ پتلون پہنتے اور گرمیوں میں زیادہ تر ململ کا کرتا اور پاجامہ پہنتے تھے۔“[2]

غذا

میٹھی اشیا کے بہت شوقین تھے۔ اس لیے کھانے کے بعد میٹھی ڈش ضروری ہوتی۔ ویسے کہنے کو تو کہتے کہ سادہ غذا پسند کرتا ہوں مگر فی الواقع لذیذ چیزوں اور کھانوں کے شوقین تھے۔ دہی اور لسّی سے بہت رغبت تھی۔ کہا کرتے۔

یاد اپنا ہے جو لسّی
عمر [illegible] ہے [illegible]

آپ کے دوست شمس الدین صاحب کا کہنا ہے کہ ”کھانے میں [illegible] اور پھل بھی پسند کرتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد اگر کوئی پوچھتا کہ آپ نے کیا کھایا ہے تو کہتے کہ ابا معلوم نہیں کیا کھایا ہے۔“[3]

آپ کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اگرچہ کہتے تھے کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوا مگر حقیقت یہ ہے کہ چونکہ آپ پرہیز نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ اس بات کو حقیقت پر [illegible] سمجھتے تھے کہ کھانے کے معاملے میں ان پر پرہیز کی پابندی نہ عائد کی جائے۔ اس لیے بیمار بھی ہوتے تو تسلیم نہ کرتے اور کہہ دیتے کہ میں بیمار نہیں ہوں۔

---

[1] مقالہ از پروفیسر ہارون خان شروانی ایضاً ص ۲۷

[2] انٹرویو محمد حنیف ندوی، شاہ حسین رزاقی و مقالہ از ممتاز حسن

[3] انٹرویو شمس الدین صاحب

خواہ گرمی کا موسم ہو یا سردی کے دن آپ دن میں تین چار مرتبہ منہ اور سر پر ٹھنڈا پانی ڈالتے۔ شاید اس لیے کہ آپ بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ وفات سے کافی عرصہ پہلے ایک بار جب طبی معائنہ کرایا تو ہائی بلڈ پریشر کا مرض تشخیص کیا گیا۔ سب نے علاج کے لیے زور دیا تو آپ نے کہا کہ میری صحت اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہے۔ پھر کہنے لگے فطرت نے کچھ اصول مقرر کر دیے ہیں۔ ہڈی جب ٹوٹ کر جڑتی ہے تو پہلے کی نسبت اچھی طرح جڑتی ہے۔ جسم میں مدافعت کی طاقت ہونی چاہیے، یہ کیا کہ محض دوا پر انحصار کر لیا جائے۔ میں بھی فطرت کے اصول پر خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی کسی مرض شدید سے دو چار نہ ہوئے۔ بس وفات کے وقت جو دل پر دورہ پڑا تو یہ مرض الموت ثابت ہوا۔ چونکہ یہ ان کا پہلا تجربہ تھا لہٰذا بے اختیار زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔۔

"OH MY HEART, THIS HAS NEVER HAPPENED BEFORE"

کردار کے مختلف پہلو

اخلاق

انتہا درجے کی ذہانت اور علمیت کے باوصف اخلاقِ حمیدہ کی فراوانی سے بھی اللہ نے انھیں نواز رکھا تھا۔ وہ ایک شفیق باپ، بااخلاق بھائی، ہمدرد دوست، باوفا شوہر اور رحم دل آقا تھے۔

طبیعت میں انکسار کا مادہ تھا اور تواضع میں یوں دکھائی دیتے تھے جیسے اثمار سے لدا ہوا درخت نیچے جھک جاتا ہے۔ جس بات کو سچ سمجھا اسے ناسازگار حالات کے باوجود کر گزرے۔ علامہ اقبال نے انہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا۔ "نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو"

کیا بوڑھا، کیا بچہ، کیا امیر کیا غریب۔ کیا ہم وطن یا پردیسی۔ کیا اپنا کیا پرایا، شاید ہی کوئی ایسا تھا جو ان کی خوش اخلاقی سے متاثر نہ ہوتا ہو۔ آپ بردبار، متحمل مزاج اور رحم دل واقع ہوئے تھے۔ طبیعت میں انتہا درجے کی سادگی تھی۔ کوئی کسی کی برائی کرتا

تو اس کی بات پر کان نہ دھرتے۔ شاید یہی وجہ تھی جو ہر طبقے میں ہر دلعزیز تھے سخت سے سخت بات کو اس طرح کہہ جاتے کہ محسوس ہی نہ ہوتا۔ جھگڑوں سے کوسوں دور بھاگتے۔ اگر کبھی نقصان ہو بھی رہا ہوتا تو درگزر کرتے۔ اپنے دوستوں سے خلوص اور خندہ پیشانی سے پیش آتے جس طرح پہلے دن کسی سے ملتے، آخری دم تک اسی روش پر گامزن رہتے۔

خلیفہ صاحب جس محلے میں رہتے لوگ ان کی آزاد خیالی پر نکتہ چینی کرتے مثال کے طور پر بیگم خلیفہ جب بغیر پردے کے باہر نکلتیں تو لوگ بہت باتیں کرتے اس پر آپ کہا کرتے۔ کوئی بات نہیں ہم جتنے آگے ہیں یہ لوگ اتنے ہی پیچھے ہیں۔

ذہانت و فطانت

خلیفہ صاحب کی ہر بات میں ان کی غیر معمولی ذہانت کا پتہ چلتا تھا۔ جس طرح بڑے لمبے میں وہ بات سے بات نکالتے اس طرح جب علمی اور فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کرتے تو معنی آفرینی کی عجیب عجیب صورتیں نظر آتیں۔ گویا بقول حالی۔

> اس کی توجیہہ سے پکڑتی تھی
>
> شکل امکاں محال کی صورت

جو بات کہتے اس میں ذاتی اپج اور اجتہاد کا رنگ ہوتا فلسفہ اور ادب کے ہر دقیق مسئلے پر اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے۔ مسائل کی تہہ تک پہنچتے اور بہت سی ایسی قیمتی باتوں کی نشان دہی بھی کر جاتے جن پر عموماً لوگوں کی نظر نہیں پڑتی۔ فلسفہ اسلام پر تحقیق کے سلسلے میں عربی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں

"اتنی جلدی عربی پر عبور حاصل کر لیا کہ شاید کوئی دوسرا ہندوستانی ایسا نہ کر سکتا تھوڑے ہی عرصے میں عربی میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ بلا تکلف عربی کتابیں پڑھ بھی لیتے اور سمجھ بھی لیتے۔"[1]

---

[1] مقالہ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ثقافت، جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۷۸

کسی تو کسی محفل میں کسی بھی مسئلے پر گفتگو ہو آپ اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتے کہ شگفتہ و لامتناہی مہو ہے بغیر نہ رہتا۔

خلیفہ صاحب کی ذہانت اور تقریر و تحریر کی قدرت خداداد تھی۔ پاکستان فلاسوفیکل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی تو ۱۹۵۴ء میں پہلا سیشن منعقد ہونا قرار پایا۔ گویا اللہ وردی کو ایک میزبانی شہر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس میں ممتاز الدین اور مسٹر اللہ بخش بروہی کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ مگر چند وجوہ کی بنا پر وہ نہ آ سکے۔ ان حالات میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس سیشن کی صدارت کے فرائض بھی ایک ایسا شخص سرانجام دے جو دانشوروں میں ممتاز ہو۔ وقت بہت کم تھا بالآخر فیصلہ ہوا کہ خلیفہ عبدالحکیم کو بلایا جائے۔ قاضی ایم اسلم کہتے ہیں:۔

"خیال نہ تھا کہ آپ اس قلیل مدت میں اپنا خطبہ صدارت لکھ لیں گے۔ مگر آپ نے . . . قلیل وقت میں لکھ دیا۔"[1]

اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ خلیفہ صاحب نہ صرف قابل اور ذہین لیکچرار تھے بلکہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھائے گئے معیاری پروفیسروں میں دوسرے نمبر پر تھے اردو کے علاوہ آپ انگریزی میں بھی بلا تکلف تقریر کر سکتے تھے۔ برٹش تاج کے جلسے میں آپ نے نہایت اعلیٰ تقریر کی۔ پروفیسر ولیم نے جس کی بہت تعریف کی۔

آپ کی علمی قابلیت کا شہرہ نہ صرف پاکستان میں تھا بلکہ امریکہ اور دیگر ممالک کے اہل علم حضرات آپ سے بخوبی واقف تھے۔ اپنی علمی بصیرت کی بنا پر آپ باہر کے ملکوں میں بلائے جاتے۔ آپ اہل مغرب کے سامنے مذہب اسلام کو اس طرح پیش کرتے کہ وہ دل سے اس مذہب کے قائل ہو جاتے۔ بسا اوقات وہ لوگ کہہ دیتے کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ اسلام ایسا عظیم مذہب ہے۔

محمد جعفر پھلواروی اپنے ایک مقالے میں خلیفہ صاحب کی ذہانت و قابلیت،

---

[1] مقالہ از قاضی ایم۔ اسلم، اقبال ریویو ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۶

کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جب آپ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ڈائرکٹر تھے تو روزانہ کام سے فارغ ہو کر ہم اکٹھے بیٹھتے۔ یہ گھنٹے دو گھنٹے کی عجیب صحبت ہوتی تھی جس میں کوئی موضوع چھیڑ جاتا سب اپنی اپنی رائے دیتے۔ جب خلیفہ صاحب بات کرتے تو یہ نظر آتا کہ ایک ہمہ جہت انسان گفتگو کر رہا ہے۔ گہرائی، ظرافت، ادب، اشعار، مصرعے، حکمت، فلسفہ، حکمت، تاریخ، سائنس۔ انگریزی، اردو، عربی، پنجابی، فارسی، جرمن، کشمیری زبانوں کے حوالے، غرضیکہ کیا کچھ نہ ہوتا۔ سقراط۔ گوئٹے، جیوڈ، آئن سٹائن اور اقبال کا کلام، نظریات و تصورات ان کی نوک زبان پر رکھے ہوتے۔ قدیم و جدید قابل ذکر شعرا اور ادبا میں کوئی ایسا نہ تھا جس کا منتخب کلام مخصوص یاد نہ ہو۔ آیات قرآنی یا احادیث کی تشریح کرتے تو ہم محو حیرت ہو جاتے۔ فقہی مسائل پر رائے دیتے تو نہ صرف قانونیت بلکہ حکمت و فن سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور ان کے مطابق عصری تقاضوں کو ایک ساتھ پیش نظر رکھتے۔"[1]

علمی تبحر

جو لوگ خلیفہ صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیا کرتے ہیں کہ خلیفہ صاحب کی علمیت کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہرگز نہیں لگایا جا سکتا۔ علم و فضل کا یہ دلی کتاب کے تعین میں مقید نہیں ہو سکتا۔ معمولی معمولی مسائل پر ان کی گفتگو علم کے دریا بہاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ نرم سیر دریا کی تہہ میں سمندروں کی طغیانی پوشیدہ ہے۔ ذوق سلیم رکھنے والے اہل علم حضرات ان کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔

لوگ ہر طرح کے مسائل آپ کے پاس لے کر آتے۔ کچھ تو خدا تک کے منکر ہوتے تھے مگر آپ کی شیریں کلامی، تدبر اور علم کی گہرائی مسئلہ کو عجیب رنگ دیتی ہے اور سوال کرنے

---

[1] مقالہ از محمد جعفر پھلواری، صحیفہ، تیسرا سال ش، انجمن، جولائی، اگست ص ۳۴۲-۳۴۳

والا بالآخر مطمئن ہو جاتا ۔ آپ کو فارسی اور اُردو ادب سے خاص شغف تھا۔ ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ اکثر خالص فلسفیانہ اور مذہبی مباحث کے دوران ان اشعار کو اس طرح بطورِ مثال پیش کرتے کہ تمام مسئلہ واضح ہو جاتا۔

فلسفے کے محقق ہونے کے علاوہ آپ کو ادبِ عالیہ کا بھی ذوق تھا۔ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادب پر وسیع نظر رکھتے تھے۔ فرانسیسی ادیبوں کے متعلق گفتگو ہوتی تو ان کی ادبی تخلیقات کے بارے میں ایسی رائے دیتے جو متوازن اور صائب ہوتی۔ اور بقول خواجہ بدر .....

"علمی زندگی آپ کی طبیعت کو کچھ ایسی راس آگئی تھی کہ پاکستان آنے کے بعد انھیں کئی بار سفارت اور وزارت کے عہدے پیش کیے گئے۔ لیکن انھوں نے ظاہری شان و شوکت اور نام و نمود کے مقابلے میں علمی زندگی کی گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کو ہمیشہ ترجیح دی"[1]

فارسی اور اُردو شاعری سے ذوق طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا۔ چنانچہ بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اسی دور میں انھوں نے خود شاعری شروع کی فیضی کے فارسی ترجمے کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کیا جس کے برجستہ اشعار ان کے ذہن پر ثبت ہو گئے تھے۔

انسان دوستی

آپ کی زندگی کے ہر پہلو میں یہ چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ لوگوں کے ذہنی انتشار اور الجھنوں پر بہت ہی حساس ہوتے۔ وہ اس ماحول سے مایوس ہونے کے بجائے اس کو بدل دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنوں اور غیروں سے بالکل انسانی سطح پر ملتے تھے۔ ان کے اندازِ گفتگو اور رویے میں غریب اور امیر، عالم اور عامی کے درمیان کبھی تفرقہ نہ ہوتی۔ انھوں نے ہر شخص سے بطورِ انسان سلوک کیا۔

ان کی زندگی کے کچھ خاص اصول تھے نہ صرف گھر والوں بلکہ دوست احباب سے

---

[1] مقالہ از خواجہ بدر، اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۹۔

بھی بہت اچھی طرح پیش آتے اور جب تک کوئی نااہل ثابت نہ ہو جاتا اس کی عزت کرتے اور اس کے نقطہ نظر کی تعریف کرتے۔

آپ کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز تھا۔ وہ دوستوں کا بہت خیال رکھتے۔ عبدالرحمٰن چغتائی کہتے ہیں۔ ہمارے اہل محلہ تنگ نظر، حاسد اور ہر کسی پہ جا و بیجا تنقید کر دیا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ میرے فن سے خلیفہ صاحب کو خاص لگاؤ تھا اور ویسے بھی دوستوں کے بہی خواہ تھے اس لیے مجھ سے پوچھا۔

"چغتائی تم تو ان ذہنی بیماریوں میں مبتلا نہیں ہو؟ میں نے کہا میں تو ایسا محسوس نہیں کرتا۔" تو خلیفہ صاحب کہنے لگے ٹھیک ہے۔ ابھی تم نے بہت شاندار کام انجام دینے ہیں جن کا تمھیں علم نہیں ہے۔"[1]

اگر خاندان کے کسی فرد یا دوست یا ملنے والے کو کوئی نزاعی مسئلہ پیش آتا جسے وہ سلجھا نہ سکتا تو خلیفہ صاحب کے پاس چلا آتا۔ وہ اسے صلح جوئی کی ترغیب دیتے۔ طرفین کی بات سن کر ایسا طریقہ وضع کر دیتے جو بالآخر صلح صفائی پر جا کر ختم ہوتا۔ اپنی رائے تو اس خوش اسلوبی سے واضح کرتے کہ سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔ جو شخص کسی کی بات نہ مانتا۔ وہ بھی ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ آپ کا دل صاف اور خلوص سے لبریز تھا۔ آپ جس سے ملتے وہ آپ کو اپنا سچا ہمدرد تصور کرتا۔

لوگ خلیفہ صاحب کی سخت اور کڑوی بات بھی برداشت کر لیتے۔ حالانکہ وہی بات کوئی اور شخص کہتا تو لوگ مارے غصے کے آپے سے باہر ہو جاتے۔ اپنے کسی دوست کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ ایک بار ندوہ کے رہنے والے ایک صاحب آپ سے ملے وہ بھی سرسری طور پر۔ اتفاق سے وہ ہندوستان چلے گئے۔ واپسی میں مشکلات پیش آئیں تو انھوں نے لکھا براہِ کرم میرے لیے ایک صد روپیہ بھیج دیجیے۔ خلیفہ صاحب نے خط پڑھا تو بغیر کسی تامل کے روپیہ ان کے پتے پر بھجوا دیا۔

---

[1] مقالہ از عبدالرحمٰن چغتائی، ثقافت جون، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۴۶

اپنے دوستوں سے بہت بے تکلف تھے۔ ان کے قریبی دوست جیسے شیخ مبارک علی، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد شفیع، میاں شمس الدین، عبدالمجید ملک، ممتاز حسن، ڈاکٹر محمد باقر اور عرفانی صاحب کا کہنا ہے کہ آپ اتنے پیارے اور مخلص دوست تھے کہ ان پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے دوست بھی ان کی طرح بے تکلف ہوں۔ یہ حضرات ان سے مل کر ایک طرح کا سکون محسوس کرتے۔ جعفر پھلواری صاحب کا کہنا ہے

"آپ کی صحبت میں کبھی کوئی تلخی پیدا نہ ہوتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ جو فکرمندیاں ہم باہر سے اپنے دماغوں میں لے کر آتے، وہ مرحوم کی چند منٹ کی صحبت میں دو ایک لطیفوں ہی میں ہٹ جاتیں اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا تھا۔"[1]

خلیفہ صاحب کے دوست آپ سے انتہائی درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ عبدالمجید ملک صاحب نے انٹرویو کے دوران کہا۔

"۱۹۵۰ء میں میری بیوی کا انتقال ہوا تو خلیفہ صاحب نے ایک اچھے دوست کی مانند میری دلجوئی کی۔ مجھے ان پر بجا طور پر فخر تھا۔"[2]

اسی طرح محمود احمد خان صاحب نے کہا خلیفہ صاحب کا یادگار دن منایا جا رہا تھا میں اس قابل نہ تھا کہ وہاں تک پہنچ جاتا لیکن خلیفہ صاحب کی دوستی جب یاد آئی تو وہ کشش مجھے کھینچ لے گئی۔

دوستی کے لیے آپ عمر کے اختلاف کے قائل نہ تھے۔ خلیفہ صاحب عبدالسلام صاحب کے باپ کے دوست تھے، مگر عبدالسلام صاحب بھی خلیفہ صاحب کو اپنا دوست تصور کرتے تھے۔ سلیم واحد سلیم جو خلیفہ صاحب کے بھتیجے ہیں خلیفہ صاحب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بحیثیت انسان خلیفہ صاحب ہمارے خاندان میں سب سے بہتر تھے۔ اگرچہ وہ اچھے

۱۔ مقالہ از محمد جعفر پھلواری [illegible] سال ش، جون، جولائی، اگست ص ۲۳۴

۲۔ انٹرویو عبدالمجید ملک صاحب

انسان نہ تھے۔ مگر وہ ایک اچھا انسان بننے کی کوشش ضرور کرتے اور اس میں بہت حد تک کامیاب ہوتے تھے [1]۔

عجز و انکسار

خلیفہ صاحب کی زندگی میں سادگی، عجز و انکسار بہت نمایاں تھا۔ نہ تو کسی پر علمیت کا رعب جمانے تھے اور نہ ہی اپنے آپ کو بہت بڑا عالم فاضل کہتے تھے۔ ایک دفعہ دفتر کے کچھ ملازم کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ اچانک خلیفہ صاحب آ گئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا میں خلیفہ صاحب سے اس کا ذکر کرتا ہوں۔ دوسرے نے بے پروائی اور غصے میں کہہ دیا مجھے کیا پرواہ ہے خلیفہ صاحب کو کسی بات کا علم نہ ہو۔ کچھ دیر بعد ایک نے آ کر کہا فلاں شخص نے آپ کے متعلق گستاخی کی ہے فرمانے لگے "میں کیا میری بساط کیا اور بلھے شاہؒ کا ایک پنجابی مصرعہ پڑھا۔

بلھیا تو ہیوں کجھ سیتہ

یعنی اے بلھا شاہ تیری حقیقت تو ویسی ہے جیسے چٹائی کا ایک تنکا، جو مسجد میں نمازی انسانوں کے پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر تمام جھگڑا ختم کر دیا [2]۔

نرم مزاجی و رحم دلی

حسن ظن اور نرم مزاجی کا قدرتی نتیجہ چشم پوشی اور عفو و درگزر بھی ہوتا ہے خلیفہ صاحب سے کئی مرتبہ شکایت کی جاتی کہ بعض ملازمین ادارے کے درختوں سے لکڑی کاٹ کر لے جاتے ہیں جس پر وہ بظاہر تو ملازمین کو ڈانٹ دیتے۔ مگر ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتے اور کہا کرتے:

"ان کی تنخواہ زیادہ نہیں۔ اس لیے اگر معمولی چیز یوں لے جا کر اپنی ضرورتیں پوری کر لیتے ہیں تو مجبوری ہیں۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا عفو کے خلاف ہے۔ پھر کہنے عدل کے لیے خدشہ

---

[1] مقالہ از سلیم واحد سلیم ادبی دنیا ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء

[2] مقالہ از خواجہ بدر، اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۶ء ج ۹ ش ۴ ص ۲۴

نبویؐ میں آیا ہے کہ عفو میں غلطی کرنا دارو گیر میں غلطی کرنے سے بہتر ہے۔[1]

آپ کا دل اس قدر نرم تھا کہ کسی کا دل توڑنا ان کے مسلک میں نہ تھا آپ کے بہنوئی سناتے تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹری میں ایک مریض ان کے پاس آیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کے مرض کے بارے میں صاف صاف بتا دیا۔ مریض بہت مایوس ہوا۔ خلیفہ صاحب نے یہ معاملہ دیکھا تو فوراً ان سے کہنے لگے آپ نے غلط کہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا میں نے سچ بولا ہے۔ آپ نے کہا کسی کا دل رکھنا بھی تو ایمان ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب کی بھتیجی اختر باجی آگئیں۔ ان سے اس معاملے میں پوچھا گیا تو وہ بولیں آپ ہی تو کہا کرتے ہیں۔

"راستی موجب رضائے خدا است"

آپ یہ سُن کر خاموش ہو گئے لیکن مریض کی مایوسی سے آپ کو بہت دکھ ہوا۔

قناعت پسندی

خدا پر انہیں کامل بھروسہ اور اعتماد تھا۔ زندگی کا بڑے سے بڑا نقصان بھی ان کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکتا تھا۔ کشمیر میں شوق اور ارمان سے بنائے ہوئے بنگلے میں رہنا نصیب نہ ہوا تقسیم ملک کی وجہ سے حیدرآباد کی سروس کی پنشن نہ ملی۔ مگر انھوں نے ہمیشہ زندگی کا روشن پہلو دیکھا اور امید کو یاس پر غالب رکھنا ایمان کا تقاضا سمجھا۔ جو کچھ خدا نے دیا تہہ دل سے اس کا شکر ادا کیا۔ کہتے تھے زندگی کی بنیادی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں صحت، علم، عزت سب کچھ اللہ کا دیا موجود ہے۔

اس قناعت پسندی نے ہی دنیوی جاہ و جلال، عہدے اور کرسی کی خواہش کو ان سے دُور رکھا۔ آپ نے بار بار وائس چانسلری کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ اس میں آپ کو مالی نقصان بھی تھا۔ آپ اپنے کام کو قوم اور اسلام کے لیے اہم سمجھتے تھے۔

---

[1] مقالہ محمد جعفر پھلواری، صحیفہ تیسرا سال، ش ۱، جولائی، اگست ص ۳۸
نیز انٹرویو شاہد حسین رزاقی، حنیف ندوی۔

اپنے افکارِ علمیہ سے دراصل آپ قوم کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔ دل میں حصولِ زر کا مطلقاً خیال نہ تھا۔ چنانچہ اسی قناعت پسندی نے آپ کو ایک عدیم المثال مردِ درویش بنا دیا تھا۔ جو دنیاوی جاہ و جلال سے بے پرواہ تھے۔

"آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ایک عہدۂ جلیلہ کی پیشکش ہوئی تو آپ نے انکار کر دیا کیونکہ پاکستان رہ کر آپ اپنی قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔"[1]

احساسِ تلافی

آپ کی انتہائی کوشش ہوتی کہ ان کی طرف سے کسی کی دل آزاری نہ ہو اور کبھی ایسا ہوتا بھی تھا جیسا کہ انہیں کڑوی بات بھی لطیف انداز میں کہنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ بعض اوقات مناظرے میں بھی دیکھا گیا کہ مخالف کی دل آزاری قطعاً نہیں ہوتی۔ لیکن مرحوم کو خیال پیدا ہو گیا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو سوچ کر طرح طرح سے اس کی تلافی کرتے رہتے تاآنکہ انہیں یقین ہو جاتا کہ اس کی تلافی ہو گئی ہے اور اب اس کے دل میں خلش باقی نہیں ہے۔ ان کا یہی جذبہ تلافی زندگی کے مختلف گوشوں میں کارفرما رہتا۔ جب ان کی بیٹی رقیہ کا نکاح ہوا تو خلیفہ صاحب نے جعفر پھلواروی صاحب سے نکاح پڑھنے کی فرمائش کی اور ساتھ ہی انہیں کہا کہ وہ حقوقِ زوجین پر روشنی ڈالیں۔ اس محفل میں شہر کے معززین اور گورنر صاحب بھی شریک تھے۔ جعفر صاحب نے موقع پا کر کثیر اخراجات پر ناگواری کا اظہار کیا۔ تو خلیفہ صاحب نے کہا اس کا مجھے خود احساس ہے لیکن ان عزیزوں اور دوست احباب سے کون جھگڑا کرے۔ اس بیجا اسراف کی تلافی کے لیے ایک ہزار روپیہ کارِ خیر کے لیے الگ کر دیا ہے۔ یہ رقم صرف ان لوگوں کو دی جائے گی جو شادی بیاہ کے اخراجات کے متحمل نہ ہو سکتے ہوں۔"[2]

اندازِ گفتگو

آپ کے اندازِ گفتگو میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ آپ سے ملنے والا کوئی بھی شخص

---

[1] مقالہ از بشیر احمد ڈار صحیفہ نمبر سالِ ش، اجون، جولائی، اگست، ص ۳۱۲

[2] مقالہ از محمد جعفر پھلواروی صحیفہ نمبر سال ش، جون، جولائی، اگست ص ۳۴۲

ان سے اپنے آپ کو دور محسوس نہ کرنا۔ آپ کو بڑا بننے کا خیال تک نہ تھا بلکہ چھوٹوں کو بڑا بنانے کا شوق تھا۔ ان کی گفتگو کا انداز ان کے مسلسل تجربے اور غور و فکر کا نتیجہ تھا جو مختلف مواقع پر مختلف ہوتا تھا۔ اپنے بارے میں ان کا کہنا تھا "میں اپنے مخاطب کو ہمیشہ اپنی سطح پر کھینچ لاتا ہوں۔ اگر اس کی سطح مجھ سے بلند ہو تو میں اسے نیچی سطح پر لے آتا ہوں۔ بعض بڑے آدمی میری اس کوشش کے ساتھ خندہ پیشانی سے تعاون کرتے ہیں لیکن اس عمر میں اب مجھے اکثر ان لوگوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے جن کی ذہنی سطح مجھ سے فروتر ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں بتدریج اپنے آپ کو نیچی سطح پہ لے آتا ہوں اور اس طرح میری گفتگو دوسرے آدمی کے لیے خوش گوار بن جاتی ہے"[1]

آپ کے انداز گفتگو کی دوسری خوبی یہ تھی کہ بات کو اس انداز میں پیش کرتے کہ دوسرا اسے اپنے دل کی بات سمجھنے لگتا اور اس طرح خلیفہ صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ وائس چانسلر میاں افضل حسین کی تعلیمی پالیسی پر طنزیہ کارٹون چھپا جس کی بنیاد ان کے اس بیان پر تھی کہ اعلیٰ تعلیم صرف ذہین طلبا تک محدود رہنی چاہیے۔

آپ نے کہا میرا خیال ہے میاں صاحب کے تعلیمی نظریات صحت مند ہیں لیکن ان کا حال اس باپ کی طرح ہے جس کا ایک جوان بیٹا تھا اور جس کے لیے اس نے رشتے کی کئی جگہ بات کی۔ مگر کہیں سے مایوسی اور کہیں سے پٹائی ہوئی۔ اس نے ایک دوست سے فریاد کی کہ لڑکے والوں کی تو قدر کی جاتی ہے۔ مگر میری پٹائی ہو جاتی ہے حالانکہ لڑکا صاحب جائداد ہے۔ دوست نے پوچھا آپ لڑکی والوں سے کیا کہتے ہیں اس نے کہا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں کہتا ہوں تیری لڑکی بھگا دو۔ میرا لڑکا جوان اور تندرست ہے یہی رسم ہے کہ جوان لڑکے اور لڑکی کے ملاپ سے دنیا قائم ہے اس سیدھی سی بات پر لڑکی کے باپ کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور نوبت گالیوں تک آ جاتی ہے۔ تم ہی بتاؤ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ دوست نے کہا تمہاری نیت کا

---

[1] مقالہ از ڈاکٹر باقر اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۱

قصور نہیں۔ بات کرنے کا ڈھنگ غلط ہے۔ اب اگر جاؤ تو لڑکی کے باپ سے اچھی اچھی باتیں کرو۔ پھر اپنے لڑکے کی تعلیم اور جائداد کا ذکر کرو اور چلے آؤ۔ دوسری ملاقات میں مدعا بیان کرو، اور ادب سے کہو میرے فرزند کو آپ اپنی فرزندی میں لے لیں تو یہ میرے لیے باعث افتخار ہوگا۔ یہ کہہ کر خلیفہ صاحب بولے بس میاں صاحب کو بھی یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے[1]"

طرزِ تخاطب

آپ جب کسی شخص سے گفتگو ہوتے تو فوراً اس کی قابلیت بھانپ لیتے اور زیرِ بحث مسئلہ کو اسی کے معیار سے اٹھاتے اور آہستہ آہستہ عقلی استدلال سے حقیقت کا روشن پہلو اس پر واضح کر دیتے۔ ایک دفعہ جرمنی میں ایک لنچ ہوا۔ آپ کے پاس ایک جرمن لیڈی بیٹھی تھی۔ جب بیرا شراب لایا تو آپ نے اسے پرے ہٹا دیا۔ اس خاتون نے آپ سے پوچھا کہ آپ بیسویں صدی میں بھی اس سے انکار کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ خلیفہ صاحب نے الٹا اس سے پوچھا۔

"آپ چوہا، کتا، بندر، مینڈک، چھپکلی، سانپ اور فلاں فلاں چیز کھاتی ہیں؟" اس نے نفی میں جواب دیا۔ خلیفہ صاحب بولے، "یہ اس قسم کی چیزیں اگر آپ نہیں کھاتیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ کونسا ایسا فرق ہے کہ آپ کو اتنا تعجب ہوتا ہے۔" خلیفہ صاحب نے کہا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو لوگ یہ ساری چیزیں کھاتے ہیں وہ بھی آپ کی طرح صاحب فکر و دماغ ہیں اور ان کو کوئی جسمانی نقصان بھی نہیں ہوتا۔ ہر قوم کی کچھ روایات ہوتی ہیں اور یہ ہماری قومی اور مذہبی روایات ہیں۔ اس نے کہا میں نے اس نقطہ نظر سے کبھی نہ سوچا تھا۔ آئندہ میں یہ اعتراض کسی پر نہ کروں گی[2]"

اسی طرح لندن میں ایک کھانے پر خلیفہ عبدالحکیم اور خلیفہ بشیر الدین محمود قادیانی

---

[1] مقالہ از عبدالسلام خورشید ثقافت جنوری، جولائی ۱۹۶۰ء جلد ۸ شمارہ ۶-۷ ص ۱۲۱-۱۴۴

[2] مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ تیسرا سال پہلا شمارہ ص ۳۴۰۔

کے دوران گفتگو خلیفہ قادیانی صاحب نے مرحوم خلیفہ صاحب سے پوچھا آپ بھی اس کے قائل ہیں کہ اب کوئی نبی نہیں آ سکتا یا نہیں آنا چاہیے۔ مرحوم خلیفہ صاحب نے اتنا جواب دیا۔

"بعض وقت تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کوئی نبی آئے اور اُمت میں انقلاب برپا کرے لیکن بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا جو معیار قائم کر دیا ہے اس کے بعد کوئی گھٹیا قسم کا مدعی نبوت کے لیے آنکھوں میں جچتا نہیں جو اس معیار کے تھے۔ افسوس انھوں نے دعویٰ ہی نہیں کیا۔ اب اگر اس معیار کا انسان آئے تو میں بھی غور کروں گا۔"[۵۴]

ایک بار ایک شخص آپ کے پاس آیا جو اپنے آپ کو دہریہ کہلانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ خلیفہ صاحب نے اس سے گفتگو شروع کی۔ وہ مذہب کی افادیت اور خدا کے وجود کے مسائل پیش کرتا رہا۔ اور خلیفہ صاحب منطقی طریقے سے فلسفیانہ انداز میں اس کے پیش کردہ مسائل کا جائزہ لیتے رہے کبھی اشعار کبھی قرآن و حدیث اور بائبل سے استشہاد اور کہیں فلاسفہ جدید و قدیم کے افکار کبھی رومی اور اقبال سے تشبیہات اس طور سے اس کے سامنے پیش کیں کہ وہ جلد ہی مطمئن ہو گیا۔[۵۵]

مکالمہ طرازی

خلیفہ صاحب جب کسی ادبی محفل میں جم کر بیٹھ جاتے تو اس وقت آپ کی مکالمہ طرازی کی صلاحیتیں بروئے کار آتیں۔ ان کے چیدہ چیدہ اور برمحل اشعار سننے میں آتے جس سے لطف سخن کے پیالے چھلک چھلک جاتے۔ مکالمہ طرازی ان کا وصف خاص اور محبوب مشغلہ تھا۔ دراصل ان کی نظری اور ذہنی صحت کا راز بھی یہی تھا۔ مکالمہ طرازی میں اس قدر یکسوئی اور استغراق ہوتا کہ اکثر سامنے رکھی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو جایا کرتی اور کھانا بے مزہ ہو جاتا۔ اگرچہ آپ نے اپنی نگارشات میں رومی، غالب

---

۵۴ مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ تیسرا سال ش ا جون، جولائی، اگست ص ۳۴۰-۳۴۱

۵۵ مقالہ از بشیر احمد ڈار ایضاً ص ۳۱۳

اور اقبال کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ مگر بنیادی طور پر آپ سقراط کی طرح مصنف سے زیادہ مکالمہ طراز واقع ہوئے تھے۔

علم کے غرہ سے پہلوتہی اور فراخ دلی

اس قدر عالم و فاضل ہونے کے باوجود آپ کو علم کا غرہ یا ہمہ دانی کا کوئی دعویٰ نہ تھا۔ وہ آخر وقت تک خود کو طالب علم سمجھتے رہے وہ خود کہتے تھے۔

" ان تمام قرآنی آیات کو جو علم سے متعلق ہیں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے مثلاً

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا	تمہیں بہت تھوڑا علم دیا
وفوق کل ذی علم علیم۔ حم	گیا ہے ہر اہل علم سے برتر ایک
قل رب زدنی علما۔	صاحب علم ہوتا ہے۔ اے رسول یوں

دعا کیا کرو۔ میرے رب میرے علم میں اضافہ کر"

جب رسول خدا کو یہ دعا سکھائی گئی تو ان سے بڑھ کر اور کون صاحب علم ہو سکتا ہے جو اضافہ علم سے بے نیاز ہو ... باوجود صاحب الآرا ہونے کے دوسروں کی آرا پر غور کرتے اور اگر وہ آرا اہمیت کی حامل[1] نظر آتیں تو انھیں مانتے میں تامل نہ ہوتا اور اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیتے۔ ایک وقت خلیفہ صاحب نے ایک مشہور مصرعہ یوں پڑھا۔ "عیب وطن از ملک سلیمان خوشتر"۔ آپ سے کہا گیا کہ اس کی بجائے "خار وطن از ملک سلیمان خوشتر" ہے تو آپ نے فوراً مان لیا پھر ایک دفعہ آپ نے رومی کا یہ مصرعہ پڑھا۔

"بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب"

اس کے بارے میں عرض کیا گیا یہ گلاب نہیں گلاب (دیکھیے) اور کہنے والے نے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواری سے ایسا ہی سنا ہے چنانچہ کچھ بحث کے بعد آپ مان گئے اور کہا میں اسے گلاب ہی سمجھتا رہا[1]"

ان خوبیوں کے علاوہ آپ کی فراخ دلی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی سے آپ کو نقصان ہوتا

---

[1] مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ میر اسال ش ۱ جلد ۹ جولائی، اگست ص ۲۴۳ - ۲۴۴۔

یا کسی سے کچھ لیتے تو اس کا اعتراف اکثر کیا کرتے۔ ایک بار مولانا محمد جعفر پھلواری کے مضمون سے آپ نے استفادہ کیا تو اس کا ذکر بار بار احباب کے سامنے کرتے تھے یہ ان کی صاف گوئی، قدر دانی، حوصلہ افزائی اور فراخ دلی کی اعلیٰ مثال ہے۔ اعتراف حقیقت میں بہت بیباک تھے لیکن دوسروں کی حق تلفی ہوتی تو اس کے لیے بہ غیرت بھی نہ۔

فرض کی ادائیگی اور کام سے لگن

آپ کو اپنے فرائض کا پورا پورا احساس تھا۔ جب آپ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائرکٹر تھے تو ادارے میں علمی خدمات کے لیے ایسے آدمی کا انتخاب کرتے جو ان کے معیار پر پورا اترتا۔ ایک بار ایک صاحب نے اپنی علمی خدمات ادارے کے لیے پیش کیں۔ خلیفہ صاحب نے پوچھا کیا وہ کہیں اور علمی خدمات انجام دے چکے ہیں، اور اگر ایسا ہے تو اس کا تحریری ثبوت دیں۔ یا نیا مضمون جس سے ان کی قابلیت کا اندازہ ہو سکے دکھائیں۔ وہ چند دن غیر حاضر رہ کر پھر آئے اور کہا بے روزگاری کے سبب دماغ حاضر نہیں۔ خلیفہ صاحب نے کہا اگر یہ صورت تھی مجھے در پیش ہوتی اور میں ملازمت کا خواہاں ہوتا تو پسند کیا ہے پاس صفحے لکھ لاتا۔ آپ پی ایچ۔ ڈی تو ہیں لیکن کہنہ مشق انشا پرداز نہیں۔ پروفیسر شیخ محمود کا کہنا ہے کہ دو بار پنجاب یونیورسٹی سے وائس چانسلری پیش کی گئی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ میں نے انکار کی وجہ پوچھی تو کہا۔ "کام کی قدر، یافت کی قدر سے زیادہ ہوتی ہے۔"[۱]

حب الوطنی

حب الوطنی کا جذبہ آپ کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آپ ہر لمحہ پاکستان کی آزادی اور خوش حالی کی فکر رکھتے تھے۔ جس زمانے میں آپ کشمیر میں تھے آپ نے کوشش کی کہ شیر کشمیر شیخ عبداللہ اور قائد اعظم میں سمجھوتہ ہو جائے تاکہ کشمیر کے مسئلے کا کوئی مناسب حل نکل سکے۔

---

[۱] مقالہ از پروفیسر شیخ محمود احمد، ثقافت ج ۹، ش ۶-۷، جون جولائی اگست ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۷۔

امر سنگھ ڈگری کالج میں پرنسپل کی جگہ خالی تھی تو راجہ مہاراج سنگھ نے جو ان دنوں کشمیر اسٹیٹ کے وزیر اعظم تھے خلیفہ صاحب کو اس عہدے کے لیے آمادہ کر لیا۔ اگرچہ پرنسپل کا عہدہ قبول کرنے کی صورت میں انھیں کئی سو روپیہ ماہوار کا مالی نقصان تھا لیکن انھوں نے جدی وطن کی کشش، وہاں کے پُر فضا موسم اور اہل وطن کی خدمت کو ترجیح دیتے ہوئے اس عہدے کو منظور کر لیا اور بعد میں کشمیر میں ناظم تعلیمات مقرر ہو گئے۔

حیدرآباد سے پنشن لینے کے بعد اپنے آبائی وطن کشمیر میں سکونت کا ارادہ رکھتے تھے اور اسی خیال سے جنگ کے دوران میں جب سوائے صنعت کار یا تاجر کے کوئی مکان بنانے کی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ انھوں نے سری نگر میں بڑا پیارا بنگلہ تعمیر کر دیا۔ زندگی بھر کی جمع کی ہوئی کتابیں اس میں آراستہ کیں۔ لیکن حالات اس سرزمین سے بدلے کہ گھر چھوڑتے ہوئے کچھ بھی ہمراہ نہ لا سکے۔ سارا سرمایہ مکان میں اٹھ چکا تھا۔ اب تنخواہ تھی نہ پنشن مگر انھیں غم تھا تو اپنی کتابوں کا اور اپنے وطن کے خراب حالات کا۔

خلیفہ صاحب کا نظریہ حیات

خلیفہ صاحب کا فلسفۂ زندگی کچھ ایسا تھا جس میں روپیہ کی قدر کچھ زیادہ نہ تھی۔ آپ کہا کرتے تھے۔

"انسان محض ایک وسیلہ (CHANNEL) ہے روپیہ اس طرف سے آکر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ وہ ایک وسیع دریا بن جائیں۔ اگرچہ اس سے حقیقت بدلی نہیں جاتی ہے"[1] (CHANNEL) بعض وسیلہ

آپ کی زندگی کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کیا جائے۔ وہ دوسروں کو بھی اس سے منع کرتے۔ جیسے افتخار رشدی آپ کی پُرعظمت شخصیت کی

---

[1] مقالہ از خواجہ بدر اقبال ریویو ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۵

تو لگتے ہوئے بالآخر اس نقطہ پر پہنچے ہیں کہ آپ اپنے وقت کا ایک پل بھی ضائع کرنے سے گریز کرتے تھے۔ وہ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ایک روز سلیم صاحب کی محفل میں ہم چند طلبا موجود تھے اور خلیفہ صاحب کی گلفشانیوں سے محظوظ اور مستفید ہو رہے تھے۔ محفل برخاست ہوئی تو میں نے سائیکل سنبھالی خلیفہ صاحب نے پوچھا تم سائیکل پر آیا کرتے ہو کتنی دور گھر ہے اور کتنا وقت لگتا ہے۔ میں نے کہا ایک گھنٹہ آپ نے کہا اُف! ایک گھنٹہ آتے ہیں اور ایک گھنٹہ جاتے میں روزانہ عمر کے دو گھنٹے صرف مسافت کرتے ہوئے۔"[1]

خلیفہ صاحب نے زندگی کے جو اصول وضع کر رکھے تھے۔ ان پر سختی سے کاربند تھے مثلاً آپ حسن ظن کے عادی تھے۔ اور لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں دھوکا دے جاتے اور جب بھی آپ سے کہا جاتا کہ کسی شخص پر اتنی جلدی اعتماد نہ کیا کریں تو آپ کہتے۔

"نقصان بے اعتمادی سے بھی ہوتا ہے اور اعتماد کر لینے سے بھی۔ اس لیے میں حسن ظن اور اعتماد والے نقصان کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ بے اعتمادی کی عادت سے اکثر انسان قابل اعتماد آدمیوں کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اور پھر یہ کہا کرتے کہ تجربات زندگی کے بجٹ کے نمائندہ نقصانات کے خانے بھی رکھ لینے چاہئیں۔"[2]

آپ کہا کرتے تھے کہ ہماری زندگی متضاد تقاضوں کا نام ہے ہم اسے بندھے ٹکے اصولوں سے نہیں پرکھ سکتے کیونکہ یہاں عقل بھی کارفرما ہے اور جذبات بھی۔ دماغ اور ذہن آپ کو ایک طرف کھینچتے ہیں اور دل کسی اور طرف۔ زندگی انھیں تقاضوں کا نام ہے اس نظریہ کے ثبوت میں آپ نے ایک قصہ سنایا۔

ایک مشہور قانون دان ایک مقدمے کے لیے پیش ہوا اور اپنے موکل کے حق میں دلائل پیش کیے۔

---

[1] مقالہ از حبیب اللہ رشدی، اقبال ریویو ۶ ش ۳ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۳۳

[2] مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ نمبر ۱ سال ش ۱ جون، جولائی، اگست ص ۳۳۷

کافی عرصے بعد وہی وکیل کسی اور مقدمے کے لیے پیش ہوا اور اب کے اپنے ہی نظریات کے خلاف دلائل پیش کیے اس تضاد کے پیش نظر جج نے اعتراض کیا مگر وکیل نے کہا انسان ہر لمحہ ارتقا کی طرف جا رہا ہے علم و تجربہ سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ اگر آپ آج کے نظریے سے پچھلے خیالات یاد دلاتے ہیں تو گویا آپ میری ترقی پذیری کے منکر ہیں۔"[1]

زندگی بسر کرنے کے معاملہ میں آپ کا خیال تھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسے سادہ ہونا چاہیے کیونکہ مالی فائدے کی نسبت زندگی کی اور قدریں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ انسان ان فائدوں کے چکر میں پھنس کر زندگی کی بلند تر قدروں کو حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے اور مادی خواہشات اس کی شخصیت پر حاوی ہو جاتی ہیں۔

مولانا روم کا جو خیال زر کے بارے میں ہے۔ وہ خلیفہ صاحب کو دل سے پسند تھا کہ ضرورت کے لیے اتنا روپیہ کافی ہے جتنا کشتی کے لیے پانی کہ کم پانی میں کشتی کا چلنا محال ہے اور زیادہ پانی کے اندر ڈوبنے کا امکان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روپے کو ذریعہ یا آلہ سمجھنا چاہیے جس سے زندگی کی اعلیٰ قدروں کو حاصل کیا جا سکے۔ آپ ذہنی یا مالی نقصان کو حقیر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اصل شے جو انسان کی تصرف میں ہونی چاہیے۔ وہ خدا پر ایمان اور علم و ہنر سے بہرہ مند ہونا ہے۔ اس کے آگے سب چیزیں ہیچ ہیں قلبی اور روحانی سکون سے بڑھ کر ان کے نزدیک کوئی چیز نہ تھی۔

زندگی کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر رجائیت پسندانہ تھا یعنی نفسیاتی اصطلاح میں وہ OPTIMISTIC تھے قنوطی ہرگز نہ تھے۔ آپ دونوں مدرسہ ہائے خیال کا موازنہ کرتے اور کہتے کہ نقصان برداشت کرنا اور دھوکا کھانا دونوں قسم کے انسانوں کے لیے ناگزیر ہے۔ رجائیت پسندی کو اس سے مفر ہے نہ قنوطیت کے پاس اس کا علاج ہے۔

---

[1] مقالہ از کے۔ بدر، صحیفہ تیسرا سالی ش انجمن جولائی اگست ص ۳۴۹۔

موت کے بارے میں خلیفہ صاحب کے خیالات

خلیفہ صاحب کہا کرتے تھے کہ انسان مرتا نہیں دوسرے کپڑے تبدیل کر لیتا ہے مرنے والے زندہ ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں نظر نہیں آتے۔ پھر نہ معلوم مرنے والے پر لوگ اس قدر رو اور بلا کیوں کرتے ہیں۔ مرنا بھی اسی قدر آسان ہے جس قدر پیدا ہونا اور یہ بات درست بھی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

خوشامد سے نفرت

خلیفہ صاحب میں خودداری بدرجہ اتم موجود تھی۔ زندگی بھر کبھی ایسا نہ ہوا کہ آپ کسی بڑے آدمی کے ہاں محض اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے گئے ہوں۔ بڑے آدمیوں سے مرعوب ہونا تو ان کی فطرت سے بعید تھا۔ ان سے بھی اسی انداز سے گفتگو کرتے جو ان کی زندگی کا معمول تھا۔

جب ڈاکٹر ڑاد وھا کرشنن اور ان کے رفقا یونیورسٹی ایجوکیشن کے سلسلے میں حیدرآباد آئے تو ان اصحاب کے ساتھ خلیفہ صاحب کی بذلہ سنجی کا وہی انداز تھا جو دوسرے لوگوں سے ہوتا تھا۔ ایک زمانے میں سر اکبر حیدری کا حیدرآباد میں طوطی بولتا تھا۔ جب کبھی وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے اشاعت کلیہ میں آتے خلیفہ صاحب ان سے اس طرح بے تکلفی سے گفتگو کرتے جس طرح وہ اور لوگوں سے معمولاً کیا کرتے۔ اس بے تکلفی کی وجہ سے حیدرآباد کے ارباب لوگوں میں انھیں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ خوشامد انھیں سخت ناپسند تھی۔ کسی کے لیے جناب یا حضور کا لفظ استعمال نہ کرتے تھے۔ کہتے تھے میرا ہر کام خدا کرتا ہے۔ اس لیے کبھی فکرمند نہ ہوتے۔

کار سازِ ما بفکرِ کارِ ماست
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ماست

ہر بات کسی لگی لپٹی کے بغیر منہ پر کہہ دیتے۔ مگر اس موقع پر بھی بذلہ سنجی کو ہاتھ سے

نہ جانے دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ حق بات دلوں میں اتر جاتی اور مخاطب کو اس کی تلخی کا احساس تک نہ ہوتا۔ جب آپ کشمیر میں بطور پرنسپل مقرر ہوئے تو اپنے لیے ایک کوٹھی پسند کی۔ ان دنوں کشمیر کا وزیر جویلی رام تھا۔ اتفاقاً وہی کوٹھی اسے بھی پسند آئی اور اس نے اسے خرید لیا۔ خلیفہ صاحب کی طبیعت پر یہ بات بہت گراں گزری آپ نے فوراً یہ اشعار لکھ کر جویلی رام کو بھیج دیے۔

"حویلی لے گیا لالہ حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی
خدا بھی لا مکاں بندہ بھی بے گھر
اسی کی یہ صفت میں نے بھی لے لی

جویلی رام نے جب یہ اشعار پڑھے تو اسی وقت وہ کوٹھی خلیفہ صاحب کے نام کر دی۔"[1]

ذوقِ جمال

خلیفہ صاحب ہر شے میں اپنے لیے حسین پہلو تلاش کر لیتے تھے۔ فطرت کی بنائی ہوئی حسین چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ زندگی کی قباحتوں کے برعکس وہ اس میں خیر ہی خیر دیکھتے تھے۔ انسان کو فطرت کا حسین ترین شاہکار سمجھتے تھے چنانچہ فطرت نے حسین پیکر چاہے وہ اپنے مدارجِ ذہنی کے لحاظ سے پست درجہ پر کیوں نہ ہوں ان کی ہمدردی اور محبت کا مرکز تھے۔ خوب صورتی پر جان فدا کرتے تھے۔

ایک بار بیگم خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی سہیلیوں کی دعوت کی۔ دعوت سے فراغت پانے کے بعد خلیفہ صاحب نے کہا۔

"خدیجہ سہیلیاں تو خوب صورت بنایا کرو۔ میرا بس چلے تو بدصورت لوگوں کو عمر قید پہنا دوں۔"[2]

محفل آرائی

ہم مذاق لوگوں کی صحبت میسر آجاتی تو آپ کو بے حد خوشی ہوتی پھر تو وہ رونق

---

[1] انٹرویو خلیفہ عبدالواحد

[2] انٹرویو بیگم خلیفہ عبدالحکیم۔

کو ہنسا دیتے ۔ پژمردگی کو زندہ دلی میں تبدیل کر دیتے اور ہنسنے والے کے دل میں ایک نئی دنیا بسا دیتے ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا کہنا ہے :

"مری کی ادبی اور ثقافتی زندگی کے وہ دولہا تھے ۔ مری میں لن ڈاٹ ریستوران میں کوئی خصوصی تقریب منعقد ہوتی تو خلیفہ صاحب ضرور مدعو ہوتے ۔ جہاں شخصیت کے وقار اور شخصی حسن سے ساری محفل پر چھا جاتے اور لطافت و ظرافت کا دریا بہا دیتے ۔"[1]

خلیفہ صاحب جس محفل میں نہ ہوتے وہ سونی سونی محسوس ہوتی اور اگر خوش قسمتی سے خلیفہ صاحب وہاں آجاتے تو محفل کی فضا کچھ اور ہی ہو جاتی ۔ ایسی ایسی باتیں اس ڈھنگ سے کر جاتے کہ معنی کے گل و گلزار کھل جاتے ۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنے والد مولانا عبدالمجید سالک کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک دو شخص ایسے تھے جو گفتگو کے بادشاہ تھے اور محفل آرائی میں کمال رکھتے تھے ۔ ایک حکیم احمد شجاع اور دوسرے خلیفہ عبدالحکیم لیکن دونوں کی گفتگو کے انداز میں فرق ہوتا ۔ اول الذکر ہمیشہ سنجیدہ رہتے اور اپنی گفتگو سے بعض اوقات رقت کا تاثر چھوڑ جاتے ۔ ان کے برعکس خلیفہ عبدالحکیم کی محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی اور ایسے ایسے لطیفے ہو جاتے جو مدتوں تک ذہن میں آ آکر ہونٹوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ۔

حبیب اللہ رشدی کہتے ہیں کہ خلیفہ صاحب کے آتے ہی محفل چہک اٹھتی تھی ۔ ہنسی ہنسی میں کام کی بات کہہ جاتے ۔ ایک پروفیسر فلسفی اور مفکر مذہب کا کردار ان کے قد و قامت پر خوب پھبتا تھا ۔ ذیل میں خلیفہ صاحب کے چند لطائف درج کیے جاتے ہیں ۔

خلیفہ صاحب کے لطائف

۱۔ ایک جلسے میں جو نظام تعلیم میں اردو کا صحیح مقام متعین کرانے کے لیے منعقد ہوا تھا خلیفہ صاحب شریک ہوئے ۔ جلسے کے اختتام پر مولانا عبدالمجید سالک مرحوم اور جسٹس

---

[1] مقالہ از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ۔ ثقافت ج ۸ ، ش ۶ - ۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۲۴ - ۱۲۵

ایس۔ اے رحمان آپ کے پاس کھڑے تھے۔ ایس۔ اے رحمن صاحب نے ازراہِ تفنن اُن سے مخاطب ہو کر کہا، سالک صاحب آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ مرجھائے ہوئے سے نظر آرہے ہیں بد اپنے مقابلے میں خلیفہ صاحب کو دیکھیے کیسے سرخ و سفید اور چاق و چوبند نظر آرہے ہیں۔ خلیفہ صاحب سے نہ رہا گیا۔ جھٹ بول اٹھے۔

"بھائی صاحب آپ نے اپنے آباؤ اجداد کے انتخاب میں کامل احتیاط نہیں برتی۔ مجھے دیکھیے کہ کشمیری الاصل ہوں یہی وجہ ہے کہ میرے چہرے پر ایسی رونق رہتی ہے۔"

۲۔ ایک دفعہ بحث ہو رہی تھی کہ آیا نام محض تعارف کے لیے ہوتے ہیں یا ان میں کوئی معنی بھی مضمر ہوتے ہیں۔ عبدالسلام خورشید نے کہا سب تو نہیں مگر بعض نام ایسے ہوتے ہیں جن کی معنوی حقیقت کا اطلاق شخصیت پر بھی ہوتا ہے۔ خلیفہ صاحب کو دیکھیں اسم بامسمیٰ ہیں۔ آپ عبدالحکیم اسماً بھی ہیں اور معناً بھی۔ خلیفہ صاحب نے کہا "حکیم تو کوئی اور ہو گا میں تو صرف عبد ہوں۔"

۳۔ خلیفہ صاحب کے ایک دوست کے بہت سے بچے تھے۔ خلیفہ صاحب نے ان سے کہا کہ بھئی اب کی دفعہ بچہ پیدا ہوا تو نام ہم رکھیں گے۔ جب ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو وہ خلیفہ صاحب کے پاس آئے اور اس کا نام رکھنے کے بارے میں خلیفہ صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ خلیفہ صاحب نے ان کے بچوں کے نام پوچھے۔ دوست موصوف نے بچوں کے نام کچھ اس طرح بتائے مرزا اصغر، مرزا باقر، مرزا اکبر وغیرہ۔ جب سب بچوں کے نام بتا چکے تو خلیفہ صاحب بولے۔ مرزا صاحب آپ نے تو سارے ہی نام رکھ لیے ہیں۔ اب اس کا نام "مرزا ایس کر" رکھ لیں تو مناسب رہے گا۔

۴۔ ایک لطیفہ خلیفہ صاحب خدیجہ بیگم کے بارے میں سنایا کرتے تھے۔ لندن کے قیام کے دنوں میں ایک دفعہ ٹیوب اسٹیشن میں چل رہے تھے بھیڑ بہت تھی۔ آپ نے خدیجہ بیگم سے کہا کہ تم میرا کوٹ پکڑ کر چلو تاکہ گم نہ ہو جاؤ۔ خدیجہ بیگم نے تھوڑی دیر تو کوٹ پکڑے

شکّہ مقالہ از ایس اے رحمان صحیفہ تیسرا سال ش اجون جولائی اگست ص ۲۸۹

رکھا پھر نہ جانے کیسے خلیفہ صاحب کا کوٹ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور کسی اور کا کوٹ تھام لیا۔ تھوڑی دور ہی ساتھ چلیں تھیں کہ اس انگریز نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہنے لگا "SORRY I AM NOT YOUR HUSBAND" اس سے پہلے ایسا ہی ایک واقعہ نارا دیوی شملہ میں بھی ہو چکا تھا۔ خلیفہ صاحب پاکستان آئے تو سب احباب کو یہ لطیفہ سنایا۔

۵ ۔ خلیفہ صاحب جب جرمنی سے واپس آئے تو آپ نے رشتہ داروں اور دوستوں کو پارٹی دی۔ پارٹی کا انتظام گھر کی بالائی منزل پر تھا۔ کشمیری عورتیں اکثر موٹی ہوتی ہیں ان کے لیے اوپر چڑھنا خاصا مشکل تھا۔ لیکن سب کسی نہ کسی طرح اوپر چڑھتی گئیں۔ آخر میں ایک عورت آئی تو وہ اوپر جانے کے بجائے پہلی سیڑھی پر ہی بیٹھ گئیں۔ آپ بولے "یہ ہے اصل کشمیرن۔"

۶ ۔ خلیفہ صاحب، غلام محمد مرحوم اور سر ظفر اللہ خاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ غلام محمد بولے خلیفہ صاحب آپ کو کسی اسلامی ملک کا گورنر ہونا چاہیے تھا۔ آپ بولے یہ تو دیکھیے یہ صورت کیسی رہے گی۔ غلام محمد تو گورنر جنرل ہو، ظفر اللہ حسن بن صباح ہیں بس مجھے تو عمر خیام بنا دو۔

۷ ۔ خلیفہ صاحب کی ایک رشتہ دار تھیں انھوں نے ڈبل روٹی اس وہم میں کھانا چھوڑ دی کہ آٹا پاؤں سے گوندھا جاتا ہے۔ جب خلیفہ صاحب کو پتہ چلا تو آپ نے اس خاتون سے کہا آپ (B. P.) کی ڈبل روٹی کھایا کریں۔ انھوں نے پوچھا یہ کیوں خلیفہ صاحب بولے اس لیے کہ (B. P.) کا مطلب ہے بغیر پاؤں کے (بات بھی سچ تھی کہ اس کارخانے میں سارا کام مشینوں سے ہوتا ہے)۔

۸ ۔ خلیفہ صاحب کے ایک دوست ڈاکٹر جلال الدین تھے۔ آپ انہیں اکثر کہا کرتے کہ نام میں غلطی سے نقطہ نیچے گر گیا ہے۔ اسے اوپر ہونا چاہیے تھا یعنی غلال الدین (ڈاکٹر جلال الدین ڈھیلے پتلے دراز قد آدمی تھے۔ اس لیے ان پر غلال کی پھبتی کہی گئی۔

۹ ۔ اورینٹل کالج میں ایک پارٹی تھی جس میں عورتیں بہت کم تھیں۔ خلیفہ صاحب بولے بھئی "قحط الرجال" تو سننے میں آیا تھا آج قحط النساء بھی دیکھ لیا۔

۱۰ - انور اقبال قریشی بچوں پر بہت سختی کیا کرتے تھے۔ بات بات پر انھیں ڈانٹ دیا کرتے تھے۔ آپ اس کے بارے میں کہا کرتے تھے "آدھا قریشی ہے آدھا مولیسنی ہے"

۱۱ - آپ کے بہنوئی عطا اللہ بٹ (کھدر پوشی کانگریسی تھے) مزاج کے بہت تیز تھے ذرا کام مزاج کے خلاف ہوا تو انھوں نے گرجنا شروع کر دیا۔ آپ کہا کرتے "آدھا آندھی ہے اور آدھا گاندھی ہے"

آپ کے لطائف تو اس کثرت سے ہیں کہ ان کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ اس لیے یہ سلسلہ یہیں ختم کرتی ہوں۔

فال پر یقین

خلیفہ صاحب اپنی فکر نو کے باوجود دیوانِ حافظ سے فال نکالا کرتے تھے اور اس فال پر آپ کو حد درجے یقین تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ صاحب کو حافظ پر بہت اعتماد تھا۔ وہ خود کہا کرتے کہ حافظ شیرازی سے میرا خاص تعلق اور عجیب رابطہ ہے کیونکہ ہر مشکل کے وقت اور ہر قدم اٹھانے سے پہلے میں نے دیوانِ حافظ سے فال نکالی اور حافظ کی روح نے میری صحیح راہنمائی کی اور میرے حسب حال مشورہ دیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران جموں و کشمیر کی ریاست سے نوکری کی پیش کش ہوئی آپ نے دیوانِ حافظ کی طرف رجوع کیا۔ وہاں سے جواب ملا ؎

مسند بہ باغ بر کہ بخدمت چو بندگان
استادہ است سرو کمر بستہ است نے
اشیائے روزگار بہ مے ساز در گرو
کز مرد راہ بار نماند است ہیچ شے

اس جواب کو سن کر آپ نے پیش کش قبول کر لی۔ پھر وہاں کے سیاسی حالات خراب ہوئے تو حافظ سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ وہ فریب کی آگ لگنے والی ہے۔ خرقہ پشمینہ چھوڑ دو اور بھاگو اور جو لوگ حق کی خاطر ساز و سامان چھوڑتے ہیں اللہ انھیں بہتر عوض دیتا

ہے۔ اور بعد میں جب ٹرینگدا س گارڈن ملا (جہاں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا دفتر واقع ہے) تو کہتے ہیں کہ یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی۔ اس کے بعد جب یورپ اور ایران کا دورہ کیا تو یہ فال نکلی ہے

حافظ حدیثِ سحر فریب خوشت رسید

تا حدِ مصر و چین با اطراف روم و رے

روم و رے کا تعلق خلیفہ صاحب کے لیے حیران کن تھا۔ مگر لیبیا سے واپسی پر آپ کو ایران اور ترکیہ جانا پڑا۔ تہران کی سیر کرتے ہوئے ایک بستی میں پہنچے تو اس کا نام "رے" تھا۔ اس طرح اقصائے روم و رے والا معاملہ صاف ہوا۔

فال دیکھنے کے متعلق خود خلیفہ صاحب کا خیال تھا کہ شعروں میں انسان اپنا تأثر تلاش کرتا ہے کیونکہ انسان اپنے ذہنی تصورات اور قلبی رجحانات کو ایک خارجی شکل دیتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ خلیفہ صاحب کی یہ عادت تھی اور اس سے انھیں سکون اور یک جہتی حاصل ہوتی تھی۔

خلیفہ صاحب کی تقلید میں حافظ سے فال دیکھنے کی عادت ان کے پورے گھر میں آگئی۔ چنانچہ خلیفہ صاحب کی وفات سے چند روز پہلے ان کی بیٹی نے دیوانِ حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر برآمد ہوا ہے

زمانہ از ورقِ گل مثالِ روئے تو بست

ولے ز شرمِ تو در غنچہ کرد پنہانش

پریشان ہوکر دوبارہ فال نکالی تو دوسری فال خلیفہ صاحب کی وفات کی طرف اشارہ کر رہی تھی ہے

بر سرِ تربتِ ما چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

خلیفہ صاحب باپ کی حیثیت سے

باوجود اس حقیقت کے کہ آپ وقت کا بیشتر حصہ مطالعے میں صرف کرتے یا علماء و فضلا

کے شغلوں میں گزارتے۔ آپ اپنے بچوں کی طرف سے بالکل غافل نہ تھے۔ ایک باپ کی حیثیت سے جب ہم خلیفہ صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو آپ ایک مشفق اور مستعد باپ نظر آتے ہیں۔ رفیعہ کو جب کالج میں داخل کروانا تھا تو خود گئے اور اسی طرح اپنے بیٹے عارف کے لیے بھی گئے۔ اپنی بیٹی پر فخر تھا، کہا کرتے تھے کہ میرا دماغ رفیعہ کو ملا ہے۔ ہر بات میں بچوں کی رائے کا خیال رکھتے۔ زبردستی یا ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ لیتے بلکہ مختلف طریقوں سے بات منواتے۔ کہتے تھے اگر میں ماں ہوتا تو کبھی بچوں کو رونے نہ دیتا۔ بلوغت کے بعد ان کے معاملات میں دخل نہ دیتے ان سے کہا کرتے تھے اب تم سمجھدار ہو اپنی بھلائی برائی خود سمجھ سکتے ہو۔

عارف حکیم بننا چاہتے تھے خلیفہ صاحب راضی نہ تھے لیکن جب عارف نے اپنی بات پر اصرار کیا تو پھر نہ روکا۔ جب کبھی آپ امریکہ گئے بیٹے سے ضرور ملے بلکہ اس کے ہاں ٹھہرتے اور اس کو بچے کی طرح ساتھ سلاتے۔ آپ عارف کی شادی کے متمنی تھے۔ چنانچہ اسے خط کے ذریعے ترغیب دی کہ وہ ان کی تمنا پوری کرے مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا اور یہ آرزو اس جہان فانی سے آپ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

ایک فرض شناس باپ ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی اولاد کے حقوق اور ان کا بھی خیال رکھتے۔ رفیعہ نے جب ایم۔ اے کر لیا تو آپ نے ان کی تمام سہیلیوں کو مدعو کیا تاکہ کچھ دن وہ اکٹھے گزار سکیں۔

آپ کو اپنی بچی کی خواہشات اور رضا کا اس قدر احترام تھا کہ بجائے لڑکی کے اور اس کا باپ نکاح کے وقت رضا دریافت کرے۔ آپ نے اپنی ولی ہوتے سامنے ایجاب و قبول ہونا چاہیے اور ایسا ہی ہوا۔ آپ اپنی اولاد پر جان نثار کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلکیاں رفیعہ بیگم کے ان تاثرات سے واضح ہو جو ماہنامہ ثقافت ۱۹۶۰ء کے ایک شمارے میں* اپنے والد کی یاد میں کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔

* اولاد اور والدین کے درمیان محبت کا تعلق انسانی فطرت کا اہم تقاضا ہے۔ [illegible]

والد سے کچھ ان خصوصیت کی وجہ سے عام رشتوں سے مختلف تھا۔ وہ صرف میرے والد ہی نہ تھے بلکہ میرے رہبر بھی تھے اور مخلص دوست بھی۔ ان کی صحبت سے ہر ایک مستفید ہوتا اور مجھے فخر ہے کہ میں ایسے باپ کی بیٹی ہوں۔[1]"

بچوں سے سلوک

بچوں سے نہایت نرمی سے پیش آتے تھے۔ روٹھے ہوؤں کو منانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اکثر اوقات بچوں میں خود بچہ بن جاتے۔ ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے بعض اوقات ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے کہ سننے والے کو اپنا بچپن یاد آجاتا۔ کہا کرتے تھے "اپنا بچپن کبھی نہ بھولنا چاہیے اور اگر بھول جائے تو اُسے کرید کرید کر حافظے میں محفوظ کر لینا چاہیے کیونکہ اس کے بعد فطرت کی معصومیت سخت مجاہدے کے بعد بھی بہ مشکل ہاتھ آتی ہے۔" پھر کہتے

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچوں کی تربیت اچھی ہو وہ قابل بنیں۔ آپ سے متاثر ہوں اور اچھی باتیں سیکھیں تو آپ کے لیے بھی ضروری ہے کہ انھیں مناسب وقت دیں اُدھر آپ نئی روش کے اُن والدین سے بیزار تھے۔ جو سوشل زندگی میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ بچے کوئی کام کی بات یا روز بروز بڑھنے اور نئے سانچوں میں ڈھلنے والی شخصیت کی نشوونما میں والدین کے تجربہ اور شفقت سے مستفید نہ ہوں۔

انھوں نے اپنے بچوں کی اصلاح اور تربیت اس طرح کی کہ انھیں احساس ہی نہ ہوا کہ وعظ و تلقین سے ان کی اصلاح ہو رہی ہے۔ یا انھیں زبردستی کوئی تعلیمی درس گھول کر پلایا جا رہا ہے۔ انگریزی کا مقولہ ہے "MEN SHOULD BE TAUGHT AS IF THEY WERE TAUGHT NOT."

آپ کا طرزِ عمل یہی تھا۔ قدم قدم پر سبق آموز باتیں اس طرح بتاتے کہ احساس تک نہ ہوتا۔ سردیوں کے زمانے میں جب آتش دان کی آگ کے قریب بیٹھ جاتے تو طبیعت

---

[1] مقالہ از رفیعہ حسن، ثقافت ج ۸۔ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۹۳

رنگ پر آجاتی ۔ رفیعہ بیگم کہتی ہیں اس طرح جو تعلیم میں نے غیر ارادی طور پر حاصل کی ہے اس نے مجھے تعلیم کے میدان میں مدد دی اور علم کا ذوق شوق پیدا کیا ہے[1]

بھائی کی حیثیت سے

آپ اپنی بہن کی بہت عزت کرتے تھے ۔ اور ہر بات میں ان سے مشورہ کرتے تھے ۔ خود اتنے بڑے عالم فاضل تھے ۔ لیکن کہا کرتے میری بہن تو فطرتاً فلاسفر ہے اس کا دیا ہوا مشورہ بہت اچھا ہوتا ہے ۔ بہن کے علاوہ آپ کو بھائیوں سے بھی محبت پیار تھا ۔ اپنے چھوٹے بھائی خلیفہ عبدالغنی کی تعلیم و تربیت میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے علاوہ ازیں آپ کو بہن بھائیوں کے بچوں سے بہت زیادہ پیار تھا ۔ جب آپ حیدر آباد دکن میں پروفیسر تھے اور چھٹیوں میں اپنے بچوں سے ملنے آتے تو راستے میں علی گڑھ بہن کے پاس آتے جاتے ضرور ٹھہرتے ۔

تینوں بھانجیاں جب بی ۔ اے سے فارغ ہوئیں تو انھیں باری باری حیدر آباد لے گئے ، اور جب ان کی شادیاں ہوئیں تو بے حد خوش تھے ۔

یہی سلوک آپ کا اپنے باقی رشتہ داروں سے تھا ۔ احباب بھی آپ کے اس قدر مداح تھے کہ جہاں کہیں انھیں ٹیڑھا مسئلہ درپیش ہوا ، فوراً خلیفہ صاحب کے پاس آتے اور خلیفہ صاحب منٹوں میں بڑے خلوص سے مسئلہ سلجھا دیتے ۔ انھیں اب بھی خلیفہ صاحب سے اس قدر لگاؤ ہے کہ اگرچہ آپ کی وفات کو اتنا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آپ کے عزیز اور دوست آپ کو کسی موقع پر نہیں بھولتے ، آپ کی کہی ہوئی باتیں یاد کرتے ہیں اور آپ کی کمی کو آج بھی اسی طرح محسوس کرتے ہیں جیسے ان کی زندگی میں ان کے محفل میں موجود نہ ہونے پر کرتے تھے ۔

فرزند کی حیثیت سے

جب آپ تیرہ چودہ سال کے تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا ۔ والدہ نے

---

[1] مقالہ از رفیعہ حسن ، ثقافت ج ۸ ، ش ۶ ۔ ۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۹۳ ۔ ۹۴ ۔ ۹۵

ہو گئی میں بچوں کی پرورش کی۔ آپ کو پڑھائی کا شوق تھا اور آپ کی والدہ نے اس
شوق کو فروں تر کر دیا۔ انھیں نوکری کے لیے کبھی مجبور نہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ اپنی
والدہ کی ہمت اور دانشمندی کے بہت قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس مقام
تک مجھے والدہ ہی نے پہنچایا ہے۔

وہ والدہ کا ہر حکم بجا لاتے اور اس معاملہ میں کبھی پس و پیش نہ کرتے۔ دوستوں
کے وہ کام جو براہ راست خلیفہ صاحب جھجکتے ہوئے کرتے۔ اپنی والدہ کے کہنے
پر بڑی سے بڑی مشقت کر گزرتے۔ جب آپ بی۔ اے میں تھے تو آپ کی والدہ نے کہا کہ
شام کو بتی روشن ہونے سے پہلے گھر آ جایا کرو۔ ایک دفعہ آپ کو دیر ہو گئی۔ گھر آئے
تو ماں بہت ناراض ہوئیں اور آپ کو چپت رسید کر دی۔ لیکن یہ چپت خلیفہ صاحب
کے دل و دماغ پر ماں کی عظمت کے ابدی نقوش مرتسم کر گئی۔ اس دن آپ سے کھانا
تک بھی نہ کھایا گیا۔ چنانچہ بڑی بہن نے آپ کو کھانا دیا۔ اس کے بعد آپ کبھی
دیر سے گھر نہ لوٹے۔

آپ ماں کی محبت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ اس وقت تک جاگتی رہتیں
جب تک آپ پڑھائی ختم نہ کر لیتے۔ گھر کے حالات خراب ہی تھے آپ کی والدہ
نے کبھی آپ کو نوکری کے لیے نہ کہا۔ خلیفہ صاحب سے یہی کہتی رہیں جس میں تمھاری
بہتری ہو وہ کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی والدہ نے آپ کے اندر چھپے ہوئے
جوہر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ آپ کو علم کے راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف نہ لے جانا چاہتی تھیں

آپ کے والد کی وفات تو اس وقت ہو گئی تھی جب آپ تیرہ چودہ برس کے
تھے لہٰذا آپ کو شدت سے احساس تھا کہ آپ اپنے والد کی زندگی میں کچھ نہ کر
سکے۔ اس لیے آپ نے والد کی قبر کو سنگ مرمر سے بنوایا اور قریب ہی ایک چبوترہ
بنوایا جس کے بارے میں کہتے تھے جو پہلے آئے گا یہاں آ جائے گا۔ مگر یہ انھیں معلوم
نہ تھا کہ خود ہی پہلے والد کے پہلو میں آ جائیں گے۔

دوست کی حیثیت سے

خلیفہ صاحب ان آدمیوں میں سے تھے جن کی زندگی خاص اصولوں پر مبنی ہوتی ہے

ملنسار اور یہی خواہ ایسے کہ اپنے، پرائے، دوست اور دشمن سب آپ کے مداح تھے۔ بالخصوص آپ کو اپنے مخلص دوستوں سے گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ آپ کی وفات کو پورے گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ آپ کے دوست آج بھی آپ کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ آپ کا ذکر اس خلوص اور احترام سے کرتے ہیں کہ سننے والے کو ان پر رشک آ جاتا ہے۔

آپ کسی دوست کو مشکل میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ ضرورت کے وقت استطاعت سے بڑھ کر مدد کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب کے جتنے دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے ان سب کی زبان سے یہی الفاظ سنے ہیں "خلیفہ صاحب کی دوستی قابلِ رشک تھی اور ان سے مل کر اطمینانِ قلب حاصل ہوتا تھا۔"

انسان کی حیثیت سے

انھیں اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے جذبات اور احساسات کا ہر لمحہ خیال رہتا۔

یار محمد کھنڈ صاحب خلیفہ صاحب کے دوست بھی ہیں اور رشتہ دار بھی۔ جب وہ قلات کے وزیر (منسٹر) بن کر رہ گئے تو خلیفہ صاحب اُن سے کہنے لگے۔ وہاں کے لوگ غریب ہیں ان پر رعب نہ جمانا اور نہ سختی کرنا بلکہ ان کی اصلاح کرنا اور ان کی خوشحالی کا خیال رکھنا کیونکہ تم صرف اُن لوگوں کی وجہ سے وزیر بن کر جا رہے ہو۔

سلیم واحد سلیم (خلیفہ صاحب کے بھتیجے) کہتے ہیں۔

"خلیفہ صاحب کو میں ایک انسان کے روپ میں دیکھ رہا ہوں اور ایک انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی اور یہ شخص میرے خاندان والوں کے تمام عجیب و غریب خصائص رکھنے کے باوجود ایک شگفتہ مزاج اور بہتر انسان ہے۔ کیونکہ اس کی محبت موزیاں کے اندیشوں سے آزاد بھی ہوتی ہے اور اگر وہ اچھا انسان نہیں تو اچھا انسان بننے کی کوشش تو کرتا ہے اور بعض اوقات اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔"[۱]

۱؎ مقالہ از سلیم واحد سلیم ادبی دنیا ستمبر۔اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۹۰

خلیفہ صاحب میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ زندگی کی دوڑ میں جو لوگ ان سے پیچھے رہ گئے تھے ان سے ملاقات ہوتی تو محبت سے پیش آتے۔ جموں میں ایک سکول کا معائنہ کرنے گئے تو ایک سکول ماسٹر آپ کا ہم جماعت تھا۔ اس نے جب آپ کو یاد دلایا تو آپ نے اسے کہا میرے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ جب جی چاہے آجایا کرو۔ اسی طرح کا ایک واقعہ انارکلی میں پیش آیا۔

"ایک غبارے والا شیرانوالہ اسکول میں آپ کا ہم جماعت تھا۔ اس کے یاد دلانے پر اس سے انتہائی خلوص اور محبت سے ملے اور اسے گھر لے آئے۔ اگرچہ اس نے اپنے گندے کپڑوں سے معانقہ کر کے گندہ کر دیا تھا۔ مگر آپ نے اس بات کا اثر نہ لیا۔"[۱]

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو انسان ہونے کے ناطے سے دوسرے انسانوں کا کتنا احساس تھا۔

آقا کی حیثیت سے

خلیفہ صاحب ایک مہربان آقا اور حساس انسان تھے۔ نوکروں کا اس قدر خیال رکھتے کہ وہ ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیتے۔ ان سے رعب سے کام نہ لیتے کہتے تھے غریب کو خوش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ذرا سی تعریف سے اس کا دل بڑھ جاتا ہے اور وہ زیادہ کام کرتا ہے۔ اکثر زیادہ کام خود کر لیتے اگر وقت پر نہ ہوتا تو نوکروں پر کبھی نہ بگڑتے۔ اپنے بے تکلف دوستوں کی طرح ان کے دکھوں اور خوشیوں میں شریک ہوتے یہاں تک کہ کبھی کبھی اُن سے مذاق بھی کر لیتے تھے۔

خراب نوکر ناجائز فائدہ اُٹھاتے۔ مگر آپ عادت سے مجبور تھے۔ پھر بھی آپ اُن کا احترام کرتے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے ہاں شادی تھی۔ ایک چادر گم ہو گئی اور کسی نے کام کرنے والی عورت کا نام لے لیا آپ ناشتہ کر رہے تھے۔ ناشتہ چھوڑ کر آئے اور کہا میں اس کی قسم کھاتا ہوں۔ بعد میں وہ چادر واقعی کسی اور سے

---

[۱] مقالہ از سلیم واحد سلیم، ادبی دنیا ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۱۰۰

مل گئی۔ یہ عفو اور پردہ پوشی کی عمدہ مثال ہے۔

خادم پروری کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔

آپ صبح صبح اٹھ کر مطالعہ کرنے کے عادی تھے اور یہ مطالعہ عموماً باغ میں بیٹھ کر ہوتا اس لیے نوکر کو صبح صبح اٹھ کر آپ کے لیے میز لگانا ہوتا تھا۔ آپ نے باغ میں ایک درخت کٹوا دیا اور اس کے تنے پر بیٹھنے کا کام لینے لگے۔ نوکر سے کہا یہ میز قدرتی ہوئی ہے وہ میں خود لے آیا کروں گا تم میرے لیے اتنی صبح نہ اٹھا کرو۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے احاطے سے نوکر لکڑیاں بغیر اجازت لے جایا کرتے۔ جب ان کی شکایت ہوئی تو آپ نے انہیں منع کیا۔ پھر کہا یہ غریب لوگ ہیں اگر اس طرح ان کو فائدہ پہنچتا ہے تو کیا حرج ہے۔

ایک دن ایک سبزی والا آیا۔ آپ کی بیوی نے گاجروں کا بھاؤ پوچھا اور خریدنی چاہیں لے لیں۔ مگر قیمت پر کچھ بحث ہوئی۔ آپ نے دوسرے دروازے سے جا کر سبزی والے کو دس روپے دے دیے۔ بیوی نے پوچھا تو بولے غریب آدمی تھا۔ پاؤں میں جوتا تک نہ تھا۔ گھر کا ملازم ہو یا دفتر کا چپراسی آپ ان سے نہایت اچھا برتاؤ کرتے۔

استاد کی حیثیت سے

خلیفہ صاحب کے لیکچر دینے کا انداز ایسا مسحور کن ہوتا کہ خشک سے خشک موضوع میں جان پڑ جاتی۔ بات بات میں لطیفے کہنے کے عادی تو تھے ہی [illegible] کے بغیر ہر [illegible] سے پڑھاتا۔

حبیب اللہ رشدی جو ان دنوں طالب علم تھے لکھتے ہیں۔

"مجھے منطق سے دلچسپی کے بجائے تنفر تھا . . . مگر جب آنہ جناب خلیفہ صاحب کا لیکچر سنا تو ذہن ہی بدل گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پھول ہیں [illegible] بھی مغربی خیالات اس سہولت سے اردو میں بیان کیے کہ میں حیران رہ گیا۔ منطق کی تعریف [illegible] سمجھ میں آئی جو کہنے لگے منطق علم ہے فکر کو غلطی سے بچانے کا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ پڑھنے کے قابل مضمون صرف منطق ہے۔"

مقالہ از حبیب اللہ رشدی اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۸ - ۴۴

طلبا آپ کو بہت چاہتے تھے۔ ایک دفعہ خلیفہ صاحب کی غیر حاضری میں ایک دوسرے استاد یہ فرض سرانجام دیتے رہے۔ جب خلیفہ صاحب واپس آئے تو طلبا نے یوم نجات منایا۔ کیونکہ آپ کا برتاؤ دوستانہ تھا کبھی بار گھر پر طلبا کو پڑھاتے۔ اور ایسی فضا پیدا کر دیتے کہ مدرسے میں جو بات انھیں سمجھ میں نہ آتی وہ یہاں بآسانی ذہن نشین کر لیتے۔ کسی عزیز کا ادبی رجحان دیکھ کر خوش ہوتے اور اُس کو توجہ کا مرکز بنا لیتے۔

آپ اکثر اپنے بارے میں بتایا کرتے کہ میری بڑی بہن کہا کرتی کہ حکیم تو اِن تے گلاں دی کھٹیا کھادیں گا بھی (حکیم تو تو باتوں کی کمائی کھائے گا) حکیم صاحب کہتے تھے کہ اس کا قول پورا ہوا۔ میں نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا یعنی باتیں کر کے بسر معاش کرتا ہوں۔

خلیفہ صاحب اور ادارہ ثقافت اسلامیہ

خلیفہ صاحب کی رفاقت پر ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے اہل کار اور ماتحت آج بھی فخر کرتے ہیں۔ وہ اس طرح گھل مل کر بیٹھتے تھے کہ کسی طرح کا احساسِ برتری و تفوق اپنے نزدیک بھٹکنے بھی نہ دیتے تھے۔ پندار اور نخوت کا مظاہرہ کبھی نہ کیا۔ کیونکہ یہ بات آپ کی فطرت سے بعید تھی۔ رُفقائے ادارہ پر جان دیتے تھے اور ان کی صحبت و رفاقت کو حاصلِ زندگی قرار دیتے تھے۔ روزانہ ڈیڑھ دو گھنٹے مختلف موضوعات پر بحث ہوتی اور اس کو اہم جانتے تھے۔ گورنر اور بڑے بڑے وزراء سے طویل ملاقاتیں ہوتیں۔ مگر ذوقِ فکر کی تسکین نہ ہوتی۔ اس کے بعد سیدھے ادارے میں آتے اور جب تک رفقائے کار سے کسی علمی موضوع پر گفتگو نہ کر لیتے انھیں چین نہ آتا۔ اس بحث میں صرف اپنی ہی نہ کہتے بلکہ دوسروں کی بھی سنتے اور مانتے تھے۔ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ شراب کی حرمت پر بحث ہو رہی تھی کہ اس سے نشہ ہوتا ہے۔ آدمی بہک جاتا ہے اس لیے منع ہے۔ ہوش و حواس کھو جاتے ہیں۔ لیکن اگر اتنی شراب پی جائے کہ نشہ نہ ہو تو حرام نہ ہونی چاہیے۔ خلیفہ صاحب اس پر تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ امام محمد کا فتویٰ معلوم ہوا۔ اگر نشہ نہ ہو تو شراب حرام نہیں۔ میں نے عرض کیا یہ فتویٰ نہیں قول ہے اور مفتیٰ بہ نہیں ہے۔ یہ سُن کر آپ خاموش ہو گئے اور پھر بحث نہ کی"[1]

---

[1] مقالہ از رئیس احمد جعفری ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۰۱

حنیف صاحب لکھتے ہیں:-

"اگر کبھی بہت دیر سے منظور ہوتا اور مجھے بڑی تشویش لاحق ہوتی تو خلیفہ صاحب اپنے حساب سے کچھ کارڈ دے دیتے اور ہماری تمام تشویش کو چشم زدن میں دور کر دیتے۔"[1]

آپ کی نظر نے ہر رفیق ادارہ کی صلاحیت و مذاق کا تعین کر دیا تھا۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ کون سا رفیق کون سا کام بہتر کر سکتا ہے اور وہی کام اسی کے سپرد کر دیتے۔ اگر رفقا تو خود کام تجویز کرتے آپ سے منظوری لے لیتے۔ آپ اس کام کی تکمیل کے لیے ایک معیاد دے دیتے اور اس میعاد کے ساتھ آزاد چھوڑ دیتے۔ مقررہ وقت پر کام نہ ہوتا تو پوچھ گچھ کرتے اور رفقا جو کچھ کہتے اس پر یقین کیا کرتے۔

"میں خود مصنف ہوں اور جانتا ہوں کہ علمی کام کس طرح ہوتے ہیں۔ ٹیکنیکل کام نہیں تخلیقی اور تحقیقی کاموں کے لیے خاص موڈ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تھوڑی مدت میں بڑا کام ہو جاتا ہے اور کبھی طویل مدت میں یہ کام نہیں ہو پاتا۔ اور کئی دفعہ دوران تحقیق میں ایک مسئلے کے لیے اور کتب بھی اور دماغ کاوش کرنی پڑتی ہے۔"[2]

یہ بات بالکل درست ہے جیسے رفقا نے ادارہ کا دفاع کر رہے ہیں۔ بازپرس کا خیال کبھی آپ کے ذہن میں نہ آیا۔ کام کے لیے ہر ممکن سہولت دیتے۔ شخصی و نظریاتی احترام اہمیت نہ رکھتی تھی۔ ماتحتوں سے آپ کا رویہ مساویانہ ہوتا اور مشاہرات ادا کر دیتے حوصلہ افزائی کرتے اور رواداری سے کام لیتے تھے۔ کہا کرتے تھے جو کتاب بھی مضمون کی تکمیل کے لیے درکار ہو خرید لو۔ ادارہ اس کی قیمت ادا کرے گا۔ اس دوران جو مسائل درپیش ہوتے انہیں سلجھا دیتے۔

ہر مصنف کو اپنی آزادانہ روش اختیار کرنے کی اجازت تھی۔ اس ہدایت کے باوجود اس ادارے نے قوم و ملک کے سامنے اتنا کچھ پیش کیا کہ کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ ۱۹۵۰ء میں یہ ادارہ

---

[1] مقالہ از حنیف ندوی صاحب ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۱۰

[2] مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ تیسرا سال ش ۱ جون جولائی اگست ص ۲۲۳

قائم ہوا اور ۱۹۵۹ء میں جب خلیفہ صاحب کی وفات ہوئی تو چون کتابیں طبع ہو چکی تھیں اور پانچ زیرِ طبع تھیں۔ بارہ مسودے طبع ہونے کے لیے رکھے تھے۔

اسلام کے بارے میں خلیفہ صاحب کے احساسات

بحیثیت مسلمان انھیں اسلام اور رسولِ خدا سے گہرا لگاؤ اور پورا پورا اعتماد تھا۔ آپ کی زندگی از اوّل تا آخر مذہب ہی سے اکتسابِ روحانی کرتی رہی۔ ظاہری طور پر وہ مذہب کے پابند نظر آتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی فکری قوتوں سے مذہب کی روح کو پالیا تھا۔ آپ کے خیالات اور افعال آپ کے نظریۂ زندگی کے عین مطابق تھے۔ ہر شعبے میں خدا پر ایمان کا ثبوت ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ دنیوی زندگی کا بڑے سے بڑا نقصان آپ کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکتا تھا۔

اس سے انکار نہیں کہ آپ کا رہن سہن مغربی وضع کا تھا۔ مگر آپ کے پہلو میں جو دل دھڑکتا تھا وہ سرورِ دو جہاں رحمت اللعالمین کی محبت سے سرشار تھا۔ عطائے لم یزل کے ایمان کا سر چشمہ تھا۔ رومی، غزالی اور اقبال کے افکارِ عالیہ کا ضامن تھا۔

ایک بار سرسید کے اسلام پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے انہی کی پُر زور حمایت کی۔ اور سرسید کے قیامِ انگلستان کا واقعہ بیان کیا۔

دیکھیے انھوں نے مارگولیتھ کی کتاب کا جواب دینے کے لیے لکھا کہ گھر کا اثاثہ بیچ دو، تاکہ میں دفاعِ اسلام کے فریضہ کو پورا کر سکوں اور قیامت کے روز فخر سے حضورؐ کے سامنے کہہ سکوں کہ آپ کا حقیر غلام آپ کی محبت میں اتنا پختہ ہے کہ جس نے مفلس ہونا پسند کیا مگر آپ کے وقار پر آنچ نہ آنے دی۔

یہ قصہ بیان کیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جب بھی حضورؐ کا ذکر آتا آپ آبدیدہ ہو جاتے۔ اسلام کی محبت میں اس قدر سرشار تھے کہ اگر کوئی متعصب قسم کا یورپین عیسائی اعتراض کر دیتا تو آپ کی رگِ اسلامیت پھڑک اٹھتی۔ روشن خیالی تو ایک طرف اس وقت اسلام کے قدامت پسندانہ تصورات کی تائید بھی کر جاتے اور

ہر اعتراض کے جواب میں دلائل کے انبار لگا دیتے۔ حالانکہ عام حالات میں وہ ان کے قائل نہ تھے[1]۔"

آپ یورپ اور امریکہ میں عیسائیت کے بے شمار فرقوں کی باہمی کشمکش اور اختلاف کا تفصیلی تذکرہ دلائل کے ساتھ کرتے اور چونکہ یہ ان کا ذاتی مشاہدہ تھا اس لیے مخالفین خاموش ہو جاتے۔

ایک دفعہ ترکی کے وفد نے قرآن حکیم کے قانون وراثت کے خلاف لڑکوں اور لڑکیوں کے مساوی حقوق وراثت کی تائید شروع کر دی ۔ ۔ ۔ آپ نے دلائل کا انبار لگا دیا۔ زبان میں روانی اور کاٹ تھی، اور گفتگو میں بہتے پانی کی روانی[2]۔"

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا یہ عالم تھا کہ کبھی اس راہ میں نہیں ڈگمگائے۔ آپ کہا کرتے تھے۔

"اللہ تعالیٰ سے ہمارا سمجھوتہ ہے کہ ہم حرص و ہوس کے دائروں کو وسیع نہ ہونے دیں اور وہ ہماری ضروریات کو پورا کرتا رہے[3]۔"

آپ کے دل میں اسلام سے بے پناہ محبت تھی اور رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات سے بے انداز عشق تھا۔ اسلام کو دین کامل اور حضورؐ کو انسانیت کا اعلیٰ ترین مظہر سمجھتے تھے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ وہ حضورؐ کی سیرت اور ان کے کارناموں کو جدید علمی نقطۂ نگاہ سے پیش کریں چنانچہ عمر کے آخری ایام میں وہ اس کام میں مشغول تھے لیکن وقت نے مہلت نہ دی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

تبلیغ اسلام کا جذبہ

مسلم مسیحی تعاون کمیٹی کے سلسلے میں جب پاکستان کی طرف سے انھیں دوسری مرتبہ امریکہ میں اسلام اور پاکستان کے متعلق واقفیت بڑھانے اور اسلامی نظریات اس صورت میں پیش کرنے کے لیے بھیجا گیا کہ وہاں کے لوگوں کے دلوں میں جو غلط فہمیاں

---

[1] مقالہ از محمد حنیف ندوی صاحب صحیفہ مجلس شمارہ انجمن جولائی اگست ص ۲۲۸-۲۲۹

[2] مقالہ از خواجہ عبد الستار اقبال ریویو ج ۶ ش ۴ جنوری ۱۹۶۶ ص ۲۲-۲۳

[3] مقالہ از مولانا حنیف ندوی، ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۱۰

اسلام کے بارے میں موجود ہیں انہیں دور کیا جائے تو آپ نے وہاں اسلام کی تعلیمات ایسی خوبی اور ایسے مسحور کن انداز میں پیش کیں کہ سامعین قلب و نظر کی گہرائیوں تک متاثر ہو گئے۔ ان میں سے اکثر نے عمر بھر کبھی مسلمان کو دیکھا نہ سنا تھا۔

پاکستان میں بھی خلیفہ صاحب غیر ملکی لوگوں کو درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ہفتے میں دو بار خلیفہ صاحب کے ہاں آتے۔ سب پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ تھے۔ یہ درسِ قرآن بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھا۔ اس میں سب لوگ اپنے اپنے شکوک پیش کیا کرتے تھے۔ اس وقت آپ کی جامعیت دینی کا عجیب عالم ہوتا تھا۔ گویا معلومات و استدلال کا دریا بہہ رہا تھا۔ صرف بائبل کے حوالے نہ دیتے تھے بلکہ مغربی مورخین اور فلاسفروں کے اقتباسات دے دے کر ان شکوک کے شافی جواب دیتے تھے۔

ایک بار ایران سے دعوت آئی جس میں خدا کے ماننے والوں کا مذاکرہ رکھا گیا تھا تو آپ بھی شریک ہوئے ہر جگہ خوشی کے ساتھ گئے اور طرہ یہ کہ وہاں اسلامی تفوق کا جھنڈا نصب کر کے آئے۔

"جس نے اسلام کے بارے میں شکوک پیش کیے، آپ نے اسے مطمئن کر دیا اور بتایا کہ تم اسلام کی دعوت آج دے رہے ہو، مگر قرآن یہ دعوت تیرہ صدیاں پہلے دے چکا ہے۔"[1]

شخصیت اور وسیع النظری

آپ کی شخصیت نہایت ہی بالا تر تھی اور اس لیے بیرونی ممالک میں بطور مبلغ بھیجے گئے اور ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو مشرق و مغرب دونوں کے علوم، مذاہب اور تہذیب و تمدن سے واقف ہو اور ان حقائق کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کر سکتا ہو جو دنیا کے مختلف مذاہب میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ آپ چونکہ مذہب کی اصل روح سے واقف تھے اس لیے دوسرے مذاہب کی بابت آپ کا نظریہ ہمدردانہ تھا اور وہ اس رویے کو اسلام کا لازمی جزو سمجھتے تھے۔

---

[1] مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ تیسرا سال نمبر انجمن جولائی اگست ص ۳۴۱

گرما گرم بحثوں میں جو تعصب سے خالی نہ ہوتیں آپ اعتدال پسند واقع ہوئے تھے۔ سبھی اصحاب کو دینی مسائل میں اظہارِ خیال کا موقع دیتے۔ انھوں نے قرآنِ حکیم کی تعلیمات میں آفاقی رجحانات کی سراغ رسانی کی تھی۔ آپ دنیا کی تمام اقوام کے لیے ہمدردانہ جذبہ رکھتے تھے۔ آپ کا مسلک صوفیانہ تھا۔ آدمی کو انسانیت کی بنیادوں پر پروان چڑھتا دیکھنا چاہتے تھے۔

ذوقِ تصوف

خلیفہ صاحب صوفی نہ تھے لیکن صوفیانہ رجحانات ان کی فطرت میں پوشیدہ تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ میں رحمان و رحیم کی اولاد ہوں۔ دراصل اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمدردی، محبت اور نیکی کا جوہر ان کو ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے ہاں خشک علمی تحقیق مدت سے ناپید تھی۔ موضوع کیسا ہی ادق کیوں نہ ہو۔ دلائل کیسے ہی وزنی اور گمبھیر کیوں نہ ہوں ان کے زورِ تخیل کی رنگینی اور لطیف قوتِ حاسہ کے عمل سے کبھی بھاری نہ ہوتے۔ علم کے دو دشت و بحر سے گزر کر اب ان کی روح ایک ایسی وادی سے گزر رہی تھی جہاں سکونِ خاطر و طمانیت کا سامان میسر آتا ہے۔ اگرچہ وہ علمی طور پر اس کے قائل تھے۔ کہ اسلامی تصوف کی تعمیر میں قبل از اسلام تحریکوں کا بڑا اثر ہے پھر بھی تصوف کی اسلامی روح سے بہت متاثر تھے۔ اعلیٰ اقدارِ تصوف کے وہ بہت قائل تھے بلکہ کہتے تھے۔

”کسی انسان کی معقولیت پرکھنے کے لیے میں سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں کتنا اور کس نوعیت کا ذوقِ تصوف موجود ہے۔“[1]

آپ اکثر دوستوں سے تصوف کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے اور کشف و کرامات کے بارے میں کہتے تھے ”علم و ادراک کی یہ صورت ——————

”سائنس بن جائے گی۔ انسانی ترقی یا کرامات کوئی کمال نہیں، ان کے ہونے یا نہ ہونے سے

---

[1] مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ تیسرا سال ش انجمن جولائی اگست ص ۳۹۔

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہی بلند انسان ہے جس کے اندر روحانی و اخلاقی اقدار موجود ہیں۔[1]

فقر و درویشی کو صرف مسلمان قوم کی جاگیر نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ کہتے تھے جس طرح بلند انسان فرقہ دارانہ جھگڑوں سے بلند تر ہوتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ صوفی بھی قومی تعصبات سے بالاتر ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وحید الدین سلیم پانی پتی ہی نے خلیفہ صاحب کو تصوف کی طرف رغبت دلائی جو خلیفہ صاحب کے ساتھ ہی جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے۔ مولوی سلیم کی بیوہ والدہ حضرت غوث علی شاہ کے پاس خدمت گار کے طور پر رہتی تھیں اور مولوی سلیم خلیفہ صاحب کو آنکھوں دیکھے تجربات اور مشاہدات بتایا کرتے تھے اور خلیفہ صاحب ان واقعات کی نفسیاتی تشریح کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر اپنے یقین کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔

ہر شخص کے اپنے ذاتی تجربات ہوتے ہیں اور اسی طرح خلیفہ صاحب ذاتی مذہبی تاثرات رکھتے تھے۔ مگر ان میں یہ بات ضرور تھی کہ ان کا طرز تکلم، علم اور تجربہ قابل رشک تھا۔ وہ عجمی اور غیر قرآنی تصوف کی آمیزش کو ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ چیز اہل عرب سے زیادہ اہل عجم کے حصہ میں آئی ہے۔ تصوف پر گھنٹوں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ مجیب ملک صاحب کے والد محترم کے ساتھ قاضی محمود سلطان کی زیارت کو گئے۔ تو رستے میں قرآن، حدیث، دوزخ، جنت اور موت و زندگی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور یہ شعر گنگناتے رہے۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی　　　یاد یار مہرباں آید ہمی

آپ کو یہ دوہا بھی بہت پسند تھا اور اکثر اسے پڑھتے رہتے تھے

بھوکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گدڑی میں لال
گرہ کھول نہیں جانتے اس لیے ہیں کنگال

غرض خلیفہ صاحب جہاں جدید تعلیم سے بہرہ مند تھے۔ وہاں تصوف اور صوفیا کے بھی

---

[1] مقالہ از محمد جعفر پھلواری صحیفہ سہ ماہی ش ۱۱ جلد جولائی اگست ص ۲۲۹

بے حد قائل تھے، اور اسی سلسلہ میں بعض ایسی چیزوں کے بھی قائل تھے جن کی توقع عام حالات میں ان سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مثلاً وہ کہا کرتے تھے۔ کہ عالمِ ہست و بود صرف مادیت ہی پر مبنی نہیں ہے اور جو کچھ بھی یہاں ہے مادہ ہی کے اظہار و نمود کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ روحانی عالم بھی آباد ہے جس کا اس عالمِ اسباب سے گہرا تعلق ہے۔

ایک تاثر

ڈاکٹر ہربرٹ اینڈرسن آپ کو ایک عظیم شخصیت جانتے ہیں۔ ڈاکٹر جوزف شاخت لکھتے ہیں "میں خلیفہ صاحب سے ایک مرتبہ ملا میرے دل پر آپ کی یاد اور قدر و منزلت ہمیشہ قائم رہے گی[1]"

ڈاکٹر برنارڈ ڈیرس لکھتے ہیں

"خلیفہ صاحب کا ساتھ اگرچہ بہت کم عرصہ رہا لیکن میں ان کے علم و فضل سے متاثر ہوا تھا اور ان کے خلوص کا دل سے قائل ہوا"۔ ڈاکٹر طیبی ماسی نون نے بھی خلیفہ صاحب کی صداقت شعاری اور ان کی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

فصیح علی کاشف الغطا ثقافت میں لکھتے ہیں "خلیفہ صاحب کی شخصیت سے حیات نو نمائی کے شعلے بھڑکتے تھے۔ اسے ادب و کمال کے ایک مثالی پیکر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کی حکمت کے نور سے زندگی کی راہیں چمک اٹھتی تھیں۔ آپ نے کردار، گفتار، عمل اور نظم کی لطافت سے حالات کا سختی سے مقابلہ کیا۔ میں نے مرحوم کو مکارم فضائل کا مجموعہ اور اعلیٰ ترین عادات و اطوار کی دنیا پایا۔ آپ کی شخصیت خوبیٔ علم اور کمالِ منطق یا علم و منطق کا ایک حسین امتزاج تھی۔ موصوف کی تالیفات و تصنیفات میں عمق فکر، کمالِ علم اور بلاغت تحریر کا کامل نمونہ ہے۔ آپ نقیدالمثال فلسفی اور عدیم النظر حکیم تھے[2]"

---

[1] یادگار ملاقاتیں از ڈاکٹر جوزف شاخت ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ ص ۲۷

[2] مقالہ از فصیح کاشف الغطا۔ ثقافت ج ۸ ش ۶-۷ جون جولائی ۱۹۶۰ ص ۳۱

آپ کی زندگی کا نصب العین بقول مولانا حالی یہ تھا ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

زندگی کے کسی لمحے آپ نے اکتاہٹ محسوس نہ کی۔ بیشتر اوقات مطالعے کے ذریعے مفکرین کی صحبت میں رہتے اور پہاڑ پر جاتے تو ایک آدھ تصنیف ضرور مکمل کر لیتے۔ کہنا چاہیے کہ عالم، استاد، دوست، شہری ہر حیثیت سے ان کی زندگی قابلِ رشک اور قابلِ فخر تھی۔

باب سوم

خلیفہ صاحب کا اسلوبِ تنقید

اردو تنقید کی تاریخ میں خلیفہ صاحب کی تنقیدی حیثیت ہر چند کہ زیادہ نمایاں نظر نہیں آتی اور وہ نقاد سے زیادہ فلسفی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں تاہم رومی غالب اور اقبال کے افکار و نظریات پر گرانقدر تنقیدی کتب لکھ کر وہ اس میدان میں مخصوص نام پیدا کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے فلسفہ ان کی زندگی تھا اور ادب ان کا ذوق۔

خلیفہ صاحب کی تنقید جرمن نقاد اسکا لجر اور مشرقی نقاد امداد امام اثر (مصنف کاشف الحقائق) سے مشابہ ہے۔ یہ دونوں نقاد بھی تشریحی تنقید کے حامی رہے ہیں۔ امداد امام اثر کے ہاں تو تشریحی تنقید کے ساتھ ساتھ تقابلی تنقید بھی نظر آتی ہے۔

خلیفہ صاحب نے افکارِ غالب، فکرِ اقبال، تشبیہاتِ رومی اور حکمتِ رومی میں غالب اقبال اور رومی کے افکار کی تشریح بہت دلکش تنقیدی اسلوب میں کی ہے اس بات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ یہ کتابیں ضخیم ہیں پھر بھی پڑھنے والا شگفتگی تحریر کی وجہ سے اکتاتا نہیں بلکہ ایک نیا لطف محسوس کرتا ہے۔

تشریحی تنقید میں تنقید نگار موضوع تنقید کے علاوہ کچھ اپنے خیالات بھی پیش کرتا ہے۔ اس طرح فکرِ اقبال اور افکارِ غالب، میں خلیفہ صاحب نے اقبال اور غالب کے علاوہ اپنے خیالات بھی بین السطور پیش کیے ہیں۔ خاص طور پر فکرِ اقبال میں خلیفہ صاحب کے ذاتی نظریات و خیالات تو عام اقبال کے خیالات سے یوں ہم آہنگ ہیں کہ دونوں کا الگ الگ کرنا بہت مشکل ہے اور کیوں نہ ہو دونوں فلسفی دونوں میں علم و ادب کا ذوق رچا ہو۔ دونوں مشرقی و مغربی علوم کے شناور، دونوں کی فکری سطح بلند

اور دونوں میں ذوقِ اجتہاد ظاہر و باہر ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد خلیفہ صاحب کی تنقیدی کُتب کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

حکمتِ رومی

خلیفہ صاحب کو رومی سے خاص لگاؤ تھا، جس کا اظہار ان کی کتابوں رومی کی مابعد الطبیعات، تشبیہاتِ رومی اور حکمتِ رومی سے ہوتا ہے۔

حکمتِ رومی میں رومی کی مثنوی میں پوشیدہ اسرار کو آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مثنوی مطالب کے لحاظ سے ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں، لیکن خلیفہ صاحب نے ان اسرار و رموز کی جو مفکرانہ تفسیر کی ہے وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔

بقول بشیر احمد ڈار مولانا روم نے تمام حقائقِ عالیہ کو جو ان کے ذاتی اور نفسی تجربات پر مبنی تھے۔ چند حکایتوں اور کہانیوں کے لباس میں پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں قرآنِ حکیم کی اچھوتی تفسیر بھی ملتی ہے۔ مختلف احادیثِ نبوی کی تشریح بھی اور اسرارِ حیات کی عقدہ کشائی بھی ہے اور اس کوشش میں انسان کی عقلی کم مایگی کا اقرار بھی، علم و حکمت کی گہرائیوں میں غوطہ زنی بھی ہے اور گوہرِ مراد تک پہنچ کر اپنی کم فہمی کا عاجزانہ احساس بھی۔ خاک کے اس ڈھیر میں چنگاریوں کو تلاش کرنا اور چھلکوں سے قطع نظر کر کے مغز تک جا پہنچنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم سے بہتر اس دور میں شاید ہی کوئی اور شخص اس کام کو پوری طرح نبھا سکتا۔

رومی سے خلیفہ صاحب کا تعلق بلا واسطہ بھی ہے اور اقبال کے واسطے سے بھی ہے۔ اسی واسطے کے تحت خلیفہ صاحب کی بلند پایہ تصنیف حکمتِ رومی معرضِ وجود میں آئی۔ یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی۔ ۲۹۷ صفحات کی یہ کتاب علم و حکمت کے جواہر ریزوں سے بھرپور آنکھوں کو خیرہ اور دماغ کو روشن کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔

اس کتاب کا دیباچہ جس کا عنوان ہے "آغاز" ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد سات معرکہ آرا ابواب ہیں۔

۱۔ عشق

۲۔ وحی و الہام

۳۔ وحدت الوجود

۴۔ آدم

۵۔ صورت و معنی

۶۔ عالمِ اسباب

۷۔ سلسلہ علت و معلول

۸۔ جبر و قدر

"آغاز" میں خلیفہ صاحب نے بتایا ہے کہ مثنوی کے بارے میں لوگوں کی کیا رائے ہے۔ مولانا روم نے مثنوی میں کیا کیا مضمون ادا کیے ہیں اور ان کو کس طرح تشبیہات سے واضح کیا ہے۔ خلیفہ صاحب نے مولانا روم کے مضامین اور ان کے افکار بڑے اچھے تشریحی انداز میں پیش کیے ہیں۔ اور ان کے افکار و نظریات واضح کرنے کے لیے حافظ ذوق، غالب اور اقبال کے اشعار اور دوسرے مفکرین کے خیالات تقابل کے طور پر پیش کیے ہیں۔ "آغاز" میں خلیفہ صاحب نے مثنوی کے بارے میں یہ رائے پیش کی ہے۔

"تمام مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی وسعتِ نظر نے ان کو حقیقت شناس کر دیا ہے اور چونکہ وہ حقیقت کے کسی پہلو سے گریز نہیں کرتے تھے اس لیے تمام فرقوں کے پیرو ان کے بیانات سے اپنے لیے سند حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جزوی طور پر ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔"[1]

خلیفہ صاحب مثنوی معنوی کو کئی حیثیتوں سے تفسیر قرآن سے مماثلت دیتے ہیں۔ خلیفہ صاحب اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ تمام فرقے مثنوی سے سند حاصل کر کے

---

[1] حکمت رومی از خلیفہ عبدالحکیم ۔ ص ۷

اپنے عقائد کا اثبات کرتے ہیں

علاوہ ازیں مولانا روم نے جو اشعار پہلے صفحے پر پیش کیے ہیں وہ اسی طرح تمام مثنوی کا خلاصہ اور عطر ہیں جس طرح سورۃ فاتحہ پورے قرآن کا نچوڑ ہے۔ حکمت رومی کے "آغاز" میں اس بات کو خلیفہ صاحب یوں بیان کرتے ہیں۔

"قرآنِ کریم کا انداز اختیار کرتے ہوئے مثنوی کو بھی اس طرح شروع کیا گیا ہے کہ جس طرح سورت فاتحہ تمام قرآن کی تمہید اور کتاب حکیم کا لب لباب ہے۔ اسی طرح روح کو بانسری سے تشبیہ دے کر تمام عرفان و تصوف کا خلاصہ پہلے صفحہ پر چند اشعار میں پیش کر دیا ہے۔ مثنوی کے تمام دفتر انہی اشعار کی شرح ہے"[1]

اس حصے میں خلیفہ صاحب نے مولانا روم کے روحِ انسانی، مثنوی کا آغاز اور انجام، وحدت الٰہی، موسیقی یا نغمۂ عشق اور اسی قسم کے دیگر عارفانہ افکار و نظریات کو موضوعِ سخن بنا کر انھیں بڑی اچھی طرح تشبیہات، مفکرین اور شعرا کے تقابل سے پیش کیا ہے۔

"آغاز" کے بعد جو باب ہے اس کا عنوان ہے "عشق" خلیفہ صاحب نے کہا ہے کہ عشق رومی کا اہم ترین موضوع ہے اور ان کی تمام مثنوی عشق اس کے مختلف مدارج کی تفسیر نظر آتی ہے۔ بقول خلیفہ صاحب کہ مولانا روم کے نظریہ حیات کا لبِ لباب یہ ہے کہ روحوں کا اصلی مرکز اور منبع ذات الٰہی ہے۔ کسی ناقابلِ فہم حکمت اور ناقابلِ ادراک مشیت سے یہ ارواح اپنی اصل سے الگ ہو گئیں اور فراق پانے کی وجہ سے ہر روح بیتاب ہے اور واصل باللہ ہونا چاہتی ہے۔ ہر روح اپنی اصل کی جانب کشش محسوس کرتی ہے اس کا نام عشق ہے۔ تمام حیات و کائنات اسی جذب و کشش کا مظہر ہے۔ روح اور وجود پر بحث کرتے ہوئے خلیفہ صاحب نے مقامات تصوف کے مختلف مدارج کو بیان کیا ہے۔ عالمِ ارواح، وجودِ حقیقی اور خالقِ روح مختلف

---

[1] حکمت رومی از خلیفہ عبدالحکیم - ص ۷

روحانی مقامات ہیں جو صفاتِ ابدی اور صفاتِ الٰہی کے تعلقات واضح کرتے ہیں عقل اور عشق پر بحث کرتے ہوئے خلیفہ صاحب نے کہا ہے کہ مولانا روم کے نزدیک عقل کا کمال یہ ہے کہ وہ عقلِ نبوی کا درجہ حاصل کرے اور عشق کا کمال یہ ہے کہ وہ حقیقتِ روحی کی تفسیر بن جائے۔ عقل، عشق اور قلب کے مختلف مقامات صوفیانہ اور فلسفیانہ اصطلاحات میں خلیفہ صاحب نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

تیسرا باب "وحی والہام" کا ہے۔ خلیفہ صاحب نے کہا ہے کہ مولانا روم وحی و الہام میں فرق نہیں کرتے۔ وہ الہامات کے لیے یا ماورائے عقل و حس یا بصیرت کے لیے وحی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حواسِ باطنی کو بھی اقسامِ وحی میں ایک قسم ظاہر کرتے ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ علوم و فنون مثلاً علمِ طب بھی وحی سے پیدا ہوتے ہیں۔ وحی کا محل قلبِ انسانی ہے اور قلبِ انسانی قلبِ ملکوتی ہوتا ہے۔ وحی کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے خلیفہ صاحب نے مختلف صوفیوں کے نظریات پیش کیے ہیں اس میں بعض صوفی وحی کو معروضی حقیقت سمجھتے ہیں، مگر اُسے خانہ ساز موضوعی قرار دیتے ہیں۔ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کا نظریہ خلیفہ صاحب نے حکمتِ رومی میں پیش کیا ہے۔

"رسولوں کو جو جبرئیل کی صورت نظر آتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ انھیں خدا کا پیغام پہنچا رہے ہیں تو حقیقت جبرئیل خود رسولوں کی روحانی قوتوں میں سے ایک قوت ہے۔ عالمِ مثال میں یہ حقیقت ایک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حقیقت جو روحِ نبوی میں مکنون اور مخفی ہوتی ہے۔ وہ متمثل اور مشہود ہو جاتی ہے اور پیغامِ حق پہنچاتی ہے۔ رسول کسی دوسرے سے نہیں بلکہ خود اپنی ذات سے مستفیض ہوتا ہے۔ رسول جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے وہ اس کے اپنے باطن کے خزانے ہی سے نکلتا ہے[1]"

الہامِ اولیا اور الہامِ شعرا مختلف مدارج کے ساتھ انھیں سلسلوں کی کڑیاں ہیں خلیفہ صاحب نے صوفیا کے ان حقائق کو جدید نفسیات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

---

[1] حکمتِ رومی از خلیفہ عبدالحکیم۔ ص ۹۰

تحت الشعور لاشعور اور فوق الشعور کی اصطلاحیں اسی باب میں بیان کی گئی ہیں اور صوفیا کے تجربات و نظریات کو جدید علوم کی روشنی میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے چوتھا باب وحدت الوجود کا ہے۔ وحدت الوجود کا مسئلہ صوفیا کا اہم ترین مسئلہ ہے اس پر اختلاف اور مفاہمت کے بے شمار مباحث سامنے آتے ہیں۔ خلیفہ صاحب کا کہنا ہے کہ اسلامی نظریہ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں۔ جو کچھ ہے اس کی ذات کا مظہر ہے۔

وحدت الوجود کے پیروکار صوفیا میں رومی کا درجہ بہت بلند ہے۔ وحدت الوجود کا فلسفہ اقوامِ عالم میں ہر مذہب کے ہاں موجود ہے حتیٰ کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف مذاہب میں اس کے نقوش مختلف ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے ہاں یہ نظریہ وحدانیت بدھ مت کے نظریہ وجود سے اور یونانی فلاسفہ کی تعلیمات سے بالکل جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ وحدت الوجود کے فلسفے پر بحث کرتے ہوئے خلیفہ صاحب نے مفتاح العلوم کے مصنف مولوی محمد نذیر صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"وحدت الوجود کے قائل صوفیا کہتے ہیں کہ وجود مطلق ایک ہی ہے جو وجوب و امکان قدیم و حادث، مجرد جسمانی۔ مومن و کافر طاہر و نجس وغیرہ مختلف مظاہر میں ظاہر ہے۔ لیکن ہر مظہر کا حکم جدا ہے اور مظاہر کے احکام میں فرق قائم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مومن کے لیے نجات کا حکم ہے اور کافر کے لیے قتل و قید کا حکم ہے[1]"

خلیفہ صاحب نے ان مباحث میں تصوف کے بارے میں مختلف گروہوں کے حوالے دیے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کے فتاوائے عزیزی قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا رسالہ وحدت الوجود احسن کا کوروی اور شیخ ولی محمد وغیرہ کی تصنیفات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تقابلی مطالعہ کے لیے مغربی متصوفین کے حوالے بھی دیے ہیں۔ ولیم جیمز امریکی فلسفی اور شوپن ہار کے حوالے اس سلسلے میں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں

---

[1] حکمت رومی از خلیفہ عبدالحکیم ص ۱۰۸

شوپن ہار کہتا ہے کہ وحدت الوجود کا نظریہ الحاد کی شاعری ہے۔ اور امریکی فلسفی ولیم جیمز کہتا ہے کہ وحدت الوجود اخلاقی تعطیل ہے یعنی ذات واحد کے لازمی مظاہر ہونے کی وجہ سے خیر و شر کا باہمی امتزاج محض اعتباری رہ جاتا ہے۔[1]

وحدت الوجود کے خلاف مسلمان صوفیہ کے مباحث بھی کچھ کم نہیں۔ اس فلسفے کے متوازی ایک دوسرا فلسفہ قائم کیا گیا جسے وحدت الشہود کہا جاتا ہے۔ توحید وجودی اور توحید شہودی کے قائل مسلمان صوفیہ کے دو الگ الگ گروہ ہیں۔ توحید شہودی کا مطلب یہ ہے کہ عالم خدا کی صفات کا مظہر ہے۔ وہ خدا اور موجودات کو دو الگ الگ حقیقتیں تسلیم کرتے ہیں۔ وحدت الشہود کی مثالیں ایران میں شیخ سمنانی اور ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی رح کی تعلیمات میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

پانچواں باب آدم کے بارے میں ہے۔ خلیفہ صاحب نے کہا ہے کہ مقام آدم کے بارے میں مولانا روم کا نظریہ تمام فلسفیوں سے جداگانہ ہے۔ انسان فکر و عمل اور جذبات و عقائد کا مجموعہ ہے اور خلیفۃ اللہ اور ملک کا مسجود ہے۔ مولانا روم نے آدم کی حقیقت قرآنی تعلیمات کے مطابق بیان کی ہے۔ عقل کے مختلف مدارج میں عقل انسانی سے لے کر عقل الٰہیہ کے مدارج کو انسانی ارتقا کا زینہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں نطشے اور ڈارون کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے خلیفہ صاحب نے بیان کیا ہے کہ نطشے یا برگساں انسان کی تفہیم میں اور انسان کے تمام مدارج کے تعین میں رومی کی گرد تک نہیں پہنچ پاتے۔ انسان جس قدر باطن کو صاف کرتا ہے اسی قدر اس کی آگاہی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خلافت ربانی کی منزلت حاصل کر لیتا ہے۔ مولانا روم کے نظریات کو صحیح طور پر اگر کسی نے سمجھا اور پرچار کیا ہے تو وہ اقبال ہیں۔ عظمت آدم کا جو نظریہ اقبال نے پیش کیا ہے وہ رومی سے فیض یافتہ ہے اور خلیفہ صاحب نے رومی اور اقبال کے نظریات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔

---

[1] حکمت رومی از خلیفہ عبدالحکیم ص ۱۱۲، ۱۱۳

حکمتِ رومی کے چھٹے باب کا عنوان ہے "صورت و معنی" اس باب میں خلیفہ صاحب نے واضح کیا ہے کہ مولانا روم صورت اور معنی کو دو مستقل حقیقتیں سمجھتے ہیں اور ان کی ہم آہنگی اور یک رنگی کو کمالِ انسانی تصور کرتے ہیں۔ اہلِ ظاہر صورت اور جسم کے سراب کو عین حقیقت سمجھتے ہیں۔ لیکن اہلِ باطن صورت کے پیچھے معنی اور جسم کے پیچھے مقصود تجسیم یعنی روح کی تلاش کرتے ہیں۔ صورت سراب دھوکا یا واہمہ ہو سکتی ہے معنی سراب نہیں ہوتے۔ صورت و معنی کے فلسفے پر بحث کرتے ہوئے خلیفہ صاحب یہاں اس فلسفے کا مثنوی مولانا روم پر اطلاق کرتے ہیں، وہاں لکھتے ہیں۔

"مولانا روم کا صورت و معنی کا فلسفہ تمام تر ماہیت روح پر مبنی ہے۔ ان کے نزدیک روح کی حقیقت نورِ شعور ہے۔ شعور ذات سے لے کر دیدار وصال ذات واجب تک ترقی کرتا ہے۔ یہ نورِ شعور اپنے ارتقا میں مختلف قالب اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ ہر منزل پر اس کو نئے حالات کے لیے نئے آلات کی ضرورت پڑتی ہے"[1]

صورت و معنی کا رشتہ اس نوری شعور اور قالب کا رشتہ ہے۔ خلیفہ صاحب نے مثنوی کے بے شمار اشعار صورت و معنی کے اس فلسفے کی وضاحت میں پیش کیے ہیں اور ان کی تشریح میں معارف کے دروازے کھول دیے ہیں۔ ساتویں باب کا عنوان "عالمِ اسباب اور سلسلۂ علت و معلول" ہے۔ اس باب میں صوفیانہ اسرار اور قرآنی رموز کی سائنسی شہادتوں سے بحث کی گئی ہے۔ حکمائے طبیعیات نے طبیعیات وجود کے بارے میں جو موشگافیاں کی ہیں ان کا وقت نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور صوفیانہ نظریات میں حیاتِ انسانی کے مختلف عناصر کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

حکمتِ رومی کا آٹھواں اور آخری باب "جبر و قدر کے مسئلہ پر ہے۔ صوفیا کے ہاں بھی یہ اہم ترین مسئلہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خاصہ متنازع فیہ مسئلہ ہے۔ اس میں موافق اور مخالف مباحث کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ وجودی اور شہودی صوفیوں کے اپنے

---

[1] حکمتِ رومی از خلیفہ عبدالحکیم۔ ص ۱۷۱

اپنے نظریات میں غیر صوفی فلسفیوں کے معتقدات بالکل جداگانہ ہیں۔ خلیفہ صاحب نے مثنوی مولانا روم کے حوالے سے اس مسئلے پر بحث کی ہے ان کا کہنا ہے کہ مولانا روم کے ہاں اشاعرہ اور معتزلہ دونوں گروہوں کے نظریات میں یہ واضح رد عمل موجود ہے ان دونوں گروہوں میں مسئلہ "جبر و قدر" کی تفہیم میں نمایاں اختلاف موجود ہے اشاعرہ سے قبل معتزلہ متکلمین کے گروہ میں مسئلہ جبر و قدر پوری طرح مقبول ہو چکا تھا اور وہ جبر کے قائل ہو چکے تھے۔ اشاعرہ نے یہ نظریہ قائم کیا کہ

"خیر و شر تمام قسم کے افعال کا خالق خدا ہی ہے۔ لیکن جس فرد کے واسطے سے یہ اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ ان کو "کسب" کرلیتا ہے اور کسب کے واسطے سے وہ عذاب و ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے مثلاً چوری کا فعل ہے تو وہ خدا کا خلق کردہ ہے۔ لیکن چور اس کا کاسب ہے"[1]

معتزلہ کا گروہ اس کے برعکس حرکت پسند تھا اور اختیار کو اخلاق کے لیے لازمی سمجھتا تھا ان کے نزدیک "فطرت اللہ بے آئین نہیں ہو سکتی"[2]

ان کے نزدیک خدا تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ جسے چاہے بخشے جسے چاہے معتوب کرے۔ آدمی کے ارادے یا عمل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ مولانا روم نے اسی فلسفے کی تردید کی۔ انھوں نے اس فلسفے پر الزام لگایا کہ تقدیر پر راضی برضا ہونے کا عقیدہ آدمی کو بے حس کر دیتا ہے۔ مولانا نے جبریوں کے تمام دلائل کی مثنوی میں تردید کی ہے جسے خلیفہ صاحب نے اس باب میں مدلل طریقے سے پیش کیا ہے۔

حکمتِ رومی پر مجموعی رائے قائم کرنے کے لیے اردو کے مشہور نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ کے مندرجہ ذیل جملے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

"حکمتِ رومی اگرچہ رومی کے اسرار و رموز کو آشکار کرنے کی سعی ہے۔ مگر اس میں بھی خلیفہ صاحب کا اپنا میلانِ فکر نمایاں ہے۔ مثنوی رومی کو قرآن در زبان پہلوی قرار دیا گیا ہے اور اس معنی میں

۱۔ حکمتِ رومی از خلیفہ عبدالحکیم ص ۲۳۱

۲۔ ایضاً ص ۲۳۲

قرآن اور دین ہی کے معارف بیان ہوتے ہیں۔ مگر خلیفہ صاحب کا طریقہ کار یہ بتاتا ہے کہ وہ رومی کے افکار کے عقلی عنصر کو نمایاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھا ہے۔

"استقرائی اور استدلالی علم ایک تنظیمی قوت ہے جو محسوسات و مظاہر و حوادث میں ربط پیدا کرتی ہے۔ کائنات کے تمام مدارج میں نظم موجود ہے۔ اس لیے ہر درجے میں اس درجے کی عقل پائی جاتی ہے۔۔۔ اولیائے کرام نے عقل نبوی اور عقل ایمانی کو بھی ذکر کیا ہے۔"[1]

"اس طرح ان کے ہاں عقل کی برتری یا احاطہ کلی کی ایک صورت نمایاں ہے۔ غیر اس کو عقل کہیں یا ایمان۔ خلیفہ صاحب نے رومی کے عقلی عنصر کو اس کے ایمانی عنصر کے ساتھ تطبیق دی ہے اور مولانا روم کا از سر نو مطالعہ کیا ہے۔ رومی کے تمثیلی استقرا کی غیبی بیان کرتے ہوئے اس کی عقلی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ رومی پر خاص توجہ کرنے والوں میں شبلی اور اقبال دونوں کا درجہ بلند ہے۔ اقبال نے رومی کے فلسفہ عشق کو خاص طور سے ابھارا ہے۔ مگر خلیفہ صاحب نے رومی کی عقلیات کی خاص تنظیم کی ہے۔ جھکاؤ عقل کی طرف زیادہ ہے۔ یہ تنظیم شبلی کے تجزیہ رومی سے کہیں زیادہ باخبرانہ ہے۔ کیونکہ شبلی فلسفے کے جدید نظاموں سے بالواسطہ شناسائی رکھتے تھے اور ڈاکٹر خلیفہ صاحب اس کے ماہروں میں سے تھے۔"[2]

فکرِ اقبال

فلسفہ اقبال کے سلسلے میں لکھی جانے والی کتابوں میں خلیفہ صاحب کی فکرِ اقبال خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب بزمِ اقبال نرسنگ داس گارڈن کلب روڈ لاہور سے پہلی بار ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب کے صفحات ۶۷۸ ہیں۔ خلیفہ صاحب نے اس کتاب کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب اقبال کی شاعری کی ارتقائی منازل کا مجموعی احاطہ کرتا ہے۔ دوسرے تیسرے اور چوتھے باب میں اقبال کی شاعری ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک زیر بحث آئی ہے اس سلسلے

---

[1] مقالہ از ڈاکٹر سید عبداللہ ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ ص ۴۸، ۴۹

[2] ایضاً ص ۴۹

میں خلیفہ صاحب نے اقبال کی شعری تحریکات اور فکری صلاحیتوں کو سمجھنے کے لیے اقبال کی زندگی خاندانی حالات کو پس منظر میں رکھا ہے۔ اس زمانے میں اقبال کی شاعری سے جو مختلف مدارس وابستہ کیے ان پر عبدالسلام ندوی کی کتاب "اقبالِ کامل" اور عبدالمجید سالک کی کتاب ذکرِ اقبال بھی بحث کرتی ہیں لیکن خلیفہ صاحب کا تجزیہ مورخانہ نہیں فلسفیانہ ہے۔ انھوں نے اقبال کے زمانے سے ان کے فکر کی کڑیاں مرتب کی ہیں پھر ان کڑیوں کو اُن کے فلسفہ زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے اور یوں اقبال کی شاعری اقبال کا فلسفہ اور اُس کی زندگی ایک ہی حقیقت میں نظر آتی ہیں۔ پانچویں باب میں خلیفہ صاحب نے اقبال کے اُن نظریات کو پیش کیا ہے جو انھوں نے اسلام کی تفسیر اور تشریح کے لیے نظم بند کیے ہیں۔ چھٹا باب اقبال کے اُن افکار پر مشتمل ہے جس میں قوم کے لیے فلسفہ بیداری موجود ہے اور جن کے پیشِ نظر اقبال کو شاعرِ انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس میں سیدھا سادا "اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" کا لہجہ بھی موجود ہے اور تشبیہ استعارہ کے پردے میں اسلام اور روحانیت کی اعلیٰ علامتوں کے لیے بھی اقبال کا پیغام واضح طور پر موجود ہے۔ ساتویں باب میں اقبال نے مغرب کے ایسے افکار پر تنقید کی ہے جن میں قومیت اور تہذیب و تمدن کے انتقال کی تشریح کی گئی ہے۔ خلیفہ صاحب نے اقبال کے افکار کو پس منظر میں اسپنگلر اور ڈارون ہی کے نظریات کو خاص طور پر رکھا ہے۔

خلیفہ صاحب کا خیال ہے کہ اسپنگلر نے اپنی کتاب زوالِ مغرب میں جن نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے کچھ یوں ظاہر ہوتا ہے جیسے اسپنگلر قوم کی تعریف کرتے ہوئے صحت مند نظریات پیش نہیں کر سکے۔ اسپنگلر کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ کچھ امتیں بھی نباتی یا حیوانی وجود کی طرح پیدا ہوتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں۔ اقبال کو اس نظریہ سے اتفاق نہیں۔ خلیفہ صاحب کا کہنا ہے۔

"جب علامہ اقبالؒ کے سامنے یہ خیال پیش کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ درست ہے۔ امتوں کے لیے اجل تو ہے۔ لیکن اہلِ مغرب نے جو یہ خیال بھلا دیا ہے کہ کوئی

اُمتیں دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتیں یہ غلط ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ خیال زوال یافتہ مشرقی قوم کو مایوس کرنے کے لیے ان کے ذہنوں میں ڈالا گیا ہے۔ اسلام تو ساری دنیا کے مر کر دوبارہ زندہ ہونے کا قائل ہے وہ اُمتوں کی حیات ثانی کا کیسے منکر ہو سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ خزاں میں درختوں پر موت طاری ہو گئی ہے۔ لیکن بہار میں وہ پھر نئے برگ و بار پیدا کرتے ہیں[1]"۔

آٹھواں باب اشتراکیت کا ہے۔ اقبال مشہور اشتراکی فلسفی اور رہنما کارل مارکس کے نظریات سے کافی حد تک متاثر تھے۔ لیکن مارکسیت کے صرف ان نظریات کو قابلِ قبول سمجھتے تھے جن کا جواز اسلام میں موجود ہے۔ اسلام بھی انسانی مساوات اور رزق کی عادلانہ تقسیم کا قائل ہے۔ کارل مارکس کے جن نظریات میں رزق و معاش کا عادلانہ پرچار موجود ہے۔ ان پر دراصل اسلام ہی کی چھاپ نظر آتی ہے خلیفہ صاحب اقبال کے نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اقبال کے نزدیک اشتراکیت میں حق و باطل کی آمیزش ہے۔ اس میں جو دل کشی اور مفاد کا پہلو ہے۔ وہ حق کے عنصر کی وجہ سے ہے۔ دنیا میں رزق کی عادلانہ تقسیم عین دین ہے اور اس معاملے میں روس نے جو کوشش کی ہے۔ وہ سراہنے کے لائق ہے۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ انسان کی زندگی فقط روٹی سے نہیں، اُسے روحانی غذا کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان روح کے علاوہ جسم بھی رکھتا ہے اور نفس و بدن کا رابطہ کچھ اس قسم کا ہے کہ پیٹ میں روٹی نہ ہو تو انسان نہ حقوق اللہ ادا کر سکتا ہے اور نہ حقوق العباد۔ اسی لیے اسلام نے معاش و رزق کی عادلانہ تقسیم و تنظیم کو بھی جزو دین قرار دیا[2]"۔

خلیفہ صاحب نے اقبال کی مختلف کتابوں سے اقبال کے اُن نظریات کو ثابت کیا ہے۔ جن میں بانگِ درا، جاوید نامہ اور پیامِ مشرق خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] فکرِ اقبال طبع سوم ۱۹۶۴ء ص ۱۸۱، ۱۸۲

[2] فکرِ اقبال طبع سوم ۱۹۶۴ء ص ۲۴۵

فکرِ اقبال کے باقی ابواب اقبال کے شاعرانہ مرتبے کو سمجھنے پر صرف ہوئے ہیں ان میں اقبال کی زندگی، نظریات اور فن پر محاکمہ بھی ہے اور ان کی تشریح بھی مختلف عنوانوں کے تحت مثلاً جمہوریت، عقل پر انسان کی تنقید، عشق کا تصور، تصوف، اسرارِ خودی، اقبال اپنی نظر میں، گلشنِ رازِ جدید، فنونِ لطیفہ، ابلیس، رموزِ بے خودی وغیرہ پر خلیفہ صاحب کے حکیمانہ تاثرات کا مطالعہ اقبال کی اہم کڑیاں ہیں۔ انیسویں باب میں خلیفہ صاحب نے اقبال پر جو اعتراضات کیے گئے ان کا جواب دیا ہے اور ثبوت کے طور پر اقبال کے نظریات کو پیش کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک باب خلاصۂ افکار کا بھی ہے جس میں خلیفہ صاحب نے انہی ابواب میں بیان کیے گئے نظریات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال کے ان سات خطبات کا خلاصہ درج ہے جن کا اسلام کے جدید علم الکلام میں خاص درجہ ہے۔ ان خطبات میں علامہ نے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ عام قارئین کو اقبال کے فکر اور فلسفہ سے روشناس کرانے کے لیے خلیفہ صاحب کی یہ کوششیں بہت کامیاب اور مفید ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے جس زمانے میں یہ کتاب لکھی اس سے پہلے اقبال پر دو اہم کتابیں شائع ہو چکی تھیں جن میں ایک ڈاکٹر یوسف حسین کی "روحِ اقبال" ہے اور عبدالسلام ندوی کی "اقبال کامل"۔ ڈاکٹر یوسف حسین کی کتاب سے فکرِ اقبال میں جا بجا استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کا ثبوت "روحِ اقبال" کا پہلا باب "اقبال اور آرٹ" ہے اس باب کا عکس خلیفہ صاحب کی فکرِ اقبال میں متعدد مقامات پر نظر آتا ہے۔ ایک جگہ ڈاکٹر یوسف حسین صاحب نے لکھا ہے۔

"...گو اقبال کی زندگی میں مشرق و مغرب کے علم و حکمت کے دھارے آکر مل گئے ہیں اس کا کلام اس کے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس نے عہدِ جدید کے انسان کا جو تصور پیش کیا ہے جسے وہ مردِ مومن کہتا ہے وہ ایسا جاندار ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے"[1]

---

[1] روحِ اقبال از ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ مکتبہ جامع لمیٹڈ دہلی ۱۹۶۳ء ص ۱۸

خلیفہ صاحب نے فکرِ اقبال کی تمہید میں انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن اپنے اسلوب میں۔ پھر ڈاکٹر یوسف حسین سے کے ان جملوں کی گونج بھی خلیفہ صاحب کی کتاب میں اکثر سنائی دیتی ہے کہ

"اقبال کے نزدیک حسن اور صداقت ایک ہے۔ آرٹ کی اعلیٰ ترین قیمت یہ ہے کہ وہ روحانی اور اخلاقی قدروں کا احساس اور توازن ادراکِ حسن کے ذریعے پیدا کرتے ہیں[1]"

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی مدرسانہ زندگی کا ان کے اسلوب پر گہرا اثر ہے ان کا تنقیدی انداز تشریحی ہے۔ خلیفہ صاحب فلسفیوں کی طرح بات کو ارفع بنا کر پیش نہیں کرتے بلکہ عام فہم اور روزمرہ گفتگو کا لہجہ دیتے ہیں۔ مجھے خلیفہ صاحب کے ایسے دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو زندگی میں ان کی عالمانہ گفتگو سے استفادہ کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خلیفہ صاحب کی کتابیں پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی مجلس میں گفتگو کر رہے ہیں۔

فکرِ اقبال کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ایک نظر ان آرا پر بھی ڈال لی جائے جو مختلف نقادوں نے اس کتاب کے بارے میں دی ہیں۔

۱۔ "عابد علی عابد صاحب۔ کتاب کے سرسری مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب نے بڑی کاوش، محنت اور صبر سے کام لے کر اقبال کے مطالب و معانی کا تجزیہ کیا ہے۔ فکرِ اقبال کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس میں اقبال کی شعری تخلیقات سے لے کر علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا خلاصہ تک آ گیا ہے[2]"

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب "فکرِ اقبال حکیم مشرق پر شاید سب سے وسیع ترین کتاب ہے کیونکہ اس میں ناقد ایک فلسفی بھی ہے اور مفکر مذہبی بھی۔ ان دو شرطوں کو پورا کیے بغیر کوئی شخص اقبال کا صحیح ناقد بن نہیں سکتا[3]"

۳۔ پروفیسر حمید احمد خاں "فکرِ اقبال اس خاص موضوع پر ہمیشہ مستند کتاب مانی جائے گی[4]"

---

[1] روحِ اقبال از ڈاکٹر یوسف حسین خاں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۶۳ء ص ۲۳

[2] تبصرہ از عابد علی عابد صحیفہ ش ۲ ستمبر ۱۹۵۷ء ص ۲۵۷

[3] مقالہ از سید عبداللہ ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۴۹

[4] مقالہ از پروفیسر حمید احمد خاں ایضاً ص ۵۵

۴ — بشیر احمد ڈار: ان کی کتاب "فکر اقبال" اپنی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اقبالیات میں ایک بلند نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے اقبال کے فلسفہ کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے بنیادی فلسفہ اور اس سے مستنبط اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور دینی نظریات کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس کے آخر میں علامہ اقبال کے انگریزی لیکچرز "ری کنسٹرکشن" کے ہر باب کا ایک عمدہ خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔"[1]

۵ — رئیس احمد جعفری مرحوم: "فکر اقبال اپنے انداز بیان، اسلوب تحریر، فکر کی گہرائی، تخیل کی بلندی کی گہرائی اور فلسفہ اقبال کی وضاحت اور سحر طراز ترجمانی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب کو پڑھ لینے کے بعد اقبال کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔"[2]

ان اکابرین کے علاوہ ثقافت کے ایک اداریے میں "فکر اقبال" پر رسالہ برہان کی یہ رائے بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔

"یہ کتاب ایک ایسا صاف و شفاف آئینہ ہے جس میں علامہ اقبال کا چہرہ اپنے تمام خدوخال کے ساتھ مکمل طور پر سامنے آجاتا ہے۔ کتاب اگرچہ بڑی ضخیم ہے لیکن زبان و بیان اور انداز تحریر ایسا شگفتہ، رواں دواں اور دلچسپ ہے کہ پڑھنے والا ذرا نہیں اکتاتا بلکہ جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے اس کا ذوق اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی "روح اقبال" اور مولانا عبدالسلام ندوی کی "اقبال کامل" کے بعد اقبال پر یہ تیسری کتاب ہے جو بلحاظ ضخامت وسیع، جامع اور محققانہ ہے۔"[3]

افکار غالب

غالب اس کی زندگی اور اس کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ یادگار غالب سے لے کر اب تک سیکڑوں کتابیں اور مضامین شائع ہو

---

۱ بشیر احمد ڈار، ثقافت جولائی ۱۹۶۰ء ص ۹۱

۲ تبصرہ رئیس احمد جعفری ثقافت اگست بحوالہ رفتار ادب ۱۹۵۷ء ص ۵

۳ رسالہ برہان دہلی بحوالہ ماہنامہ ثقافت لاہور جنوری ۱۹۶۸ء ص ۷۲

چکے ہیں۔ ان میں بہت سی کتابیں غالب کی تائید و موافقت میں ہیں اور کچھ مخالفت میں لیکن افراط و تفریط کی مثالیں صرف دو ہیں۔ ایک طرف ڈاکٹر عبداللطیف ہیں جنھوں نے غالب کی شاعری اور فن کا مذاق اُڑایا ہے اور دوسری طرف ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہیں جو دیوانِ غالب کو الہامی کتاب قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے پہلی بار غالب کے فلسفیانہ اشعار کا مطلب فلسفہ جدید کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ لیکن کسی نے غالب کے فارسی اور اردو اشعار کی شرح اس انداز میں نہ کی تھی کہ اس کے فلسفیانہ یا حکیمانہ مطالب کے خدوخال نکھر کر سامنے آجائیں۔ اس کمی کو خلیفہ صاحب نے اپنی کتاب افکارِ غالب میں پورا کیا ہے۔ خلیفہ صاحب چونکہ فلسفہ پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ شعر و سخن کا بھی صحیح ذوق رکھتے تھے۔ اس لیے یہ کام اُن سے اچھی طرح بن آیا ہے۔

خلیفہ صاحب کی فلسفیانہ نظر نے غالب کے افکار کو مربوط طریقے سے پیش کر کے غالب کے نظامِ فکر کو ایک مرتب اور متعین صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ بعض نقادوں کے نزدیک افکارِ غالب کو اس سلسلے کی کامیاب کڑی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں تشریحی مواد تنقیدی مواد سے کہیں زیادہ ہے لیکن چونکہ خلیفہ صاحب کا شاعرانہ ذوق، اُن کا فلسفیانہ تجزیہ اور قوتِ نقد سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں چونکہ اس کتاب میں ان تینوں باتوں کا حسین امتزاج ہے اس لحاظ سے اس کو نئی تلاش کہہ سکتے ہیں۔ دیکھیے تو اس میں تشریح و تنقید کا خاص تناسب مقرر کرنا مشکل ہوگا۔ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے جو پہلی بار دسمبر ۱۹۵۴ء میں مکتبہ معین الادب سے شائع ہوئی اور پھر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۵ اپریل ۱۹۶۳ء کو شائع ہوا۔ اس کتاب کے ۵۰۰ صفحات ہیں اور تقطیع $\frac{18 \times 22}{8}$ ہے۔

خلیفہ صاحب نے اپنی تالیف کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ مقدمہ

۲۔ غالب کے منتخب حکیمانہ اشعار کی شرح

۳۔ فارسی کلام میں سے حکیمانہ اشعار کا انتخاب اور ان کی مختصر شرح

۴۔ طوفانِ آرزو۔

۵۔ متفرق اشعار
۶۔ منتخب رُباعیات

خلیفہ صاحب کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہمیں کتاب کے مُقدمے سے ہی ہو جاتا ہے جس میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فلسفیانہ اور حکیمانہ بحث کی ہے۔ یہ مقدمہ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور خود ایک تصنیفی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقدمے کے بھی دو حصے ہیں پہلے حصے میں اجمالاً اُن وجوہ سے بحث کی ہے جو غالب کی ناقدردانی کا موجب ہوتیں۔ پھر غالب کی شاعری کی خصوصیات کو دلکش انداز میں پیش کرتے ہوئے ثبوت کے طور پر ان ناقدین کی آرا احاطہ تحریر میں لائے ہیں۔ جو غالب کی شاعری کی اہمیت اور اس میں تصوف اور فلسفے کا عمل دخل بتاتے ہیں۔

"غالب کے کلام میں اکثر اردو اور فارسی شعرا کے مقابلے میں زیادہ تنوع ہے۔ ریختہ کا کلام زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ غالب کی طبیعت میں گوناگونی تھی جو غزل کے لیے موزوں تھی اس لیے ان کے ہاں ہر قسم کے افکار و تاثرات ملتے ہیں۔ مگر امتیازی خصوصیت حکیمانہ اندازِ تفکر ہے فلسفے کی نہیں بلکہ فلسفیانہ شاعری کی۔ غالب نہ صوفی ہیں نہ فلسفی۔ مگر صوفیانہ افکار سے لذت حاصل کرتے ہیں اور اپنے حسنِ بیان سے لذت بخشتے ہیں۔"[1]

مقدمے کے آخر میں خلیفہ صاحب نے نہایت معنی خیز اور اہم فقرے لکھے ہیں۔

"جن فلاسفہ نے وحدت الوجود کے مبسوط و مرتب نظاماتِ فکر قائم کیے ہیں۔ وہ بھی اپنے افکار میں داخلی موافقت پیدا نہیں کر سکے۔ . . اور جب خالص فلسفی سے وحدت الوجود کا عقیدہ اچھی طرح نہیں بنتا تو غالب بھلا شاعر ٹھہرا اس سے افق افکار کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔"[2]

یہ بات درست بھی ہے کہ وحدت الوجود کا نظریہ انسان کو حیرت کی کتنی بلندیوں سے کیوں نہ گزارے۔ آخر ایک مقام پر نفسِ انسانی قرار پائے گا اور اُسے حقیقتِ مطلقہ کی ذات کا کچھ نہ کچھ ضرور علم حاصل ہوگا۔ غالب بھی وحدت الوجود کی اس خاص قسم کی نفی

---

[1] افکارِ غالب از خلیفہ عبدالحکیم ص ۲۲

[2] افکارِ غالب از خلیفہ عبدالحکیم ص ۷۱

کرتا ہے۔ جیسے تا ابھی کہتے ہیں۔

"غالب کے ہاں شکست آرزو بھی ہے وحدت الوجود بھی ہے ... ہوس پرستی کی عاشقی بھی ... عشق حقیقی کی تمنا بھی ہے ... ہر قسم کی تمنا اور ہر قسم کے عشق سے مضطرب رہتا ہے ... اس لیے غالب کے کلام کا بہت سا حصہ انسانی فطرت کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔"[1]

غالب نظریاتی طور پر اس منزل سے آگے گزر گیا ہے جس کو تصوف کی نگاہ میں حیرت کہتے ہیں۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

خلیفہ صاحب نے اس سلسلے میں بڑی اہم بات کہی ہے کہ غالب اس نظریے کے منطقی نتائج تو قبول کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے ہاں افکار و تصورات کا تضاد اور تنوع ہے۔ وہ فانی دنیا کی بے ثباتی کے باوجود اپنی ذات کے امکانات سے فائدہ اٹھانا پسند کرتے ہیں۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اور یوں یہ فلسفی شاعر فلسفے کے بجائے حقیقت کو پہچاننے اور اس کا مقابلہ کرنے والا فنکار بن جاتا ہے۔ یہی فکری تضاد غالب کی انسانیت کی غمازی کرتا ہے۔

"پھر وہ سرد فلسفی انسانوں کا بن جاتا ہے جو زندگی کو ایک مختصر آرزو حسرتوں اور ارمانوں کی داستان سمجھتا ہے۔"[2]

اور اس مقدمے میں خلیفہ صاحب وحدت الوجود کی غالب کے نقطہ نظر سے تشریح کرتے ہوئے جب اس مصرع پر پہنچتے ہیں۔

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

1۔ افکار غالب از خلیفہ عبدالحکیم ص ۴۲

2۔ ایضاً ص ۴۲

تو بجا طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ خیال جو عالم آفرینی کرتا ہے ... خدا کا خیال ہے یا دھوکا کھائے ہوئے انسان کا خیال۔ خلیفہ صاحب اس کے جواب میں کہتے ہیں: غالب کے کلام میں آپ کو کبھی یہ تاثر نہیں ملے گا کہ یہ شے وہم ہے۔[1]

خلیفہ صاحب غالب کو انسان ہی سمجھتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح غالب کے گن گاتے ہیں اور نہ ہی ڈاکٹر عبداللطیف کی طرح اس کی تنقیص کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی تنقید میں آپ کو ٹھہراؤ اور اعتدال و توازن ملے گا اور بقول عابد علی صاحب عابد کے

"کلاسیکی روایت میں ہمیشہ آپ کے لیے ضبط و ریاضت کی روش ہوتی ہے (RESTRAINT) اور وہ منظم تخلیقات فن میں پائی جاتی ہے۔ اس کی جھلک خلیفہ صاحب کے انتقاد میں بھی نظر آتی ہے۔"[2]

غالب کے کچھ اشعار نسخۂ حمیدیہ میں ہیں مگر انتخاب میں نہیں آئے۔ خلیفہ صاحب نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ ایک شعر یہ ہے ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

خلیفہ صاحب لکھتے ہیں کہ اردو اور فارسی شاعری میں اس کا ہم قیمت شعر مشکل سے ملے گا۔ ان کا خیال ہے: اور بہت صحیح ہے کہ کلیاتِ غالب کے ایک نئے انتخاب کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں عابد علی صاحب عابد بھی خلیفہ صاحب سے پوری طرح متفق ہیں۔

خلیفہ صاحب نے غالب کو مفکر کی حیثیت سے خوب سمجھا اور پھر تشریح اس قدر دلنشیں انداز میں کی کہ خاص و عام لطف برابر اٹھا سکیں۔ لطف یہ ہے کہ جو اشعار پہلے سے مربوط المضمون کے حامل ہیں ان پر بھی خلیفہ صاحب نے نکتہ طرازی کی ہے۔ البتہ اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل تشریح سے اختلاف کرتے ہوئے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

---

[1] افکارِ غالب از خلیفہ عبدالحکیم ص ۵۲

[2] تبصرہ از عابد علی عابد صاحب ثقافت جون ۱۹۵۵ء ص ۵۲

ملنا تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

"مجھے فاضل مصنف سے اختلاف ہے۔ اس شعر کو حقیقت کے دائرے میں نہ لے جائیں تو بھی تغزل کی حدود میں اچھا شعر ہے۔ میری رائے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان ہوتا تو اچھا تھا مگر مجھ سے ہر کوئی مل سکتا ہے اور یہ بات ہمیں کھلے جا رہی ہے پھر ملنے کی بھی صرف ہماری پابندی ہے۔ یہ رشک کا مضمون جو غالب سے خاص ہے اور نوادرا انھیں خدا پر بھی رشک آیا کرتا تھا۔"[1]

غالب کے ایک شعر کی خلیفہ صاحب نے نفسیاتی تشریح کی ہے۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائش دردِ دروں وہ بھی

خلیفہ صاحب لکھتے ہیں :-

"زمانۂ حال کے ایک عظیم متفکر اور نفسیات کے امام جیمز نے جذبات کے متعلق ایک نظریہ پیش کیا . . . کہ جسمانی اظہار جذبہ آفریں ہے۔ خوشی کا موقع نہ ہو تو ہنسنے سے خوشی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح گریہ زاری کرنے سے رقت آجاتی ہے۔"

افکارِ غالب کے مصنف نے دو معرکے کے کام کیے ہیں۔ ایک غالب کے حکیمانہ اشعار کی تشریح و توضیح اور دوسرے یہ کہ شاعر کے ابلاغ کو فلسفے کی زبان دی ہے۔ اس کے علاوہ کئی سو صفحات میں غالب کے اردو کلام کا جائزہ لیا ہے اور منتخب اشعار کی شرح کرنے کے بعد فارسی کے حکیمانہ اشعار کی وضاحت کی ہے اور ان میں متعدد ذیلی عنوان قائم کیے ہیں، جیسے عقل و ادراک، اپنے کلام کے متعلق غالب کی پیشین گوئی، جزا و سزا اور آخرت وغیرہ

خلیفہ صاحب نے غالب کے فلسفہ غم والے فارسی اشعار میں سے اس شعر کی جو تشریح کی ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

---

[1] تبصرہ از عابد علی عابد صاحب ثقافت جون ۱۹۵۵ء ص ۵۶

رگِ سنگم شرارے می نویسم
کفِ خاکم غبارے می نویسم

یہ نہایت باریک شعر ہے اور مؤلف نے اس کی توضیح میں بڑی وقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ اس سلسلے کا یہ فقرہ خصوصیت سے دادطلب ہے۔

"بارِ خاطر رفع کرنے کے لیے غبارِ خاطر شعر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔" "طوفانِ آرزو" میں غالب کے فلسفۂ حیات کی ان الفاظ میں تشریح کی ہے۔ "غالب کے نزدیک زندگی کا سرچشمہ عشق یا شوق ہے" یا یہ

"کہ غالب نے آرزوں کے طوفان اور زندگی میں ان کے پورا نہ ہونے کی شکایت جا بجا کی ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ زندگی کا ایک ہی رُخ اور اُسے دیکھنے اور برتنے کا ایک ہی انداز ہے۔"[۱]

اس طرح غالب کے تصورات و خیالات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ فارسی میں غالب نے دیدہ وری یا آرٹ میں بصیرت کے متعلق ایسے افکار کا اظہار کیا ہے جو مائیکل اینجلو کے افکار سے مشابہ ہیں۔ بجنوری نے نسخۂ حمیدیہ کے مقدمے میں اس مشابہت سے بحث کی ہے۔ اینجلو کے خیال میں بُت شانِ دلربائی سے سنگ میں موجود ہوتا ہے۔ فن کار نقابِ سنگ کو دُور کرتا ہے۔ فن کار فطرت کے حُسن کو دریافت کرتا ہے۔ مؤلف نے اس نظریے کی تائید کے لیے غالب کے کچھ شعر پیش کیے ہیں۔ ایک تو تمہیدی تشبیب ہے جس کا مطلع ہے ۔

رہرواں چوں گہر آبلہ بہ بیند
پائے را پایہ فراتر ز ثریا بیند

دوسرا شعر مشہور غزل کا مطلع ہے ۔

دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بُتانِ آذری

ان اشعار سے خلیفہ صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ غالب کی نظر میں دیدہ ور یا صاحب نظر اُسے کہتے ہیں جو زندگی کے ممکنات سے واقف ہو۔۔۔ دیدہ وری یہ کہ فطرت کے ان ممکنات

---

[۱] افکارِ غالب ص ۳۸۹

سے آگاہی ہر شخص نے ابھی پیرایۂ وجود اختیار نہیں کیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ خلیفہ صاحب نے جو کہا ہے۔ اس میں اور اقبال کے نظریے میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ صناع یا صاحب بصیرت وہی ہے جو فطرت کے ان تمام امکانات سے آگاہ ہو جائے جنھوں نے ابھی پیرایۂ وجود اختیار نہیں کیا۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں غالب کے نظریۂ حیات اس کے مختلف پہلوؤں اور اس کے فلسفیانہ افکار کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ وہ بجائے خود ایک فلسفہ کی کتاب ہو کر رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے بعض نقادانِ فن نے کہا ہے کہ لوگ کہیں غالب کی شاعری کے ان محاسن سے لاپروا نہ ہو جائیں جو فلسفہ و حکمت سے قطع نظر اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں یا بالفاظ فخر پیرزن کے الفاظ میں یہ کتاب خود غالب کی نگاہ میں "ہیں خیال بود ہم ہرانی نرتبہ راحتی" کی حیثیت اختیار نہ کر جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس کتاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ

"تنقید میں مواد کی کمی اور تشریحی مواد کی زیادتی کی وجہ سے اس کا درجہ تشریحات کا ہو گیا ہے۔ مگر اس سوال کا جواب ابھی آسان نہیں کہ ہماری زبان میں اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب کوئی ہے شاید کوئی نہیں۔[1]"

پروفیسر حمید احمد خاں فرماتے ہیں :-

"افکارِ غالب سے غالب کے مضامین کی شرح ایک نئی طرز پر کی گئی ہے۔[2]"

بشیر احمد ڈار ثقافت کے پرچے میں رقمطراز ہیں۔

"غالب کی فارسی اور اردو شاعری سے خلیفہ صاحب کا شغف بہت گہرا اور دیرینہ تھا۔ انھوں نے افکارِ غالب میں اس کے فلسفیانہ اشعار کی بہت عمدہ تشریح پیش کی ہے جس کو ہر جگہ پسند کیا گیا ہے۔[3]"

اس مختصر سے جائزے میں ایک تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ تصنیف ایسے انتقادی ہے جسے تخلیقی کہنا چاہیے۔ اگرچہ انداز تشریحی ہے۔ اسے پڑھ کر انسان کا

---

[1] مقالہ از سید عبداللہ ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء جلد ۸ شمارہ ۶-۷ ص ۵۰

[2] مقالہ از پروفیسر حمید احمد خان ایضاً ص ۵۵

[3] مقالہ از بشیر احمد ڈار ایضاً ص ۶۱

ذہن آزادانہ فضائے تخیل میں پرواز کرتا ہے اور ایسی دنیا کے معنی کی تلاش میں چل نکلتا ہے جس کی خلیفہ صاحب نے اپنے الفاظ میں نشاندہی کی ہے۔ دوسری بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ خلیفہ صاحب کا وسعتِ مطالعہ اور غالب کے نظریات کو دلکش انداز میں پیش کرنے کا اسلوب اپنا ہے۔ جس میں تشریح ایسی جامع ہے کہ مابعد الطبیعیات تک کے دقائق پر حاوی، اور تنقید ایسی پختگی اور علمی ترشحی ہیں اور گھٹیا پن سے بالکل مبرا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے غالب پر یہ کتاب لکھ کر ان لوگوں پر بڑا احسان کیا ہے جو غالب کو ایک فلسفی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

تشبیہاتِ رومی

خلیفہ صاحب کی تصنیف تشبیہاتِ رومی اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک انوکھی کوشش رکھتی ہے۔ اس کی وجہ وہ کشش ہے جو خلیفہ صاحب رومی کے لیے رکھتے ہیں۔ رومی سے آپ کی محبت باقی ساری محبتوں پر حاوی رہی۔ اس کا ثبوت ان کا ایم اے کا مقالہ ہے جو انھوں نے رومی پر لکھا۔ پھر ۱۹۳۲ء میں ان کی انگریزی کتاب رومی کی مابعد الطبیعیات (METAPHYSICS OF RUMI) چھپی اور آج تک انگریزی میں اس موضوع پر دوسری کوئی اہم کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں تشبیہاتِ رومی شائع ہوئی۔ حنیف ندوی صاحب کا کہنا ہے کہ تشبیہاتِ رومی کا تانا بانا کچھ اس طرح تیار ہوا کہ خلیفہ صاحب ایک دن اس مجلسِ مذاکرہ میں جو ہر روز دس بجے کی چائے کے بعد منعقد ہوا کرتی تھی۔ استدلال کے مختلف اسالیب پر بحث کر رہے تھے۔ بات منطق کی حدود سے نکل کر قرآن کی تشبیہات تک جا پہنچی اور پھر اس پہلو پر خیال ہوا کہ ابلاغ و تفہیم کے لحاظ سے تشبیہ کا درجہ خشک منطقی دلیل سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں جو تاثیر اور وضاحت ہے وہ صغریٰ کبریٰ سے مرکب دلیل میں نہیں۔ اس کے بعد حضرت مسیح کی تمثیلات سامنے آئیں۔ اس مرحلہ پر خلیفہ صاحب نے کہا کہ تشبیہ و تمثیل کے ذریعے شریعت کے معانی و اسرار کو جس حد تک رومی نے واضح کیا ہے۔ اس میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہیں اور اس کے بعد یہ طے ہوا کہ کیوں نہ خلیفہ صاحب اس موضوع پر ایک کتاب ہی لکھ ڈالیں۔

خلیفہ صاحب نے چند منٹ سوچا، اور پھر کہا۔ ہاں موضوع خاصہ وسیع ہے اور اس پر ایک کتاب یقیناً لکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ تشبیہات رومی اسی فیصلہ کا عملی نتیجہ ہے[1]۔"

بشیر احمد ڈار صاحب کا قول ہے "موجودہ دور میں اس برعظیم کے مسلمان اس مرد راہ بین کے زندگی بخش تخلیقی کارناموں سے پوری طرح استفادہ نہ کر سکتے اگر علامہ اقبال مرحوم بار بار اور پورے جوش و خروش سے اس کی اہمیت کو اجاگر نہ کرتے ۔ ۔ ۔ جو لگاؤ علامہ اقبال کو مولانا روم سے تھا ویسا ہی لگاؤ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کو اقبال اور رومی دونوں سے تھا۔ وہ مدت تک علامہ مرحوم کی صحبتوں میں شریک محفل رہے۔ فلسفے سے دلچسپی اور فارسی شعر و ادب کا ذوق دونوں میں مشترک تھا۔ خاندانی ماحول اور والدین کی تربیت سے خلیفہ صاحب مذہب کی وجدانی قدروں سے پوری طرح آشنا تھے اور ہمیشہ صحت مند اسلامی تصوف کے مداح رہے۔ اس علمی اور شعری یگانگت کے باعث انھیں رومی اور اقبال دونوں سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ "فکر اقبال" میں انھوں نے اقبال کے افکار و نظریات کی تشریح اپنے دلنشیں انداز میں کی ہے اور تشبیہات رومی لکھ کر انھوں نے نہ صرف رومی کی شخصیت کی عظمت اور ان کے افکار کی گہرائی سے لوگوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے (... شاید خلیفہ صاحب سے بہتر کوئی اور شخص اس کام کو پوری طرح نہ نبھا سکتا) بلکہ انھوں نے علامہ اقبال کے ہی تجویز کردہ لائحہ عمل کو آسان اور دلچسپ زبان میں پیش کر کے ہمارے لیے اس "مرد خبیر" کی صحبت تک پہنچنا آسان بنا دیا ہے[2]۔"

اس کتاب میں انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ رومی سا نباض فطرت موزوں تشبیہوں سے کام لے کر فلسفہ حیات اور کائنات و انسان کے اسرار غوامض کو آسانی سے حل کر دیتا ہے۔

تشبیہات رومی پہلی بار فروری ۱۹۵۹ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہوئی یہ کتاب ۶۰۵ + ۸ صفحات پر مشتمل اور خلیفہ صاحب کی آخری تصنیف ہے۔

۱ے حنیف ندوی صاحب سے انٹرویو

۲ے پیش لفظ تشبیہات رومی از بشیر احمد ڈار

کتاب ابھی انتظار کے مرحلے طے کر رہی تھی کہ خلیفہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم اپنی کاوش کو مطبوعہ صورت میں نہ دیکھ سکے۔ بشیر احمد ڈار نے پیش لفظ میں یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ لکھی ہے۔

"مرحوم خلیفہ عبدالحکیم تشبیہات رومی کی اشاعت کے بڑے شوق سے منتظر تھے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچتے دیکھ لیتے۔ کتاب ۱۹۵۸ء کے آخر میں مکمل ہو چکی تھی لیکن بعض وجوہ سے اس کی طباعت میں دیر ہوتی گئی۔ جنوری کے آخری ہفتے میں کتاب قریب الاختتام تھی اور خلیفہ صاحب نے کراچی روانہ ہونے سے پہلے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ ان کے واپس آنے تک یہ کتاب چھپ جائے۔ مگر خدا کا فیصلہ ہماری تمناؤں اور خواہشات کا پابند نہیں۔ آپ کراچی میں ۳۰ جنوری کی صبح کو حرکت قلب بند ہو جانے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔"[1]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ تشبیہات رومی غالباً جولائی یا اگست ۱۹۵۸ء میں مکمل ہو چکی تھی اور فروری ۱۹۵۹ء میں یعنی تصنیف سے تقریباً ڈیڑھ سال بعد شائع ہوئی۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تشبیہ اور تمثیل کی فطرت، ماہیت اور تعریف پر بحث کی گئی ہے۔ باقی چھ ابواب میں مختلف موضوعات کے تحت مثنوی مولانا روم کے چھ دفتر زیر مطالعہ آ گئے ہیں۔ ان میں مولانا روم نے تشبیہ و تمثیل و استعارے کس فنکارانہ قدرت سے تخلیق کیے ہیں۔ یہ تمام باب اقتباسات سے متعلق ہیں۔

مقدمہ اول اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں "تشبیہات رومی" موضوع متعین ہوتا ہے۔ خلیفہ صاحب نے تشبیہ اور تمثیل کو جس زاویۂ نگاہ سے سمجھا ہے۔ اس بات سے واضح ہو جاتا ہے۔

خلیفہ صاحب نے عام قاری کے لیے نہ صرف فلسفیانہ مسائل کی تفہیم آسان کر دی بلکہ ان مسائل سے عام آدمی کو روزمرہ زندگی کی طرح واقف کر دیا ہے۔ تشبیہ کی تعریف

---

[1] پیش لفظ تشبیہات رومی از بشیر احمد ڈار

ملاحظہ فرمایئے۔

"نوعِ انسانی کے اندر یہ ذوق اور یہ میلان موجود ہے کہ اشیاء و حوادث کی کثرت میں وحدت کی تلاش کرے۔ جب کوئی بیان کرنے والا ویسے مذاہب میں جو بظاہر ایک دوسرے سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ کوئی مشابہت تلاش کر لیتا ہے۔ اور اس مشابہت کی بنا پر ایک کو دوسرے سے تشبیہہ دیتا ہے تو انسان کو ایک ذہنی اور قلبی لذت حاصل ہوتی ہے اور خالی لذت ہی نہیں بلکہ معرفتِ حقائق بھی حاصل ہوتی ہے[1]۔"

یہ تشبیہہ تخلیق کا مسئلہ تھا اب انسانی زندگی میں مثال یا تشبیہہ کی ضرورت کے بارے میں خلیفہ صاحب کی توجیہہ ملاحظہ ہو۔

"انسان بیک وقت دو عالموں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک عالم اس کے نفس کا ہے اور دوسرا عالم اس کے بیرون کا۔ نفس کا عالم، عالم النفس سے وابستہ ہے۔ اور بیرون کا عالم عالم آفاق ہے۔ ابتدا میں انسان کا بچہ اپنے جسم اور بیرونی عالم سے ہی آشنا ہوتا ہے اور خارجی عالم سے تطابق پیدا کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ خارج پر نظر پہلے پڑتی ہے۔ مگر باطن سے آشنائی کئی مراحل سے گزر کر پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے انسان نے جو زبان پیدا کی اور جس وجہ سے وہ حیوانِ ناطق کہلاتا ہے وہ زبان تمام تر اوپر سے یا جسمانیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے نفس کے اندر کیفیتیں ہوتی ہیں لیکن قیمتیں نہیں ہیں نفسی کیفیت میں کا ئیت نہیں ہوتی لیکن جب نفسی کیفیت کو بیان کرنا چاہو تو کائنات کی اصطلاحوں سے کام لینا پڑتا ہے[2]۔"

یہ اقتباس تشبیہاتِ رومی کا دائرہ کار متعین کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی زندگی اور اس کی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے خلیفہ صاحب کا رویہ محض خارجیت کا تال میل کرنے والے فلسفیوں یا خواہشات کا تجزیہ کرنے والے نفسیات دانوں کا سا نہیں بلکہ روحانی مفکرین کا سا ہے۔ جو فلسفے کو روحانی کیفیات کا ترجمان سمجھتے ہیں اور نفس کی اہمیت کو آفاق کی اہمیت سے افضل اور اعلیٰ تر جانتے ہیں۔

---

[1] تشبیہاتِ رومی ص ۲

[2] ایضاً ص ۳

تشبیہ و تمثیل کے اس آئینے میں خلیفہ صاحب نے مولانا روم کے کلام کو دیکھا ہے اور ان کے کلام میں تشبیہات کی تخلیقی، روحانی اور فکری اہمیت کو بیان کیا ہے۔

پوری کتاب میں طریق کار یہ ہے کہ مولانا روم کے اہم ترین شعری موضوعات کو سامنے رکھ کر ان میں سے تشبیہ کا استخراج کیا گیا ہے ہر عنوان میں کوئی ایک موضوع دے کر اس پر بالوضاحت اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور آخر میں اس موضوع کے بارے میں مولانا روم کے اشعار درج کیے گئے ہیں جن میں اس موضوع کو کسی نہ کسی تشبیہ و تمثیل یا امیج (IMAGE) کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پہلا عنوان ہے "حرص" اس میں پہلے حرص کی جبلت پر تفصیلی بحث کی ہے۔ قناعت اور حرص کا تقابلی مفہوم بیان کیا گیا ہے اور پھر بتایا ہے کہ مولانا روم نے حریص لوگوں کی آنکھوں کو ان سیپیوں سے تشبیہ دی ہے جن کے منہ ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور وہ لالچ کے باعث صرف قطرۂ نیساں پر اکتفا نہیں کرتے اور یہی وہ سیپیاں ہیں جو موتیوں سے ہمیشہ محروم رہتی ہیں۔

دل کو مولانا روم نے آئینے سے تشبیہ دی ہے خلیفہ صاحب نے دل اور آئینے کی معنوی یگانگت پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔ اس طرح عقل، عشق، آفتاب و سایہ، احمد (اہلِ دل)، آرزو، پیدائشِ اعمال وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو مولانا روم کے تخلیقی تجربات تو ضرور ہیں لیکن تشبیہاتِ رومی میں خلیفہ صاحب نے انھیں از سرِ نو زندگی عطا کی ہے۔

مولانا روم کے افکار کی تشریح و توضیح میں خلیفہ صاحب نے تصوف کے مضامین ادا کرنے والے بے شمار دوسرے شاعروں کو بھی سامنے رکھا ہے تقابلی مطالعے کا یہ طریق خاصا دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی ہے۔ اس سلسلے میں جن دو شاعروں کو بالخصوص اہمیت دی گئی ہے ان میں ایک غالب اور دوسرے اقبال ہیں۔ خلیفہ صاحب کی دونوں شعرا کے کلام پر گہری نظر ہے۔ اس کا ثبوت ان کی مستقل تصانیف افکارِ غالب اور فکرِ اقبال سے ملتا ہے۔ انھوں نے غالب اور اقبال سے تشریحی مواد فراہم کیا ہے کسی جگہ مضمون کی مطابقت ہے اور کہیں ذرا سی تبدیلی سے بات کو تقابلی انداز میں بہت زیادہ وقیع اور سریع الفہم بنا دیا ہے۔ مثلاً

خدا کی دید

رومی: ہر کرا باشد ز سینہ فتح باب
او ز ہر ذرہ ببیند آفتاب

غالب: دیدۂ مجنوں بہ پشتک ہائے لیلیٰ آشنا
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا[1]

دینی زندگی تن آسانیوں کا کام نہیں

رومی: عشق حقیقی است مجازی مگیر
ایں دم شیر است بہ بازی مگیر

اقبال: یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا[2]

غالب اور اقبال کے علاوہ سعدی، حافظ، ظہوری، جامی اور ذوق کے اشعار بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ تقابلی طریق خلیفہ صاحب کے ہمہ جہت شعری مطالعے کا پتہ دیتا ہے۔

مغربی فلسفیوں کے تتبع میں جس مصنف سے اس میں سب سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے وہ ولیم جیمز ہے جس کی نفسیات پر ایک معرکہ آرا تصنیف کا ترجمہ خلیفہ صاحب نے "واردات روحانی" کے نام سے کیا تھا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کی اور تشبیہات رومی ۱۹۵۹ء میں چھپی۔ اس اعتبار سے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کتابوں کی تیاری ایک ساتھ ہوتی رہی۔ چنانچہ تشبیہات رومی میں صدائے غیب، صدا، عقل زمانی، عقل مکانی، عمل وحی، جسم و روح، علم النفس، معرفت وجدان، مشاہدہ وغیرہ کی تراکیب ولیم جیمز سے براہ راست متاثر ہیں۔

---

[1] تشبیہات رومی ص ۴۹

[2] ایضاً ص ۱۳۱

آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے درج کی جاتی ہے جو اس کتاب کے بارے میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"خلیفہ صاحب نے رومی کے عقلی عنصر کو اس کے ایمانی عنصر کے ساتھ تطبیق دی ہے اور اس طرح مولانا روم کا زیرِ نو مطالعہ کیا ہے۔ رومی کے تمثیل، استعارات کی خوبی بیان کرتے ہوئے اس کی عقلی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔۔ تشبیہاتِ رومی اگرچہ بظاہر رومی کی تشبیہات کے متعلق ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حکمتِ رومی کی وسیع تر تشریح کی منظم صورت ہے جس میں شواہد کی موجودگی سے کتاب زیادہ مستند ہو گئی ہے[1]"

---

[1] مقالہ از ڈاکٹر سید عبداللہ ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۵۹

خلیفہ صاحب کا اسلوبِ تحریر

خلیفہ صاحب نے اظہارِ خیال کے لیے زیادہ تر اُردو نثر ہی کو بطور وسیلہ استعمال کیا ہے۔ ان کی نثری نگارشات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) تراجم
(۲) مستقل تصانیف

جہاں تک تراجم کا تعلق ہے ان کو پانچویں باب میں زیرِ بحث لایا جائے گا۔ لیکن ان سے ان کے اسلوبِ نگارش کی خوبیاں متعین نہیں ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مصنف کا انفرادی اسلوب اس طرح تمام و کمال نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اس کی خوبیوں یا خامیوں کا اندازہ اس کی طبع زاد تصانیف کے آئینے سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر خلیفہ صاحب کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے ان کی چار کتابیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ حکمتِ رومی، تشبیہاتِ رومی، فکرِ اقبال اور افکارِ غالب ان کے علاوہ پانچویں کتاب داستانِ دانش ہے جس کا اسلوب ان چاروں سے مختلف ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ صاحب فلسفے کی دقیق بحثوں کو کس آسانی سے قاری کے ذہن میں اتار دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

پہلی چار کتابیں موضوع کے اعتبار سے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ سلسلہ مطالعہ صنفِ شعر سے متعلق ہے۔ تینوں شاعر رومی، اقبال اور غالب جو اپنی انفرادی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور شعری کمالات کے لحاظ سے مماثل بھی ہیں۔ اپنے افکار کی گہرائی کی بنا پر تشریح و توجیہہ کے محتاج ہیں۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فکری و شعری گرفت سے زندگی کا کوئی پہلو بھی بچ نہیں پایا۔

کا اتنا اچھا انتخاب [illegible] ہوگا

ڈاکٹر خلیفہ کی مدرسانہ زندگی کا ان کے اسلوب پر گہرا اثر نظر آتا ہے مثلاً تشریحی انداز بیان کی صورت میں وہ ہر مسئلے کی اتنی تشریح و توضیح کرتے ہیں کہ کوئی مشکل نہیں رہتی۔ جن لوگوں نے خلیفہ صاحب سے ملاقات کی ہے۔ انھیں ان کی کتابیں پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی مجلس میں گفتگو کر رہے ہیں۔

ان کی تحریروں میں بے شمار لطائف و اشعار کا استعمال برمحل ہوا ہے۔ چنانچہ ان کی کتابوں سے عمدہ اشعار کا ایک معقول انتخاب تیار ہو سکتا ہے۔ ان کے لطائف میں ان کی ذکاوت ایک خاص پیرایہ اختیار کرتی ہے اور اشعار کے انتخاب سے بڑے لطیف ذوقِ ادب کا ثبوت ملتا ہے۔ ان لطائف و اشعار سے ان کی تحریر کو فائدہ بھی پہنچا ہے اور نقصان بھی۔ نقصان یہ ہوا ہے کہ بعض اوقات ان کی تحریر میں طوالت بے جا کا عیب پیدا ہو گیا ہے مگر فائدہ بھی ہوا کہ ان کے فلسفیانہ مضامین و تصانیف میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ ... انھوں نے ادب و حکمت میں وہ رابطہ قائم کیا جس کا خواب شبلی نے دیکھا تھا۔ مگر شبلی اردو میں اس کی تعبیر خلیفہ عبدالحکیم کے ماسوا کوئی نہ کر سکا۔ البتہ شعر و حکمت کی یکجائی کے لحاظ سے اعلیٰ ترین مقام حکیم مشرق کا مقام خاص الخاص ہے۔[1]

خلیفہ صاحب کے اسلوب پر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی یہ رائے خلیفہ صاحب کی تحریروں کے مطالعے کے لیے ہماری بہترین رہنمائی کرتی ہے۔ خلیفہ صاحب کے اسلوب میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اپنی ہر تحریر میں وہ یکساں طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے کوئی مضمون اہم یا غیر اہم ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک محض اسلوب کا تعلق ہے اس میں یکساں طور پر دلکشی پائی جاتی ہے۔ خلیفہ صاحب کی ان تحریرات کی ایک فہرست پانچویں باب میں درج کی گئی ہے جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں اور ابھی تک یکجا نہیں ہوئے۔ بحیثیت مجموعی یہ مقالات اپنی جامعیت اور زبردست افادیت کی بنا پر ایک طرف خلیفہ صاحب کی عظمت آشکارا کرتے ہیں تو دوسری طرف اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ علم و ادب کی شاہراہ پر [illegible] نئی شمعیں جگمگا اٹھی ہیں۔

---

[1] میراَمن سے عبدالحق تک از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۲۶۲ - ۲۶۳

خلیفہ صاحب کے تمام فکری کارناموں کا موضوع اسلام اور اس کے اصولوں کی تشریح و تعبیر ہے۔ ان کے موضوعات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے:

۱۔ اسلام اور قرآنی تعلیمات پر نظریاتی مباحث

۲۔ صوفیائے اسلام کے اقوال اور تعلیمات کی تشریح

۳۔ مختلف شعرا کے کلام کی توضیح و تشریح

اسلام اور قرآنی تعلیمات پر نظریاتی اور فکری مباحث کے سلسلے میں ان کی بعض اہم تقاریر کے علاوہ ان کا سب سے اہم کام "اسلام کا نظریہ حیات" ہے۔ پروفیسر عثمان نے اس کتاب سے اسلامی نظریہ حیات کے چار اہم معیار اخذ کیے ہیں[1]۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ چار معیار صرف خلیفہ صاحب کے افکار کو سمجھنے کے لیے ہی مددگار ثابت نہیں ہوتے بلکہ ان کی مدد سے تمام مسلمان مفکرین کے کارناموں کا مطالعہ کرنے میں بھی سہولتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ معیارات درج ذیل ہیں:

(۱) وحدت (۲) ہمہ گیری (۳) توازن (۴) افادیت

ان معیارات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خلیفہ صاحب موصوف "اسلام کا نظریہ حیات" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اسلام کا نظریہ حیات" کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ صاحب کو اسلامی تعلیمات کی وسعت کا صحیح اور سچا شعور حاصل تھا۔ انھوں نے ایک دو نہیں متعدد مقامات پر ان عناصر کو بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے جن کے بغیر اسلامی نظریہ حیات کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہماری زندگی کی پوری تاریخ میں اسلامی تعلیمات کے اس پہلو کو پوری جرأت اور کامل یقین و اعتماد کے ساتھ بہت کم پیش کیا گیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم ان معدودے چند افراد میں سے ہیں جنھوں نے قرآن حکیم کے اس حصۂ تعلیم کو شرح صدر کے ساتھ سمجھا اور اس کی تشریح کیا ہے[2]۔

---

[1] اس جگہ پروفیسر صاحب موصوف کے تمام حوالے اسی مضمون سے متعلق ہیں۔

[2] ایضاً ص ۴۶ – ۴۷

پروفیسر صاحب کا یہ بیان درست ہے کہ خلیفہ صاحب نے اسلامی تعلیمات کو وسیع تر انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کے مقام سے دیکھا ہے۔

مذہب کے بارے میں خلیفہ صاحب کا واضح تصور یہ تھا کہ انسانیت کے داخلی انتشار اور اضطراب کا یہ واحد حل ہے۔ بقول محمد انور خلیل "خلیفہ صاحب کے نزدیک ہمہ گیر مذہب ایک آزادانہ نظم ہے جو مختلف حالات و کوائف، مختلف اقوام و ملت کے مخصوص تجربات سے مطابقت رکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ہر قسم کی عصبیت، اشتراکیت اور دہریت کی اسلامی تعبیرات کو بین الاقوامی امن کا سبب نہیں بلکہ ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ تنگ نظری، فرقہ پرستی کے مخالف اور عالمگیر مذہب کے قائل تھے جس کے ماننے والے متوازن، روشن خیال اور انسانی شرافت کی بنیادوں کے حامی اور علمبردار ہوں۔

انھوں نے عالمگیر مذہب کی لازمی خصوصیات مندرجہ ذیل بیان کی ہیں۔

۱۔ اس بات پر ایمان کہ وجود کی بنیاد روحانیت پر ہے اور فطرت کی تخلیقی روح ہے۔

۲۔ انسانی روح، روح الٰہی کا جزوی مظہر ہے۔

۳۔ خدا تمام کائنات کی روح بھی ہے اور اس کا وجود اس سے ماورا بھی ہے۔ خدا اور کائنات کے درمیان خالق اور تخلیق کا رشتہ ہے۔

۴۔ صفات خداوندی کو اپنانا انسان کا مقصود حیات ہے۔

۵۔ صرف اخلاقی اقدار حقیقی اور مستقل ہیں، علم کا سرچشمہ یہاں ہے۔

۶۔ عالمگیر مذہب کے لیے یہ عقیدہ بھی ناگزیر ہے کہ بنی نوع انسان نسلی، تہذیبی اور مذہبی اختلافات کے باوجود ایک متحدہ اور متفقہ اکائی ہو۔

مذہب کا اصل مقصد معرفت الٰہی حاصل کرنا ہے اور خلیفہ صاحب کے نزدیک جس مذہب کے دروازے معرفت الٰہی کے لیے کھلے ہوئے نہیں وہ تمام انسانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا۔

اسلامی افکار و نظریات کے سلسلے میں خلیفہ صاحب نے بعض نئی باتیں کہی ہیں۔ بقول شاہ حسین رزاقی صاحب:

کا ہو سکتا ہے۔ ذات رسالت مآب صلعم کے ساتھ آپ کی الفت اور عقیدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی نبوت کو مثالی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ جناب رسالت مآب نے نبوت کا جو اعلیٰ معیار قائم فرما دیا ہے، اس کے بعد انبیائے بنی اسرائیل کی نبوت نظروں میں نہیں جچتی (اور نبی) آخر الزماں کے مقابلے میں وہ عارفین حق اور اولیا کے درجے پر فائز معلوم ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب کی نظر میں حضور کا کیا مقام تھا اور وہ حضور کے ساتھ کیسی والہانہ عقیدت و الفت رکھتے تھے۔ خلیفہ صاحب کو منکر حدیث بھی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن میں نے حقیقی اعلیٰ درجے کی احادیث خلیفہ صاحب سے سنیں، کسی اور سے سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔[1]

خلیفہ صاحب کی قرآن اور احادیث سے وابستگی اور ان کے علوم پر دسترس کا اعتراف فری کے لینڈا ایسٹ نے بھی اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

خلیفہ صاحب قرآن کریم کا عمیق مطالعہ کرتے اور یہ اس لئے کہ ان کا یقین تھا کہ نزول قرآن کا مقصد یہی ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ ان (خلیفہ صاحب) کا بیان یا ان کا تصور یہ تھا کہ اس (خدا تعالیٰ) کی ذات حدود و قیود سے ماورا ہے۔ اس کی حکمت و ربوبیت کا دائرہ بھی لامحدود ہے۔[2]

اسلامی نظریۂ حیات کی شرح و تاویل کے سلسلے میں ابتدا ہم نے سرسید اور ان کے بعض معاصرین کا نام لیا ہے۔ خود سرسید نے اسلام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں زیادہ تر انداز معذرت اور عذر خواہی کا ہے۔ وہ ہر اسلامی اصول کو انگریزی تہذیب یا مغربی مفکرین کے اقوال سے تطابق دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرسید نے مسلمانوں کی ذہنی تربیت اور کردار سازی کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں، ان سے انکار نہیں، لیکن مذہب کی حمایت میں جو طریق کار انھوں نے اختیار کیا، اس سے انھیں مسلمانوں سے زیادہ انگریزوں کی خوشنودی حاصل ہوئی۔ دور جانے کی ضرورت نہیں

---

[1] خلیفہ صاحب کے مذہبی عقائد ماہنامہ ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۱۵

[2] خلیفہ صاحب کے مذہبی خیالات ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۱۸

گارساں دتاسی جو انیسویں صدی کے نصف اول سے مستشرقین میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے اردو ادب اور اہل ہند سے والہانہ عقیدت کے سبب سے مشہور ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک متعصب عیسائی تھا۔ خطبات گارساں دتاسی کا مطالعہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ جہاں کہیں بھی موقع ملتا ہے دتاسی حضرت عیسیٰ کی تعریف کرتا ہے۔ وہ عیسائیت کی تبلیغ اور اشاعت میں کسی کردار کا ذکر رہا ہو۔ وہ اردو، ہندوستانیوں کی شان میں قصیدہ لکھتا ہے جو بھی عیسائیت میں داخل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کی واضح ترجیح کرتا ہے جو دائرہ اسلام میں آنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ہمیں گارساں دتاسی سر سید کا ذکر بار بار کرتا ہے لیکن مصلح قوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان معنوں میں کہ سرسید نے مسلمانوں کے لیے کوئی نجات انجام دیا بلکہ صرف اس وجہ سے کہ سرسید نے انجیل مقدس کی تفسیر لکھ کر ثابت کیا کہ اسلام کا نظریہ سیاست عیسائیت سے زیادہ مختلف نہیں اور اگر غور کیا جائے تو ان میں تورات اور عہد کے فرق سے بالکل قریب ہے۔ چنانچہ گارساں دتاسی ان کی تفسیر انجیل کو ان الفاظ میں یاد کرتا ہے۔

"قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس (مقدس تفسیر) کا مقصد یہ ہے کہ مسیحی اور اسلامی تعلیم میں یکسانیت پیدا کرے اس کتاب کے پڑھنے سے مصنف کی لطافت اور وسعت کا صاف طور پر اظہار ہوتا ہے۔ مصنف اپنے مذہب اسلام پر تو اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامی اعتقادات کی جس حد تک ممکن ہو تاویل کر کے بیان کرتے ہیں۔ جہاں وہ حضرت مسیح کا ذکر کرتے ہیں تو بالکل اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی عیسائی کرے گا۔"[1]

اس اقتباس سے سرسید کی مخالفت مراد نہیں بلکہ اس تصویر کا ایک رخ دکھانا مقصود ہے جو خلیفہ عبدالحکیم کے عہد کے پس منظر میں نظر آتی ہے۔ سرسید کے عہد میں کچھ ایسے لوگ خالص اسلامی نظریات کے حامی تھے اور وہ کسی صورت میں بھی مذہبی مفاہمت یا عذر خواہی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان میں حالی اور محمد حسین آزاد کا نام مثال کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

---

[1] خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۵ء ص ۲۸۶

حالی کا مضمون الدین یسیر اس اعتبار سے لائق مطالعہ ہے۔

محمد حسین آزاد نے انگریزوں سے عملی کم اور نظریاتی مفاہمت قدرے زیادہ کی لیکن ان کا دائرہ ادب تک محدود رہا۔ مذہب ان کی زد میں نہیں آیا۔

خلیفہ عبدالحکیم کا ذکر کرنے سے پہلے اس جگہ اس بات کی صراحت بے محل نہ ہوگی کہ پنجاب کی مذہبی فضا سرسید کے زمانے میں بھی انگریزی تہذیب سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی چنانچہ جس شدومد کے ساتھ علی گڑھ تحریک نے مذہب کو مغرب کی آنکھ سے دیکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا، اسی زور سے پنجاب نے اسلام کو خالصتاً قرآن و سنت کی روشنی میں ماننے والوں کی اکثریت کو جنم دیا۔ مرحوم علی چشتی کی سرسید سے مخالفت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ خود دارالاشاعت پنجاب کے بانی شمس العلماء سید ممتاز علی مرحوم و مغفور حقوق نسواں کے سلسلے میں سرسید سے متفق نہ تھے۔

جب ہم علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے مذہبی نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید اور ان کے درمیان ایک واضح بُعد موجود ہے۔ علامہ اقبال کے فلسفیانہ خطبات کا مجموعہ تشکیل جدید الہٰیات اسلامیہ اس امر کا شرح و بسط کے ساتھ احاطہ کرتا ہے۔ علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے فلسفیانہ افکار اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں مسائل دینیہ سے لے کر مسائل زیست تک ہر امر کو قرآن و سنت کے مطابق پرکھا گیا ہے۔ مذہب کی تشکیل جدید یا تعبیر جدید میں نئی زندگی کے تقاضوں کو قرآنی تعلیمات سے مطابقت دی گئی ہے۔ غرضیکہ علامہ اقبال اور ان کے شارح خلیفہ عبدالحکیم ہر لحاظ سے مسلمان مفکرین ہیں۔ اب ہم خلیفہ صاحب کی تحریروں کے حوالے سے مختلف مسائل و مباحث کے بارے میں ان کے نظریات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیں گے۔

سائنس اور مذہب

سائنس اور مذہب کی سرحدیں اگرچہ الگ الگ ہیں مگر اپنے مقاصد کے لحاظ سے چونکہ دونوں بالواسطہ زندگی سے متعلق ہیں، لہٰذا ہر دور میں سائنس کے کارنامے اور مذہب

کی ہوئی تفسیریں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ ابتدائی دور میں کچھ اندیشانہ تنقید
کے پیش نظر مذہب کے لیے صرف ایک ہی راستہ بچاؤ کا تھا کہ وہ چٹان کی طرح جم جائے
ارتقائی نقطۂ نظر سے اپنی بقا کے لیے اسے ایک خاص راستے کی ضرورت تھی (جو
اس کی فطرت میں موجود تھا) یعنی سائنس کی مادی حد بندیوں کے برعکس زندگی کا ایک
ایسا آفاقی تصور پیش کرنا جو ایک طرف مادے کی ترقی پہ قدغن نہ لگائے اور دوسری
طرف اس کی اصل یعنی روح کو آشکار کر دے۔ ادھر جس طرح مذہب کی ابتدا صنمیات
سے ہوئی اسی طرح سائنس کی ابتدا بھی توہمات اور ایسے نظریات سے ہوئی جنھیں
محض افسانوں سے تعبیر کرنا چاہیے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے بھی ایک حد تک اپنی حقیقت
کو پہچان لیا۔ یعنی مادہ کا وہ تصور جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھا، وہ نئی دنیا میں یکسر
بدل گیا۔ سائنس نے اپنی معلومات کو حرف آخر کہنے کے بجائے اس امر کا اعتراف کر
لیا کہ فطرت کی کارکردگیاں لامتناہی ہیں اور ان سے آگہی حاصل کرنا گویا دوسری موجودات
کو جاننے کا آغاز کرنا ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے سائنس اور مذہب کے موضوع پر
"اسلام کا نظریۂ حیات" میں نہایت مدلل بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ
جس طرح سائنس ترقی کرتے ہوئے منزل بہ منزل مادی فطرت کی نقاب کشائی کرتی چلی
جا رہی ہے۔ اسی طرح مذہب بھی عروج و ارتقا کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ لیکن یہ عروج و ارتقا
سائنس کے عروج و ارتقا سے یقیناً مختلف ہوگا۔ سائنس جس حقیقت کی تلاش میں ہے اس
حقیقت کو مذہب نے پا لیا ہے۔ اسلام نے علی الاعلان یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا کی ہستی
ایک ہے اور وحدانیت کی جس طرح تشریح و توجیہ کی ہے وہ ایسی جامع اور مکمل ہے کہ فلسفہ
اور سائنس اس کا ابطال نہیں کر سکتے۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں: "سائنس صدہا سال تک
توہمات، طلسمات اور بے قید خصوصیات سے ہم آغوش رہی۔ یہ مشاہدہ، تجربہ اور عقل
کے بجائے نوزائیدہ انسانیت کے تخیل کی پیداوار تھی۔ اب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سائنس
اپنے بنیادی مسلمات کو پا گئی ہے اور حکمیاتی نظریہ اور حکمیاتی مناہج ہمیشہ کے لیے دائم
ہو گیا ہے۔ مگر منظم کائنات کا بنیادی نظریہ جو تعلیلی قبیل اور ریاضیاتی استدلال کا تابع

ہے "کبھی بدل نہیں سکتا۔ ایک آئن اسٹائن زمان و مکاں کے تصور کو بدل سکتا ہے۔ نیوٹن طبیعیات کی زیادہ تشفی بخش طریقہ پر تشریح کر سکتا اور مطلقیت کو اضافیت سے بدل سکتا ہے مگر نظریۂ اضافت ایک ایسا قانون ہے جو ہیئت اور ریاضیاتی استدلال کا تابع ہے اور اس لیے مطلق ہے۔ کیونکہ قانون کی ماہیت بذاتِ خود مطلق ہے۔ سائنس بے حد و نہایت ترقی کرتی رہے گی اور جیسے فطرت بے پایاں ہے ویسے ہی اس کے اسرار کی پردہ کشائیاں ترقی کناں رہیں گی۔ علاوہ بریں سائنس کے بنیادی مسلمات ہمیشہ کے لیے ثابت ہو چکے ہیں اور جب اس میں سائنس کی کوئی تحقیر نہیں سمجھی جاتی کہ اس کے ابتدائی نظریات کی جگہ ایسے نظریات نے لے لی ہے جن کی تشریح مشاہدہ اور اختبار کی روشنی میں مستقل ترقی کے سبب زیادہ تشفی بخش طریقہ پر ہی کی جا سکتی ہے تو پھر مذہبی عروج و ارتقا کی بھی اس نہج پر تفسیر کیوں نہ کی جائے؟"

مذہب اور فطرت

جہاں سائنس نے مذہب پر حملے کیے اور بالآخر اسے کئی مذہبی معتقدات کے دائرۂ عمل سے باہر نکلنا پڑا۔ وہاں فطرت کے روبرو آنے سے بھی مذہب کے ان عناصر کی تطہیر ہو گئی جن کی اساس ضعیف الاعتقادی پر تھی اور یہ بات مذہب کے حق میں اس کی اصل کو بروئے کار لانے میں نفع بخش ثابت ہوئی۔ مذہب کے مقاصد کا تعین دراصل فطرت کے آئینے ہی میں ممکن ہو سکتا تھا۔ مذہب کے اس پہلو پر غور کرنے کے بعد انسان پر یہ راز کھلا کہ وہ محض ایک حیاتیاتی آلہ کار نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر روحانی قوت کا سرچشمہ ہے۔ خلیفہ صاحب مذہب اور فطرت پر ان خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"مذہب پر فطرت سے حملہ کیا جو بالآخر مذہب کے حق میں نفع بخش ثابت ہوا۔ اصل مذہب وہمی نیم اعتقادیوں اور نقلی حکمیاتی معتقدات سے پاک کیا گیا جو اپنے طور پر مذہبی نظام میں داخل

لہ اسلام کا نظریۂ حیات از خلیفہ عبدالحکیم ص ۳۱ - ۳۲

ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مذہب کا اپنا علیحدہ مقام رہا اور وہ واقعات فطرت کے شرح و بیان سے رُکا رہا۔

عقلیت جس کا نشوونما بحیثیت مجموعی سائنس کے ساتھ ہوا، اس نے بھی ثقافت کے مختلف دائروں میں بہت اچھی خدمات انجام دیں۔ مادیت نے بھی قدیم لغویات کو رد کر کے نوع انسانی کو نفع پہنچایا۔ انسانی ذہن آزاد ہو کر فطرت کے روبرو تنہا اپنی توانائی کی حیثیت سے آسکتا [۱]

خدا پر ایمان کا فلسفہ

قرآن مجید کی اس تعلیم پر کہ خدا پر ایمان بالغیب لایا جائے کڑی تنقید کی گئی ہے کہا جاتا ہے کہ ایسے خدا پر کیسے ایمان لایا جا سکتا ہے جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم بھی نہ ہو۔ لیکن اس عامیانہ انداز سے ہٹ کر اگر اس مسئلے پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کوئی سا وسیلہ اس نامعلوم حقیقت تک باریاب کر دے گا۔ اگر اس حقیقت کو پانے کے لیے اس کی نفی سے بحث کا آغاز کیا جاتا ہے تو یہ کسی مفروضے کی نفی ہو گی۔ خلیفہ صاحب اس مسئلے پر بحث ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ان دیکھے خدا کی ہستی جس کو اسلام پیش کرتا ہے، اس سے مقصد نوع انسانی کو طبیعی پابندیوں اور حیاتی کائنات سے آزادی بخشنا ہے۔ خدا کو تمام معیاروں کا غیر مرئی ماخذ قرار دے کر حیات انسانی کو ارتقائی اور متحرک بنانا ہے۔ انسان موجودات کا معیارِ کمال، اشرف المخلوقات اور زمین پر خدا کا نائب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ محسوسات کی حلقہ بگوشی سے چھٹکارا نہ پائے اور ان دیکھے نصب العین کی بلندیوں کی طرف عروج نہ کرے" [۲]

صفاتِ خداوندی

جس طرح خدا کی ذات کی تفہیم انسانی عقل و فکر سے بالاتر ہے، اسی طرح اس کی

---

[۱] اسلام کا نظریۂ حیات ص ۴۳ - ۴۴

[۲] ایضاً ص ۴۳ - ۴۷

صفات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا - اپنی ذات کے بارے میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اس جیسی کوئی شے نہیں"۔ اسی طرح اس کی صفات کا تعین بھی ممکن نہیں - لیکن حیات و کائنات میں صفاتِ خداوندی کا ادراک کرنے کے لیے ذاتِ خداوندی نے ایسے قرائن طبعِ انسان میں فراہم کر دیے ہیں کہ اس کی اپنی فکر کی حد تک اُن کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے - خلیفہ صاحب اِس مسئلے میں فرماتے ہیں -

"صفاتِ الٰہی کے متعلق بھی انسان کا علم اس انداز کا ہے کہ وہ صفات کے مظاہر سے اُن کا کچھ اندازہ کرتا ہے - جس طرح ذات کے متعلق لیس کمثلہ شیءٌ کتاب نے کر دیا ہے - لیکن خدا کا ہونا کن معنوں میں ہے - اس کا کوئی شخص قیاس نہیں کر سکتا - انسان کے لیے ہر وجود مادی ہے یا ذہنی - یا زمان میں ہے یا مکاں میں - یا زمان و مکان دونوں میں - اس کے علاوہ وجود کا کوئی تصور ممکن نہیں - لہٰذا خدا کی نسبت اگر ہو الموجود کہیں یا لا موجود الا اللہ کہیں تو یہ وجودیت کا تصور ایمانی یا وجدانی ہی ہو سکتا ہے - ادراکی نہیں ہو سکتا - صفات اللہ کی بابت بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کی ماہیت کیا ہے - خدا علیم ہے - ہستی مطلق میں علم کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے - اس کا تصور ممکن نہیں - ان کا ہر علم جزوی ہوتا ہے - اس کے کلیات بھی دراصل تجزیات ہی ہیں - ماورائے زمان و مکاں عالم کل ہستی کا علم کس انداز کا ہوگا - یہ ادراک کی گرفت میں نہیں آ سکتا - لیکن خدا کی صفات کو انسان آثار و امثال سے کسی قدر پہچان سکتا ہے"[1]

صفاتِ خداوندی کی اقسام و تعمیم میں مسلمانوں میں صرف ایک فرقہ کرامیہ تھا، جو ظاہری طور پر خدا کی جسمانیت کا قائل تھا - لیکن دیگر تمام علما صوفیا اور متکلمین اسلام کا مسلک یہی رہا کہ ذاتِ خداوندی کی طرح اس کی صفات بھی احاطہ ذہن انسانی میں نہیں آ سکتیں - خلیفہ صاحب اُن مشاہدات کے بارے میں جو بعض اوقات صوفیا کے ہاں اور اکثر انبیا علیہم السلام کے ہاں محسوس شکل اختیار کر لیتے ہیں کہتے ہیں " باطنی مشاہدات میں بعض اوقات خدا کے صفات مثل مادی صفات کے محسوس ہوتے ہیں -

---

[1] اساس اسلام ص ۱۸۱ - ۱۸۲

جب کہ آنحضرت صلعم نے باطنی رویت میں ربانی ہاتھوں کا لمس اپنے شانوں کے درمیان محسوس فرمایا تھا لیکن بالعموم یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ مشاہدات تمثیلی ہوتے ہیں۔ جن میں غیر محسوس حقائق کو محسوسات کا رنگ دیا جاتا ہے؟"

خالق و مخلوق کا رشتہ

یہ حقیقت اگر مان لینے کے بعد کہ تمام کائنات کو پیدا کرنے والی ایک ایسی ہستی ہے، جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے جو ہمہ صفات قادرِ مطلق ہونے کی سزاوار ہے یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ایسے خالق کا اپنی مخلوق سے کیا رشتہ ہے۔ صوفیائے کرام نے اس مسئلے پر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے پس پردہ گوناں گوں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خالق و مخلوق کے رشتے کو مختلف تشبیہات اور تمثیلات کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ ابتدائی یونانی فلاسفر کا یہ تصور تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو ایک تنظیم کے تحت خلق کر کے اس سے لاتعلقی اختیار کر لی ہے۔ صوفیائے کرام کے ایک گروہ کا یہ خیال تھا کہ مظاہرِ کائنات مظاہرِ خداوندی ہیں اور ان کا تعلق وجودِ باری یا ذاتِ باری سے براہِ راست ہے۔ ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ مخلوق اپنے خالق سے رشتہ اس کی ذات سے نہیں ہے، اس کی صفات تک محدود ہے۔ اس گروہ نے بھی اپنے خیالات کو بیانات کے مختلف پیرایوں میں نہایت شد و مد سے پیش کیا ہے۔ خلیفہ صاحب اس مسئلے کی فلسفیانہ توجیہہ اس طرح کرتے ہیں۔

"خالق اور کائنات کا لازماً مماثل نہیں ہو سکتے جیسے کہ ایک مصور ہمیشہ اپنی تصویر سے مافوق ہوتا ہے، اگرچہ وہ اپنے فنی نمونہ میں سرایت کئے ہوتے ہو، تصویر اس کے الہامی نمونہ کی ایک محسوس صورت ہوتی ہے۔ خدا کی باطنیت اور ظاہریت کی کامل بصیرت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ غیر محدود اور لا یزال ہستی کا زمانی و مکانی اسباب میں اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے مثل کوئی چیز نہیں خواہ اشیا میں ہو یا ہمارے نفسی اور مادی اسباب میں "[2]

---

[1] اسلام کا نظریۂ حیات ص ۹۲

[2] ایضاً ص ۵۰

ان خیالات کے اظہار کے بعد یہ مسئلہ ہنوز حل طلب رہ جاتا ہے کہ ایسی ہستی اپنی ذات میں تخلیقات سے ماورا رہ کر ان سے کس طرح اپنا تعلق استوار رکھتی ہے اس کا حل خلیفہ صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"اسلام کا خدا بوجہ اعتدال پسند ہونے کے کبھی بے نظم و ترتیب ہیولیٰ کا خالق نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی ایسے غیر متشکل مادہ کی بدنظمی سے دوچار ہو جس کا پہلے سے کوئی وجود نہ ہو اور جس کو اس نے بڑی مشقت سے زندہ کیا ہو۔ یہ چیز اس کے حکیم ہونے کی صفت سے طبعاً پیدا ہوتی ہے، جو صاحب عقل و حکمت ذات ہے۔ جو کچھ وہ پیدا کرتا ہے، اس کا وجود و ظہور، حکمت پر مبنی ہوتا ہے حکمت نظم، مقصد اور صداقت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لیے قرآن بار بار اس نظریہ کو دہراتا ہے کہ خدا نے سارے عالم کو حق اور کسی مقصد کے ساتھ پیدا کیا اور یہ محض کھیل تماشہ نہیں ہے قرآن کی اصل حجت کا ثبوت وہ علت اولیٰ ہے جو فطرت میں نظم و ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ فطرت ایک توانین کی حکومت ہے۔ وہ بے قید ارادوں کی پیداوار نہیں۔ فطرت کی یہ عقلی وحدت اس کا ایک خالق ہونے کی دلیل ہے[1]۔"

وحدت الوجود

حیات و کائنات پر غور کرنے اور ماطنی کیفیات کی ٹوہ لگانے سے جو مسائل سامنے آئے، ان میں ایک مسئلہ وحدت الوجود کا بھی تھا۔ بہ الفاظ دیگر کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلہ کو فلسفہ اور تصوف نے جنم دیا۔ جہاں تک اسلامی افکار میں اس کے وجود کا تعلق ہے یہ سراسر تصوف کا رہین منت ہے مسلمان مفکرین کے ہاں اس مسئلہ کی فلسفیانہ موشگافیوں کی بہ نسبت صوفیانہ تعبیریں اور توجیہیں کہیں زیادہ ہیں فلسفیانہ بحثوں میں اس مسئلہ نے آگے چل کر دو مکاتب فکر پیدا کیے۔ ایک گروہ اس خیال پر قائم تھا کہ خالق اور مخلوق دونوں کو تسلیم کر کے ان پر علیحدہ علیحدہ افکار کی عمارت تعمیر کی جائے۔ دوسرا گروہ سرے سے دوئی کا حامی نہ تھا۔ وہ وحدانیت کو حیات و کائنات کی اصل و اساس

---

[1] اسلام کا نظریۂ حیات، ص ۵۱

گردانتا تھا۔ لیکن حیات و کائنات کی ہیئت کذائی پر حکم لگانے میں یہ گروہ مزید دو شاخوں میں بٹ گیا۔ ایک طبقہ یہ کہتا تھا کہ مادہ ہی کائنات کی اصل ہے۔ اس کا پھیلاؤ اپنے اندر وہ تمام عملا حیثیتیں رکھتا ہے جنھیں اذہان کی کارکردگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ روح کو بھی مادے کی لطیف صورت گردانتے تھے۔ اس طرح وحدت الوجود کی یہ ایک ایسی تعبیر تھی، جس کا سر تا سر مادے سے تعلق تھا۔ لیکن دوسرا طبقہ مادے پر روح کو فوقیت دیتا ہے۔ یہ طبقہ مادے کی حیثیت مسلمہ طور پہ مانتے ہوئے روح کے بارے میں کہتا ہے کہ مادے اور روح میں خیال کی ایک لکیر یا رستہ ہے۔ روح کا عمل میکانکی نہیں۔ اسے مادے کی طرح سمجھا اور سمجھایا نہیں جا سکتا۔ وہ اپنے لطیف اعمال کی بنا پر مادے سے اس حد تک تجاوز کر جاتی ہے کہ معناً اس پر مادہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ان وجوہات کی بنا پر قرآن مجید نے اسے "من امر ربی" کہا ہے۔ ان مکاتبِ فکر کے علاوہ ایک مکتبۂ فکر اس خیال کا حامی تھا کہ مادہ سے قطع نظر روح ہی کو حیات و کائنات کی اصل مان لیا جائے۔ یہ گروہ اپنے نظریات میں راسخ العقیدہ ہونے کی بنا پر IDEALISM کا شکار ہو گیا۔ اس گروہ کا آخری فرد شاید ہیگل ہے جس کے ہاں ان نظریات کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔ ایک گروہ اس خیال کا حامی تھا کہ وجود فی الحقیقت وجود مطلق ہے اور وجود مطلق ہی اصل سے اجزا ہیں۔ ادھر منطقیوں کا بھی یہی نظریہ ہے کہ کلیات کا اپنا ایک وجود ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ انسان سے الگ "نفسِ انسان" کا اپنا ایک وجود ہوتا ہے۔ اسی نظریہ کی بنا پر یہ کلیہ سامنے آیا ہے۔ آیا کہ موجودات میں ایک نفس موجود ہے۔ نفس کی اس تعبیر نے آگے چل کر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے سارے مسائل پیدا کر دیے۔

وحدت الوجود کی ان فلسفیانہ اور منطقیانہ موشگافیوں کے بعد جن حضرات نے اس مسئلہ کو باطن کے وسیلہ سے سمجھا، انھیں اہلِ تصوف کہا جاتا ہے۔ اس گروہ کے سرخیل محی الدین ابن عربی ہیں، جنھوں نے اپنی کتاب فصوص الحکم میں جا بجا اس امر کا اظہار کیا ہے کہ خدا کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی بسیط حقیقت کے سامنے تمام موجودات کی نفی

کی جائے بصورت دیگر کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے، اُسے وجودِ مطلق ہی سمجھا جائے۔ ابن عربی اور ان کے ہم خیال صوفیائے کرام کا یقین ہے کہ اوّل کائنات کی کسی شے میں شر موجود نہیں، لیکن فرض کیا جائے کہ یہاں شر کی بھی کارفرمائی ہے تو اسے اپنی ذات سے منسوب کرنا چاہیے نہ کہ خدا کی ذات سے۔

جہاں تک وحدت الوجود کے مذکورہ بالا نظریات کی روشنی میں خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے نظریات کا تعلق ہے بلا تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ پوری طرح کسی مکتبۂ خیال کے حامی نہیں۔ ان کے افکار میں مادہ و روح، خیر و شر، جبر و قدر اور اسی قسم کے دیگر مسائل کسی افراط و تفریط کے شکار نہیں رہتے۔ انھوں نے ان مسائل کو عقل و وجدان کی مدد سے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں حل کیا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بارے میں وہ اقبال اور مولانا روم کے ہم خیال ہیں۔ جہاں تک مسئلہ اوّل یعنی وحدت الوجود کا تعلق ہے خلیفہ صاحب اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ تمام موجودات ایک ہی وجود کا حصہ ہیں۔ ان کے نزدیک اس نظریہ پر عمل پیرا ہو کر "شر" کو بھی وجود کا حصہ سمجھنا ہو گا جو سراسر غلط ہے۔ اپنی کتاب "افکارِ غالب" میں وہ غالب کے نظریات وحدت الوجود کے باب میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں۔

"اخلاق کا تمام تر دار و مدار اس یقین پر ہے کہ انسان صاحبِ اختیار ہستی ہے اور اس کو اختیار اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ شر کو ترک کرے اور خیر کو اختیار کرے لیکن وحدت الوجود سے منطقی نتیجہ جبر ہی حاصل ہوتا ہے۔ فرد کا اگر کوئی مستقل وجود نہیں تو اس وہمی وجود کا اختیار وہم در وہم ہے۔"[1]

اس نظریے کی وضاحت کے بعد اب رہا خالق و مخلوق کا رشتہ تو خلیفہ صاحب مولانا روم کے وسیلے سے اس پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

"ہستی مطلق یعنی ذات باری تعالےٰ اور مخلوقات و موجودات کی باہمی نسبت کچھ

---

[1] افکارِ غالب طبع دوم از خلیفہ عبدالحکیم ص ۶۷ - ۶۸

اس انداز کی ہے جو سورج اور اس کے سائے میں پائی جاتی ہے۔ اگر آفتاب نہ ہو تو سائے کا وجود بھی نہیں ہو سکتا۔ کائنات اس طرح خدا کا پتہ دیتی ہے، جس طرح سایہ آفتاب کی نشان دہی کرتا ہے۔ اگرچہ سایہ بھی ایک طرح سے آفتاب کی دلیل ہے۔ لیکن اس سے کم تر ہے، جس طرح کہ خود طلوعِ آفتاب آفتاب کی دلیل ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ سورج نکلا ہے تو اس کا جواب یہی ہے کہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف رُخ کرو۔ اس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب[1] "

خدا کی وحدت۔ حکمت کا سرچشمہ

انسانی اذہان کی فکر کا اقتضا یہ ہے کہ وہ کسی ایسی ہستی کو اپنا محور قرار دے، جس کے ماننے سے وہ ایک طرف تنظیم کے دائرہ میں آجائے اور دوسری طرف اس کی فعالی قوتِ لامتناہی انتہائی منزلیں طے کر سکے۔ سطحی غور و فکر سے ہٹ کر اس مسئلے پر حکیمانہ غور و خوض سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی فکر کے لیے طبعاً لازم تھا کہ وہ کسی ایسے نقطے پر منتج ہوتا جو نہ صرف اُس کی شیرازہ بندی کی راہیں متعین کرتا۔ بلکہ اس کے لیے دلیل راہ بھی ہوتا۔ یہ نقطہ اور یہ راز خدا کی وحدت میں مضمر تھا۔ خلیفہ صاحب اس نقطہ کے حقائق یوں بیان فرماتے ہیں۔

" خدا کی وحدت سے جو چیز بطور نتیجہ طبعاً پیدا ہوتی ہے، وہ نہ صرف وحدتِ کائنات ہے۔ بلکہ وحدتِ انسانیت بھی ہے . . . تمام مذاہب کی حقیقی وحدت اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ یہ بھی خدا کی وحدت کا منطقی نتیجہ ہے۔ اسلام خدا کی وحدت سے ایک اور نتیجہ وحدتِ انسانیت اخذ کرتا ہے۔ قرآن نے بار بار اس کا اظہار کیا ہے

---

[1] تشبیہاتِ رومی از خلیفہ عبدالحکیم ص ۲۰

وحدت الوجود کی اس بحث میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (۱) عقلیات ابن تیمیہ (۲) تعلیماتِ غزالی از مولانا حنیف ندوی صاحب (۳) تصوفِ اسلام از عبدالماجد دریا بادی۔

کہ انسانیت ایک ہے، اور تمام نوعِ انسانی ایک وجود سے ظہور پذیر ہوئی ہے ہے۔ اور یہ کہ خدا نے اپنی روح آدم میں پھونکی۔ مختلف مقامات پر قرآن میں آدم سے مراد انسانیت یا نوعِ انسانی ہے۔ اسلام انسانیت کو ہر حیثیت سے یک رنگ بنانے کا تصور نہیں کرتا۔ وہ تاکیداً کہتا ہے کہ انسان یا مختلف قوموں کے طریقہ ہائے زندگی کے اختلاف خدا کی معنی خیز نشانیاں ہیں اور اس دعوے پر اسے اصرار ہے کہ بنیادی طور پر تمام انسانیت، ایک ہے" [1]

خدا جو چاہتا ہے، وہ پیدا کرتا ہے لیکن اس کا ارادہ پُر از مصلحت ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے۔ اس کے سبب عقلی کو ظاہر کرتا ہے تخلیق نطقِ الٰہی کو معروضی شکل دیتی ہے۔ اصلاً ناممکن اور متناقص بالذات کو قدرتِ کاملہ وجود نہیں بخشتی" [2]

شر کی وضاحت کرتے ہوئے خلیفہ صاحب پھر فرماتے ہیں :-

"فطرت عالم گیر قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے اور وہ اس میں کسی شخص کا لحاظ نہیں کرتی۔ یہ قوانین معقول ہوتے ہیں اور بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا عمل ہمارے مفید مطلب نہیں ہوتا تو ہم ان کو شر کا نام دیتے ہیں۔ کائنات میں شر کا مسئلہ خود کائنات سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہماری کوتاہ نظر تشبیہیت اور انسانی جذبات کو خدا سے منسوب کر دینے سے پیدا ہوتا ہے" [3]

عبادت کی حقیقت

اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی غایت یہ ہے کہ انسان اپنے معبودِ حقیقی کی یاد میں ہمہ وقت مصروف رہے۔ بہ الفاظِ دیگر اس کے ہاں قوانینِ الٰہیہ کی عملی تشکیل کا اعادہ ہوتا رہے اور وہ ایک لمحہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہ ہو۔ عبادات کی دوسری بڑی غایت یہ ہے کہ خود انسان میں مادی اور روحانی تنظیم پیدا ہو۔ اس میں اخلاقِ حسنہ پروان چڑھیں اور وہ صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکے۔ خلیفہ صاحب نے عبادات

---

[1] اسلام کا نظریۂ حیات ص ۸۳ - ۸۴

[2] ایضاً ص ۱۱۸

[3] ایضاً ص ۱۲۳

کے اس مفہوم کو اپنے مخصوص انداز میں واضح کیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دعائیں اور عبادت بھی انسان کی فطرت ایمانیہ کا ایک جزو ہیں۔ وہ ایسے مدعیانِ ایمان سے اتفاق نہیں رکھتے، جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کسی کو خوش کرنے کے لیے فطرت کا طریق کار نہیں بدل سکتا۔ ان کے نزدیک یہ خیال کسی حد تک صحیح ہے مگر اپنی سببیت کے تصور میں غلطی کرتا ہے عبادات کے حقائق کو خلیفہ صاحب ایسے سادے الفاظ میں یوں بیان کر جاتے ہیں کہ یہ پیچیدگیاں سامنے کی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ کہتے ہیں۔

"عبادات روحانی زندگی کے نظام سے تعلق رکھتی ہے، جو ایسے افراد کی اعانت کرتا اور زندگی بخشتا ہے۔ جو اپنا حیاتی رشتہ مرکزی تخلیقی محرک کے ساتھ برقرار رکھنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ جو شاخ اپنا رشتہ درخت سے توڑ لیتی ہے، وہ مرجھا جاتی ہے ایسے ہی ہم بحیثیت ارواح پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنا تعلق شجر حیات یعنی خدا سے منقطع کر لیں۔ عبادت خدا کے ساتھ ہماری یگانگت کا احساس ہے اور اس احساس سے ہم تخلیقی غذا پاتے ہیں۔ خدا پالنے والا اور پرورش کرنے والا ہے۔ لیکن یہ پرورش یا پرداخت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم اپنی زندگی کا رشتہ اس کے ساتھ قائم رکھیں۔ وہ جز جو کل کے ساتھ یگانگت حاصل کرتا ہے۔ وہ کل کی زندگی میں شریک کار ہوتا ہے۔ اس شرکت کے نتائج ہمارے وجود کے ہر عضو سے نمایاں ہوتے ہیں عبادت ایک کیفیت ہے، جس میں ایک محدود وغیر محدود سے رابطہ پیدا کرتا ہے۔ جب ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ جس وقت خدا نے ہم کو پیدا کیا تو اپنی روح ہم میں پھونکی تو اس کا صرف یہی مفہوم ہوتا ہے کہ روحانی نظام کی روح یعنی روح حق تعالیٰ نے اپنا قلبی اور روحانی رشتہ ہر فرد و بشر کے ساتھ قائم کر دیا ہے۔"[۱]

خلیفہ صاحب عبادت کی حقیقت کو واضح کرنے کے بعد اس کی کیفیت و کمیت کی طرف آتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے آئینہ میں اس بات کا بھی غور کرتے ہیں کہ ایک انسان

۱۔ اسلام کا نظریۂ حیات ص ۱۵۸ - ۱۵۹

کی عبادت دوسرے انسان کی عبادت سے مختلف ہوتی ہے۔ نیز اس میں مدارج کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔

علمی نقطۂ نظر سے وحشی قبیلوں سے لے کر مہذب یافتہ معاشرے تک عبادت کے درجے اور ان کا مفہوم واضح کیا جا سکتا ہے۔ خلیفہ صاحب ایسے اشخاص کے نظریات کو بھی اپنے دلائل کی روشنی میں رد کرتے ہیں، جن کا خیال یہ ہے کہ مذہب کی غلامی کا طوق انسانوں کی گردنوں میں ڈالتا ہے۔ یا ایسی خواب آور دوا ہے جو انسانیت کی روح کو کھائے جا رہی ہے۔ آپ اطاعت کے اس غلط مفہوم کا ایک ہی جملے میں جواب دیتے ہیں۔

"جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم اس کی اطاعت کریں تو گویا ہم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ہم زندگی میں عقل و انصاف کی اطاعت کریں۔" [1]

اخلاق

حیات و کائنات کے تعلق پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ایک ایسا رابطہ ہے جو معین اصولوں ہی سے استوار رہ سکتا ہے۔ اس رابطے اور معین اصولوں کو اخلاق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حیاتِ انسانی ارتقا کے نقطۂ نظر سے دیگر اشیائے عالم کی بہ نسبت زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ ہے۔ ان میں آزادی نہیں پائی جاتی۔ وہ پابند اور اپنے اپنے دائرہ ہائے عمل میں مقید ہیں۔ یہ شرف صرف حیاتِ انسانی کو حاصل ہے کہ اس کی تکمیل آزادی سے ہوئی لیکن جس طرح حیات کے پچھلے طبقے یا حیات خود آئینِ ضوابط کی پابند ہے، اس طرح وہ بلند ترین درجوں میں بھی ضابطوں اور پابندیوں سے رہائی نہیں پا سکتی۔ اخلاقی اصول اور اخلاقی قدریں (MORAL VALUES) اپنے اعلیٰ ترین مفہوم میں حیات کو اس کے ارتقائی سفر میں صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتی۔ اگر دریا کناروں کے اندر بہنا چھوڑ دے اور قدرت کی تنظیم سے انحراف کر جائے تو اس

---

[1] اسلام کا نظریۂ حیات ص ۱۸۱

سے استفادہ کی تمام صورتیں کالعدم ہو جائیں۔

خلیفہ صاحب اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے اخلاقیات کے بارے میں دو باتوں کا حل ضروری سمجھتے ہیں۔ اول یہ کہ "اخلاقیات اسلام" اسلام سے الگ کوئی شے نہیں۔ دوسرے حکمیاتی اخلاقیات جس کو خیر اعلیٰ کی تلاش، نصب العینی مقصد یا مقصدِ اولیٰ کا نام دیتی ہے، وہ دراصل مذہب میں تلاشِ حق کے مترادف ہے۔ یہ محض اصطلاحات کا فرق ہے۔ دراصل افلاطون جس شے کو خیر کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اس نے اسلام میں خدا کا روپ دھار لیا ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک اخلاقیات کو اسلام سے الگ کر کے سمجھا یا پرکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اخلاقیات جیسا کہ پچھلی سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ضابطے ایک پابندی کا نام ہے۔ ادھر اسلام خود ایک ضابطہ اور پابندی ہے۔ لہٰذا اخلاقیات اور اسلام الگ الگ ضابطے قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اسلام کی رُوح اخلاقیات ہے اور اخلاقیات کی جان اسلام ہے۔ خلیفہ صاحب اسلام کے آئینہ میں اخلاقیات کی روح کو ایسے دل نشین انداز میں پیش کرتے ہیں کہ مطالب و مفاہیم پر بآسانی دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔ انھوں نے جس طرح خدا کی یگانگت کو واضح کیا ہے کہ یہ یگانگت موجوداتِ عالم کی بھی روحِ رواں ہے، اس طرح اخلاق کے بارے میں یہ نکتہ پیدا کیا کہ اخلاقی بھی قوانین اور ضابطوں کی یگانگت سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ خلیفہ صاحب اس مسئلہ کو کچھ اس طرح واضح کرتے ہیں۔

"فلسفیانہ اخلاقیات کی طرح اسلام کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ تمام مقاصد ایک آخری مقصد میں جا کر مل جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسلام کے پاس اس کا ایک سادا جواب ہے۔ موجودات کی وحدت سے زندگی کی نمود ہوتی ہے جو خدا کی یگانگت کا ظہور ہے۔ مادی کائنات بھی ایک وحدت ہے۔ کثرت نہیں۔ کائنات، حیات اور نفسِ وحدت بھی کثرت سے متصف ہے۔ باوجود اس تمام رنگا رنگی کے موجودات کا مقصد یک رنگ ہے سادہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ تمام قوانین فطرت کسی ایک ہی قانون کے بمگٹ و بام ہیں۔ اخلاقیات کو بھی کسی ایک ہی قانونِ وحدت و کثرت کے موافق ہونا چاہیے[1]"

---

[1] اسلام کا نظریۂ حیات ص ۲۰۲

اخلاق کی اس فلسفیانہ توجیہہ کے بعد خلیفہ صاحب نیکی و بدی کی حقیقت ان الفاظ میں آشکار کرتے ہیں۔

"اسلام کی رو سے نیکی اور بدی کا مسئلہ نقد و نسیہ دونوں پر مشتمل ہے ۰۰ نیکی و بدی کے بدلے کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ یہ ہر لمحہ ضبطِ تحریر میں لائے جاتے ہیں اور اس ترازو سے وزن کر لیے جاتے ہیں جس میں ذرا برابر غلطی کا امکان نہیں۔ انسان کی زندگی کا تعین کسی خاص گناہ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ گناہ و ثواب کے اس میزان سے ہوتا ہے جو اس سے سرزد ہوتے ہیں[1]۔"

فلسفہ خیر و شر

حیات و کائنات کے مظاہر پر غور کرنے کے بعد صوفیائے کرام فلاسفہ اور حکما نے اس مسئلہ پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے بحث کی ہے۔ پہلے گروہ کے بیشتر حکما اس خیال کے حامی ہیں کہ حیات و کائنات خیر و شر کے مجموعے سے تشکیل پاتی ہے اسی گروہ کے بعض حکما کا نظریہ ہے کہ حیات فی نفسہٖ رنج والم اور دکھوں کا دوسرا نام ہے۔ مہاتما بدھ جب یہ کہتا ہے کہ "پیدائش دکھ ہے" تو وہ سراسر حیات کے اس تصور کا ابطال کرتا ہے، جسے خیر کہتے ہیں۔ تمام ہندو فلاسفر جب تک کہ وہ خدا کی وحدانیت کے تصور سے دوچار نہیں ہوئے، خیر و شر کی حقیقت واضح کرنے میں قاصر رہے ہیں۔ خیر و شر کے اسلامی تصور سے قطع نظر مسلمان صوفیا کا یہ مسلک رہا ہے کہ حیات و کائنات کی ہر شے "خیر" کا آئینہ ہے۔ دنیا میں موت کی کارفرمائی۔ زلزلوں اور آندھیوں کی تباہ کاری، بیماریاں اور دکھوں کی یورش سطحی فکر کے لیے یقیناً "شر" کا حکم رکھتی ہیں۔ مگر سوچ کی یہ سطح اتنی پست اور حقیر ہے کہ فطرت کی اس مشیئت کا سراغ نہیں لگا سکتی، جو سرتاسر حکمت سے پُر ہے۔ انسان اور "نفسِ انسان" فرد اور اجتماع کے مصداق ہیں۔ ذات واحد اور وہ بھی محض محسوسات کی حد تک مطابق اشیا کا اندازہ لگانے میں یقیناً ٹھوکر کھائے گی۔ چنانچہ صوفیائے کرام نے بڑے شد و مد سے یہ بات دہرائی کہ

---

[1] اسلام کا نظریہ حیات ص ۲۱۴ - ۲۱۵

حیاتِ کائنات میں ہر جگہ خیر ہی خیر کار فرما ہے۔ لیکن اگر کہیں شر کا وجود ہے تو وہ ذاتِ خداوندی سے معرضِ وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ اس کی ذمہ داری ہمارے نفوس پر عائد ہوتی ہے اس باب میں خلیفہ صاحب یوں رقم طراز ہیں۔

"فطرت میں ہم تعمیر کے ساتھ تخریب بھی دیکھتے ہیں۔ یہاں حیات کے ساتھ موت اور فنا موجود ہے۔ خود حیاتِ انسانی طبعی اور اخلاقی خرابیوں سے مملو ہے۔ جب خدا ہمہ تواں اور ہمہ خیر ہے تو پھر شر کسی صورت میں بھی کیوں باقی ہے؟ . . . قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا کو یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے اور جس چیز کا ارادہ کرے وہ پورا کرے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے ارادہ کی مخالفت کر سکے۔ جب وہ کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ صرف لفظ "کن" کہہ دیتا ہے اور وہ موجود ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کے قوانین کے تابع ہے۔ یہ عقلی ارادہ ہے۔ یہ قدرتِ کاملہ پر چند قیود عائد کرتا ہے جو سنتِ الٰہی اور ضروریاتِ تخلیق کے مدِ نظر خود عائد کردہ ہیں۔[۱]"

خدا کے پاس ہر چیز کے بے انتہا ذخیرے ہیں۔ لیکن وہ ان کو ایک اندازے سے ظاہر اور پیدا کرتا ہے۔

"تم سنتِ الٰہی میں کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ . . . حقیقی تضاد کوئی شے نہیں اس لیے وہ خدا کے بارے میں بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمہ تواں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بلا کسی قانون کے کوئی کام کیا جائے یا قانون بنا کر اسے خود سراہ طور پر توڑ دیا جائے تو اسلام ایسے ہمہ تواں تصور کی تردید کرتا ہے۔ کائنات یک رنگیوں کا نظام ہے اور عقل خود اپنے ممکنات اور ناممکنات رکھتی ہے۔ خدا کی فطرت اور عقل بے بصر اور خود سر ہے۔ خدا جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کا ارادہ پُر از مصلحت ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے اس کے سببِ عقلی کو ظاہر کرتا ہے تخلیق نطقِ الٰہی کو معروضی شکل دیتی ہے۔ اصلاً ناممکن اور متناقض بالذات کو قدرتِ کاملہ وجود نہیں بخشتی۔[۲]"

---

[۱] اسلام کا نظریۂ حیات ص ۱۱۷

[۲] ایضاً ص ۱۱۷ - ۱۱۸

شر کی وضاحت کرتے ہوئے خلیفہ صاحب پھر فرماتے ہیں :-

"فطرت عالمگیر قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے اور وہ اس میں کسی شخص کا لحاظ نہیں کرتی۔ یہ قوانین مفصل ہوتے ہیں اور بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا عمل ہمارے مقصد مطلب نہیں ہوتا۔ تو ہم ان کو شر کا نام دیتے ہیں۔ کائنات میں شر کا مسئلہ خود کائنات سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہماری کوتاہ نظر تشبیہیت اور انسانی جذبات کو خدا سے متصف کر دینے سے پیدا ہوتا ہے[1]"

علت و معلول کے آئینے میں حیات کا تصور

کائنات کی ہر شے علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ کسی واقعہ یا کسی شے کو اس سے الگ کر کے نہ تو اس کے بارے میں کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے اور نہ مفروضات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ دیگر کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ کسی بھی حد پہ پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا۔ جہاں فطرت کے ظواہر میں اس کا تسلسل ملتا ہے، وہاں اس کے باطن میں بھی یہی قرینہ پایا جاتا ہے۔ علت و معلول کا یہ سلسلہ بالآخر تمام علتوں کی علت یعنی خالق مطلق پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ حیات و کائنات میں ان علتوں کی حیثیت کیا ہے اور پس پردہ یہ کن حکمتوں کو آشکارا کرتی ہیں، اس کے بارے میں خلیفہ صاحب یوں رقم طراز ہیں۔

"اگر ہم لفظ علیت کو ضروری اور ناگزیر نتائج کے لیے بھی استعمال کریں تو ہم کو قرآن کے بموجب یہ ماننا پڑے گا کہ تمام علیت کی حقیقت خالق کی مشیئت ہے۔ ایک منظم کائنات کی تخلیق کر کے خدا اپنی مشیئت سے دست بردار نہیں ہو گیا۔ مادی طبیعیات اس پر زور دیتی ہے کہ صحیح علیت اندھی اور میکانی ہے اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ حیات اور نفس کو کو بھی میکانی علیت کے طریقوں پر بیان کیا جائے۔ ان کوششوں کا ناکام ہونا قطعی ہے۔ کیونکہ عضویت اور اس کے بالارادہ افعال کی تشفی بخش تشریح میکانی قوانین کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی۔ عضویت کے فعل و اثر کی محض میکانی فعل و اثر سے اب قطعی طور پر تفریق کی جا چکی ہے عضویاتی

---

[1] اسلام کا نظریۂ حیات ص ۱۴۳

تخلیق، نمو، مقصد، تلاش، اشکال ہیں مگر تمام عضویاتی زندگی مادی عالم پر کار فرما رہتی ہے۔ اس لیے ہم کبھی عضویت میں دو فروع کے فعل و اثر باہم پیوستہ اور پہلو بہ پہلو کار فرما دیکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ حیات بمیزان وجود میں مادہ سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔ اس لیے مادی فعل و اثر حیاتی فعل و اثر کے تابع ہوتا ہے جب کہ نیت غایتی اور مقصد تلاش حرکات کے تابع ہوتی ہے۔ اگر تسلسل و ترتیب، مادی حوادث میں منطق اور واقعی فعل و اثر کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں حیات کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اعلیٰ طبقۂ وجود کا فعل و اثر ادنیٰ طبقہ کے وجود کے فعل و اثر میں تبدیلی اور تغیر پیدا کر سکتا ہے۔[۱]"

خلیفہ عبد الحکیم کی فکری شخصیت کا دوسرا اہم پہلو اس جگہ ظاہر ہوتا ہے جہاں وہ اسلامی تصوف کی تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے تصوف کی شرح مغربی فلسفے کی مدد سے نہیں کی۔ بلکہ ان کی معلومات اور تحریک کا منبع صوفیائے اسلام کے اقوال و تعلیمات ہیں۔ خلیفہ صاحب کے ہاں تصوف کا مقام سمجھنے کے لیے ان اصطلاحوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ جو صوفیانہ تجربات کی علامتیں ہیں۔ خلیفہ صاحب نے ان اصطلاحوں کی تفسیر کے لیے کوئی الگ کتاب تو نہیں لکھی۔ البتہ حکمت رومی، تشبیہات رومی اور فکر اقبال میں جہاں ان اصطلاحوں کے خیالات کی تشریح کی گئی ہے۔ وہاں بین السطور میں تصوف کے بعض رموز و اسرار کے بارے میں خلیفہ صاحب کی اپنی آرا بھی موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب جدید علوم سے بہرہ یاب ہونے کے باوجود مغربی مفکرین سے متاثر نہیں ہیں۔ اور اسلامی تصوف کو مسلمان صوفیا کے اقوال اور ملفوظات کے درمیان رکھ کر ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ بے وجہ تاویلوں اور ذہنی تجدد سے اصطلاحوں کو مجروح نہیں کرتے۔ اس جگہ بعض مثالیں بے موقع نہ ہوں گی۔ سب سے پہلے عشق کو لیجیے۔

عشق، مسلمان صوفیا کے نزدیک روحانی مقامات سے ایک مقام ہے۔ اس کی

---

[۱] اسلام کا نظریۂ حیات ص ۵۷

تشریح و تعبیر نوبہ نو تمثیلات کی مدد سے کی گئی ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز فرماتے ہیں

"بداں کہ اے عزیز ایں درخت (عشق) ہمیں وجود و ہستی تو و شکل ایں درخت ہمیں افعال و اوصاف تو"[1]

ترجمہ :- اے عزیز یہ درخت (عشق) جو اپنے آپ سے آپ ہے۔ وہ تمہارا ہی وجود ہے۔ تمہاری ہی ہستی ہے۔ جس کی شکل و صورت تمہارے ہی افعال و اوصاف ہیں۔[2]

پھر فرماتے ہیں :-

"اے عزیز در وجود تو سہ مقام است۔ اوّل و اوسط و اسفل یعنی ناف نفس کہ مرتبہ اسفل است تعلق بہ دوزخ دارد۔ دریں وجود پری و مار و کژدم و آتش و سردی و آنچہ لوازم دوزخ است و اجناس مستتر دریں مقام است۔ و ایں مقام و ابلیس است و مقام اوسط سینہ است تعلق بہ بہشت دارد۔ یعنی زمین بہشت مقام حور و قصور و اشجار و ثمار۔ ناز و نعمت و آنچہ و از جنس بہشت است دریں مقام شاہ عشق بتمام مظہر ظہور است۔ و دل مقام اعلیٰ کہ تعلق بہ حق دارد۔ کہ احد است و دریں مقام ملائکہ و عرش و کرسی و لوح و قلم آسمان و آفتاب و ماہتاب و ستارہ و آنچہ لوازم نور حق است دریں مقام است و شاہ عشق دریں جا بوصف اللہ ظہور است"[3]

ترجمہ : اے عزیز تمہارے وجود میں تین مقام ہیں۔ اعلیٰ۔ اوسط۔ اسفل نچلے درجہ میں ہونے سے ناف کو نفس کہتے ہیں۔ اس کا تعلق دوزخ سے ہے۔ دیو، پری، سانپ، بچھو، گرمی، سردی وہ ساری چیزیں جو دوزخ کے لوازمات و متعلقات ہیں وہ اسی میں ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ابلیس یعنی نفس کا ظہور ہے۔ مقام اوسط میں ہونے سے دل کو قلب کہتے ہیں۔ اس کا تعلق جنت سے ہے یعنی جنت کے میدان محلات

---

[1] یازدہ رسائل ص ۱۰۲ کراچی ۱۹۶۷ء

[2] ایضاً ص ۱۸۴

[3] ایضاً ص ۱۰۳

حور، پھل، پھول، باغ، کیاریاں، ناز و نعمت کے وہ سارے ساز و سامان جو اس کے لوازم ہیں۔ وہ اسی مقام میں ہیں۔ شاہِ عشق کا راس مرتبہ و مقام میں احمد و محمد کے نام سے ظہور ہے۔ مقام اعلیٰ میں ہونے سے جان کو رُوح کہتے ہیں۔ اس کا تعلق حق سے ہے۔ یہی اصل ہے یعنی اس مقام میں فرشتے عرش، کرسی، لوح و قلم، آسمان، آفتاب، چاند، ستارے اور جو کچھ کہ لوازمۂ نور و حق ہیں، وہ سب اسی مقام میں ہیں۔ یہاں شاہ عشق کا اللہ کے ظہور سے ہے[1]۔"

یہاں شاہ عشق کے ظہور اللہ سے جو حضرت کی مراد ہے۔ اس پر تبصرہ کرنا حقیر قلم کے شایاں نہیں۔ لیکن عشق سے جو مراد لی گئی ہے وہ تشریح کی محتاج نہیں۔

"محمد ذوقی شاہ نے امیر کبیر سید علی ہمدانی کے حوالے سے محبت کے جو مراتب بیان کیے ہیں۔ ان میں خلت، حُب اور عشق وغیرہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ذوقی شاہ نے محبت کو بھی جو عشق کی پہلی سیڑھی ہے۔ مقامِ صدیقین میں شمار کیا گیا ہے[2]۔"

خلیفہ عبدالحکیم نے عشق کو رُوح کا مقامِ اولیٰ کہا اور روح کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے خدائے لم یزل سے مناسبت ازلی حاصل ہے۔ چنانچہ خلیفہ صاحب عشق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" زندگی کا تمام کاروبار بالواسطہ یا بلاواسطہ سعیٔ حصولِ وصال ہے۔ لہٰذا کائنات میں جو کچھ ہے وہ عشق کا مظہر ہے۔ ہر قسم کی حقیقی ترقی عشق ہی کی بدولت ہوتی ہے بشرطیکہ مطلوب طالب سے ارفع ہو۔

عشقِ حقیقی کا رجحان ہمیشہ کمال کی طرف ہوگا۔ اس لیے سچے عاشق کے تمام امراض اس سے ساقط ہوتے جائیں گے۔ ذوقِ معرفت، محبت کی فراوانی، خود غرضی سے نجات، کبر و غرور کا فقدان، یہ سب خوبیاں اسی میں پیدا ہو سکیں گی جو اس مطلوب کی طرف کھینچا جا رہا

---

[1] یازدہ رسائل کراچی ۱۹۶۷ء ص ۱۸۶ تا ص ۱۸۷

[2] سرِ دلبراں ص ۱۹۰ مقام اجمیر تاریخ ندارد

ہو۔ جو جامع کمالات ہے[1]۔"

عشق

عشق کی اصطلاح بھی خلیفہ صاحب کے ہاں مسلمان صوفیا کے حوالے سے آئی ہے۔ میر تقی میر نے اپنے والد کی نسبت لکھا ہے۔

"علی متقی روز و شب خدا کی یاد میں محو رہتے تھے کبھی استغراق کی کیفیت کم ہوتی تو فرماتے بیٹا عشق کرو۔ عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظام عالم قائم ہی نہ ہو سکتا۔ سلامی عشق کا جمال اور کافر اس کا جلال ہے۔ نیکی عشق کا قرب اور گناہ اس سے دوری ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آسمانوں کی یہ گردش بھی عشق ہی کے باعث ہے یعنی وہ اپنے محبوب تک پہنچنے کی دھن میں برابر سرگرداں ہیں[2]۔"

اسی طرح محمد ذوقی شاہ کا بیان ہے۔

"تصوف کی زبان میں عشق و محبت کی تعریف یہ ہو گی کہ جمیل حقیقی کا مجملاً اور تفصیلاً اپنے کمال کی جانب میلان ہے[3]۔"

اب خلیفہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے :

"زمین میں ایک بیج ڈالا جاتا ہے، وہ بیج گرویٹیشن کے تمام جمادی مادے کے لیے نقطہ جاذب بن جاتا ہے۔ زمین میں جتنے عناصر ہیں، بیتاب عاشقوں کی طرح اپنی ہستی کو اس میں محو کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر اس تخم اور جمادی عناصر میں باہمی تجاذب نہ ہوتا تو بیج یونہی پڑا رہتا۔ جمادات جب اس طرح عشقِ نبات یا ذوقِ نشوونما میں اپنے آپ کو محو کر دیتے ہیں تو یہ فنا ان کے ارتقا کا باعث بن جاتی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ کے عشق میں فنا ہونا فنا نہیں، بلکہ ذریعۂ ارتقا ہے۔ عاشق فنا ہو کر معشوق کے اعلیٰ صفات کو جذب کر لیتا ہے[4]۔"

---

[1] حکمتِ رومی ص ۲۸ لاہور ۱۹۵۵ء

[2] ذکر میر (اردو ترجمہ بعنوان میر کی آپ بیتی از نثار احمد فاروقی) ص ۳۳-۳۴ مطبوعہ دہلی ۱۹۵۷ء

[3] سرِ دلبراں ص ۲۸۶ طبع اجمیر۔ سنہ طباعت ندارد

[4] حکمتِ رومی ص ۳۲ لاہور ۱۹۵۵ء

اس اقتباس سے ثابت ہے کہ خلیفہ صاحب عشق کو فنا اور خاتمے کے بجائے بقا یا حیاتِ جاوداں کا سبب سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشقِ الٰہی حیاتِ نو کا ضامن ہے۔ اس مقام پر خلیفہ صاحب کے خیالات مغربی صوفیا کے افکار سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ولیم جیمز نے عشقِ الٰہی کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ایک صوفی کے درج ذیل الفاظ دہرائے ہیں

"اے خدا! میری کمزوری پر رحم کر۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تیری محبت کی شدت سے فنا ہو جاؤں گی"[۱]

عقل

ہر چند کہ عقل اور عشق کی بحث میں خلیفہ صاحب نے عقل کے مفہوم کو خاص حد تک اُلجھا دیا ہے۔ لیکن بالآخر وہ اسی مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں عقل عشق کی ضد نہیں بلکہ حکمتِ الٰہیہ کا زینہ قرار پائی ہے۔ خلیفہ صاحب کے طویل بیانات سے ایسا اشارہ تلاش کرنا مشکل نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"تمام کائنات، حکمتِ الٰہیہ کی مظہر ہے اور حکمت تک رسائی عقل و دانش سے ہوتی ہے اس لیے عقل میں ترقی کرو کیونکہ یہی نردبانِ حقیقت ہے"[۲]

پھر آگے چل کر خلیفہ صاحب مولانا روم کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"وہ عقلِ جزوی سے تو انسان کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں لیکن عقلِ کل کو عشق کا ہم آغوش سمجھتے ہیں"[۳]

عقل کے بارے میں دیگر متصوفین کے بھی یہی نظریات ہیں۔ چنانچہ ذوقی شاہ نے عقل کے تین مدارج بیان کیے ہیں۔

۱۔ عقلِ اول۔ علمِ الٰہی کی تشکل کا وجود میں آنا۔

۱۔ نفسیات واردات روحانی (ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم) ص ۴۰۶۔ لاہور ۱۹۶۵ء

۲۔ حکمت رومی ص ۵۵

۳۔ ایضاً ص ۵۶

۲۔ عقلِ کلی۔ ایک ہمہ نور کہ جس سے ان علوم کی صورتیں جو عقلِ اوّل میں موجود ہیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۳۔ عقلِ معاش۔ اس نور کا نام جو قانونِ فکری میں وزن کیا گیا ہے۔

گویا عام انسان کو عقلِ معاش ہی نصیب ہے۔ پھر ذوقی شاہ ان تینوں مدارج کا باہم تعلق قائم کرتے ہیں اور عقل کی جامع تعریف بیان کرتے ہیں۔

"عقل جوہرِ فرد ہے اور مدارجِ انسانیہ خلقیہ کی طرح اس میں تعدد نہیں۔ عقلِ اوّل کو یوں سمجھنا چاہیے جیسے آفتاب۔ عقلِ کل مثل اس پانی کے ہے جس میں آفتاب کا نور پڑتا ہے۔ عقلِ معاش کی مثال ایسی ہے۔ جیسے اس حوض پانی کی شعاعیں کسی دیوار پر پڑتی ہیں۔ آفتاب کی طرف دیکھنے والا اپنا سر اوپر اٹھاتا ہے، پانی کی طرف دیکھنے والا سر نیچے کرتا ہے۔"[1]

علم

علم کو بھی خلیفہ صاحب نے عشق اور عقل کی طرح معرفتِ الٰہی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ علم کا آخری درجہ یہ ہے کہ وہ علمِ الٰہی کی حدود تک پہنچ جائے۔ چنانچہ علمِ حضوری، علمِ حصولی اور [illegible] اس مقام کے ابتدائی مدارج ہیں۔

خلیفہ صاحب کے نزدیک علم تزکیۂ نفس ہی کا ایک مرحلہ ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"علم وہ ہے جس سے انسان کو اپنی حقیقت کا علم ہو۔ ذرات کا علم، ستاروں کی گردش کا علم، نباتات کا علم، حشرات الارض کا علم، برق اور بھاپ کا علم، معرفتِ ذات اور مقصودِ حیات کے علم کے مقابلے میں محض بچوں کا کھیل ہے۔ اگرچہ وہ حیاتِ جسمانی میں اپنی افادیت رکھتا ہے۔ اصل علم تو دل کا علم ہوتا ہے۔"[2]

یہی سبب ہے کہ خلیفہ صاحب کے بقول:

"صوفیہ کہتے ہیں کہ حقیقی علم کے حصول کا ذریعہ کثرتِ معلومات اور کثرتِ کلیات نہیں بلکہ تزکیۂ نفس ہے۔"[3]

۱۔ سرِ دلبراں ص ۲۹۴-۲۹۵
۲۔ حکمتِ رومی ۴۹
۳۔ ایضاً ۴۸

باب پنجم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
کے
خطبات، مقالات اور ترجمہ شدہ مضامین

خلیفہ عبدالحکیم صاحب مترجم کی حیثیت سے :

جامعہ عثمانیہ کے ترجمے اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ وہاں کے اساتذہ نے اردو زبان کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ خلیفہ عبدالحکیم بھی اردو ادب کے انہی محسنوں میں سے ایک تھے۔ اس بات کا اعتراف تو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"کلیہ کے اساتذہ میں متعدد ایسے ہیں جو اپنی تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے اردو زبان اور ادب کی خاطر خواہ خدمت کر رہے ہیں اور جن کے فیضِ صحبت سے اُس کے طلبا میں بھی اردو کا ذوق اور اُس کی سچی خدمت کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے . . . جن کی اردو خدمت زیادہ قابلِ ذکر ہیں ان میں مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر سید عبداللطیف، عبدالباری صاحب ندوی، الیاس برنی صاحب، ڈاکٹر محمد نظام الدین، مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی حسرت، ہارون خاں صاحب شروانی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب، محمد جمیل الرحمٰن صاحب۔ سید سجاد حسین صاحب، ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ڈاکٹر جعفر حسن، عبدالقادر سروری صاحب اور عبدالمجید صدیقی صاحب وغیرہ شامل ہیں۔"[1]

---

[1] عہدِ عثمانیہ میں اردو کی ترقی ۱۹۳۴ء از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ص ۹۵

خلیفہ صاحب کے ترجموں کا آغاز بھی عثمانیہ یونیورسٹی کے دورِ قیام میں ہوا۔ انھوں نے سب سے پہلا ترجمہ ۱۹۲۸ء میں ویبر کی کتاب ہسٹری آف فلاسفی کا کیا (History of Philosophy) اردو میں اس کتاب کا نام تاریخِ فلسفہ ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔ خلیفہ صاحب کا دوسرا ترجمہ بھی عثمانیہ یونیورسٹی کے زمانۂ قیام میں شائع ہوا۔ یہ ہیرالڈ ہوفڈنگ کی کتاب ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی (History of Modern Philosophy) تھی جسے خلیفہ صاحب نے تاریخِ فلسفۂ جدید کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ اس کا پہلا حصہ ۱۹۳۱ء اور دوسرا ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ خلیفہ صاحب کی تیسری کتاب مختصر تاریخِ فلسفۂ یونان، ہے جو ایڈورڈ زیلر کی کتاب (Outline of Greek Philosophy) آؤٹ لائن آف گریک فلاسفی کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بھی دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ چوتھی کتاب نفسیاتِ وارداتِ روحانی ہے جو ولیم جیمز کی مشہور کتاب (Varieties of Religious Experience) کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۵۸ء میں پہلی مرتبہ اور ۱۹۶۲ء میں دوسری بار شائع ہوئی۔ ان کتابوں کے علاوہ چند ترجمے اور بھی ہیں مثلاً بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ جس کا ذکر ان کی شاعری کے ذیل میں آئے گا۔ ایک ترجمہ ٹریگل کے مضمون ون انڈونیشیا کا بھی ہے لیکن یہ ترجمہ چنداں اہم نہیں۔ درج ذیل سطور میں خلیفہ صاحب کے ترجموں کی خصوصیات کا مجموعی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترجموں کو فنی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) تخلیقی یا ادبی تصانیف کے ترجمے (۲) تحقیقی یا علمی تصانیف کے ترجمے۔ ادبی ترجموں کے نقادوں نے ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ مترجم کی ذات کا عکس ہو۔ مصنف اپنی تخلیق ختم کر کے اسے نقشِ اول کا درجہ دیتا ہے اور مترجم اسے دوسری زبان میں منتقل کر کے نقشِ ثانی بناتا ہے۔ دونوں نقوش میں تخلیقی حسن کا نکھار ہونا ضروری ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ دوسری صورت میں مترجم اپنے آپ کو

مصنف کی ذات کے پردے میں رکھنا ہے۔ لہٰذا مترجم کی ذات کو زیرِ نظر رکھنا ایک ترجمہ کے نقاد کا فرض ہے۔ یہ بات تو ان ترجموں کے بارے میں ہے جو تخلیقی نگارشات شاعری اور افسانہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔ لیکن جہاں علوم کی کتابوں کے ترجموں کا سلسلہ اس سے مختلف ہے۔ وہاں ادبی اظہار کے لیے تشبیہ و استعارہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں تو مخصوص حقائق ہوتے ہیں جنھیں اسی ترتیب سے دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ان ترجموں میں مترجم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا ہو۔ اصطلاحات کا علم اولین سبب ہے بڑی مشکل ہے۔ ان مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے لیے مترجم نہ صرف اصل مصنف تک کامل رسائی ضروری ہے بلکہ اس کا اتنا ہی پختہ ہمہ جہت عالم ہونا بھی لازمی ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم کے تمام ترجمے (بھگوت گیتا کو چھوڑ کر) دوسری صف میں شامل کیے جا سکتے ہیں جو علوم سے متعلق ہیں۔ ان ترجموں میں دو چیزیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

(۱) خلیفہ صاحب کا فلسفے کا ہمہ جہت مطالعہ

(۲) انگریزی اور اردو زبان پر خلیفہ صاحب کی غیر معمولی قدرت۔

فلسفہ پر خلیفہ صاحب کو جو غیر معمولی عبور حاصل تھا اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ خلیفہ صاحب کی فلسفیانہ زندگی ان کے افکار و خیالات اور دیگر کاموں کا تفصیلی جائزہ اس مقالہ کے مختلف ابواب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جن میں زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت اور اسلوب پر دسترس کے بارے میں بھی اشارات مل جاتے ہیں۔ یہاں اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ ان کے ترجمے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اصل مصنف انگریزی کے بجائے اردو میں لکھ رہا ہے۔ اردو کے ایک مشہور مترجم کا یہ قول ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے مجھے انگریزی عبارتیں اردو میں لکھی ہوئی نظر آتی ہیں یہی مثال خلیفہ صاحب کے ترجموں پر بھی صادق آتی ہے۔ ان کے ترجمے واقعتاً اصل کی تحلیل کہلاتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے ترجموں سے لے کر ان کی آخری مترجمہ کتاب "نفسیاتِ واردات روحانی" تک وہ ترجمہ کی خوبی کے آئینہ میں ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے نظر

آ گئے ہیں۔ میری دانست میں ذخیرۂ الفاظ تاریخ فلسفہ کی نسبت لغویات وارد ہو رہا ہے روحانی میں زیادہ ہے۔ یہ بات ایک چھوٹی سی مثال سے واضح ہے کہ خلیفہ صاحب نے تاریخ فلسفہ میں میتھالوجی (Mythology) کا ترجمہ خرافات کیا ہے[1]۔

یہ خالص ڈکشنری کی پیروی ہے ورنہ میتھالوجی کا ترجمہ دیو مالا یا صنمیات ایک فلسفی کے لیے زیادہ پسندیدہ ہے۔ تاریخ فلسفہ کے سلسلے میں ایک اور بات بھی بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کا اسلوب اصل اسلوب سے اس قدر متاثر ہے کہ اردو نثر کی روح انگریزی زبان کی روح میں ضم ہو گئی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم مقامات پر ہوا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ خلیفہ صاحب کا ذاتی اسلوب تاریخ فلسفہ کے ان مقامات پر واضح نہیں ہو سکا۔ دیکھا جائے تو یہ کوئی عجیب کی بات نہیں بعض اوقات جملے کی ساخت اس قدر مرکب اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ مترجم زیادہ دیر ذہنی ورزش پسند نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر ان جملوں پر غور کیجیے۔

"اناکزیمنس طالیس اور انکزیمنڈر کا شاگرد اور ایونیائی فلسفے کا تیسرا نمائندہ ہے۔ اشیا کی پیدا کرنے والی اصل کو ہوا یا سانس کہتا ہے[2]۔"

یہ جملے ساخت کے اعتبار سے واضح اسلوب کو پیش نہیں کرتے لیکن تاریخ فلسفہ کا یہ پیرا بحیثیت نثری اسلوب ترجمہ نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتا ہے۔

"گرم و سرد، خشک و تر وغیرہ اضداد دراصل عنصر اولین میں موجود تھے اور اسی میں سے یہ نہیں پائے جاتے جس میں کہ ہر ایک چیز ہر دوسری چیز کے اثر کو باطل کر دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں گے[3]۔"

تاریخ فلسفہ جدید میں خلیفہ صاحب کا اسلوب اور ذخیرۂ الفاظ تاریخ فلسفہ کی نسبت زیادہ وقیع اور وسیع ہے۔ اس کتاب کے اسلوب میں لچک محسوس ہوتا ہے۔

۱۔ تاریخ فلسفہ ص ۱۱

۲۔ تاریخ فلسفہ ص ۱۳

۳۔ ایضاً ص ۱۲

جیسے ایک مرتبہ لفظی ترجمہ کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی ہے اور جملوں کو بامحاورہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس میں انداز نثر اس قدر بے تکلف ہے کہ قلم کی روانی بہتے ہوئے دریا کی طرح معلوم ہوتی ہے اور مترادفات لفظی خلیفہ صاحب کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ یہی انداز تاریخ فلسفہ یونان کا ہے۔

نفسیات واردات روحانی خلیفہ صاحب کا آخری اور اہم ترین ترجمہ ہے۔ ولیم جیمز کی صوفیانہ اور فلسفیانہ اصطلاحوں کو اُردو کا ایسا لباس دینا کہ ولیم جیمز اُردو کا ادیب نظر آئے خلیفہ صاحب کے سوا شاید کسی شخص کے بس کا روگ نہ تھا۔ صدائے بے صدا'' سکوت گویا'' الٰہی حکمت'' الٰہی لمحہ تسلیم ذات'' حیات مسعود اور دریائے وحدت وغیرہ ایسی اصطلاحیں ہیں جن کو وضع کرنے کے لیے مشرقی زبانوں کا مکمل علم ضروری ہے۔ اس میں مغربی اور مشرقی فلسفے کا ہمہ جہت مطالعہ صاف طور پر نمایاں ہے۔ سکوت گویا کا ایک مفہوم ہمارے ہاں'' اتحاد'' کی اصطلاح میں موجود ہے'' اتحاد'' کے معنی ایسی موسیقی ہے جس میں سات سُر انضمام سے خاموشی کا روپ اختیار کر لیں۔ اس اصطلاح کو سکوت گویا کا نام دینا نہ صرف اسلامی فلسفے کے زیادہ قریب ہے بلکہ علم موسیقی کے لیے بہترین اصطلاح ہے۔ یہ بھی خلیفہ صاحب کے علاوہ کسی فلسفے کے مترجم کے ہاں نظر نہیں آئی۔ یہی خوبی'' صدائے بے صدا'' میں ہے۔

ایک بات کا اظہار نہ کرنا ناانصافی ہے کہ نفسیات واردات روحانی جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہر چند ذخیرہ الفاظ اور مطالعہ فلسفہ کے اعتبار سے خلیفہ صاحب کا اہم ترین کام ہے۔ لیکن اس کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ جامعہ عثمانیہ کے ترجموں کی نسبت اس ترجمے پر خلیفہ صاحب نے شاید بہت تھوڑا وقت صرف کیا ہے۔ ممکن ہے خلیفہ صاحب زندہ رہتے اور ان کا دوسرا ایڈیشن ان کے سامنے طبع ہوتا تو وہ اس پر نظر ثانی کر کے اس کتاب کے ان حصوں کو بھی بامحاورہ نثری اسلوب دے دیتے۔ جو اس وقت بظاہر ترجمے کی پہلی کاوش معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ نفسیات واردات روحانی خلیفہ صاحب کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے

(ب) خلیفہ صاحب کا اسلوب تقریر

جن حضرات نے خلیفہ صاحب کی تقاریر سُنی ہیں ان کی متفقہ رائے ہے کہ ان کا انداز تقریر عجیب پُر لطف تھا لطیفوں اور چٹکلوں سے لے کر دلچسپ و عالمانہ معلومات کے ذخیرے تک ان کے ہاں موجود تھے۔ اپنی مخصوص ہلکی سی مسکراہٹ سے گفتگو کرتے چلے جاتے۔ انھیں دلچسپ و سبق آموز گفتگو کرنے کا خاص سلیقہ تھا۔ وہ ہر موضوع اور ہر زبان میں خواہ اردو ہو یا انگریزی، فارسی ہو یا پنجابی ایسی دلچسپ تقریر کرتے کہ سامعین کو ذرا بھی اکتاہٹ محسوس نہ ہوتی۔ تقریر کی یہ صلاحیت ان کی جبلی تجزیوں میں سے ایک ہے یہ جوہر بچپن میں ہی نمایاں ہو گیا تھا۔ آپ فرسٹ ایئر میں تھے کہ فی البدیہہ تقاریر کا مقابلہ ہوا۔ اس میں ایم اے کے طلبا نے بھی شرکت کی تقریر کا موضوع تھا The Effect of Surrounding On Character کردار پر ماحول کے اثرات اس موضوع پر آپ نے بغیر تیاری کے دس منٹ تقریر کر کے اوّل انعام حاصل کیا۔

مدیر ثقافت لکھتے ہیں کہ "آپ کا انداز تخاطب عام فہم اور شگفتہ ہوتا جو ذہنوں پر کسی قسم کا بوجھ ڈالنے کی بجائے ایک خوشگوار تاثر چھوڑتا چلا جاتا۔ باتوں باتوں میں مطلب کی بات کہہ جاتے اور سامعین اُسے بخوشی قبول کر لیتے۔

قاضی ایم اسلم کہتے ہیں۔

پنجاب لٹریری لیگ کے جلسوں میں خلیفہ عبد الحکیم مقرر اور کبھی کبھی صدر ہوتے۔ ہر تقریر کے بعد سوال جواب کا جو سلسلہ صدر اور مقرر کے درمیان ہوتا اس میں خلیفہ صاحب دبنے کا نام نہ لیتے علمی مذاکروں اور علمی مجالس میں بھی آپ کا نمایاں کمال تھا۔[۱]

آپ خطبات اور تقریر کے دوران لطیفے، اشعار، دوہے، تمثیلیں اور علمی حوالے اس انداز سے پیش کرتے کہ مقررہ وقت سے دوگنا وقت بھی لے لیتے تو سننے والوں کو اس کا احساس تک نہ ہوتا بعض اوقات تو آپ کوئی ایسا واقعہ سنانے سے بھی گریز

---

[۱] خلیفہ صاحب کی ممتاز شخصیت از قاضی ایم اسلم اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۶ء ص ۳، ۴

ذکر کرتے ہو لوگوں کو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیتا۔ اسلامیہ کالج میں کانووکیشن کا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے آپ نے لیکچر کی تعریف جن الفاظ میں کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریر اور لیکچر کے بارے میں آپ کے اپنے خیالات کیا تھے۔

"میری بیٹی نے جو پاکستان کی ایک یونیورسٹی میں ایم۔ اے کو سائیکالوجی پڑھاتی ہے کوئی آٹھ برس کی عمر میں مجھ سے پوچھا کہ ابا جان آپ روز کہاں جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں یونیورسٹی میں جاتا ہوں اور پڑھنے والے بچوں کو لیکچر دیتا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ لیکچر کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ میں بولتا جاتا ہوں اور وہ سنتے جاتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ وہ کچھ نہیں بولتے؟ میں نے کہا کہ وہ سنتے رہتے ہیں۔ میں نے اس کو لیکچر کا عام مفہوم سمجھانے کے لیے یہ کہہ دیا حالانکہ یہ واقعہ نہیں تھا۔ اس پر وہ لڑکی کہ اچھا اب سمجھ گئی۔ لیکچر کے معنی ہیں کہانی سناتے جانا اور دوسروں کی نہ سننا میرا خیال ہے کہ لیکچر کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ میں بھی کبھی کبھی اس گناہ کے ارتکاب پر مجبور ہوا ہوں۔"[1]

مجھے خلیفہ صاحب کی سب تقاریر اور خطبات تو دستیاب نہ ہو سکے البتہ جن خطبات اور تقاریر کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب فی الواقع شگفتہ مزاج فلسفی تھے۔ سیدھی سادی باتوں میں فلسفیانہ افکار اس طرح سمو دیتے کہ دماغ ان کا بوجھ اور اشکال محسوس کیے بغیر قبول کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں منظور الدین صدیقی صاحب کی رائے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ وہ حیدر آباد کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں

"جب خلیفہ صاحب جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اس زمانے میں وہ ٹاؤن ہال باغ عام میں آرد بندو گھوش فلسفہ پر کچھ تقریر فرما رہے تھے خلیفہ صاحب کی تقریر میں ان کی گفتگو کی طرح ایک خاص شگفتگی تھی وہ فلسفہ کے نہایت دقیق مسائل کو لیے آسان اور دلچسپ انداز سے

---

[1] باہمت قوموں کا شیوہ (تقریر) از خلیفہ صاحب ثقافت اپریل ۱۹۵۸ء ص ۲۲-۲۳

"سمجھاتے تھے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی ان سے کچھ نہ کچھ ضرور اخذ کر لیتا تھا۔"[1]

خلیفہ صاحب کی تقاریر پڑھنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ کا مطالعہ وسیع اور تقریر کا انداز نرالا تھا۔ مسز نظیر پرنس ہالینڈ نے کہا۔

"میں نے اپنی عمر میں آج تک ایسا لطف نہیں اٹھایا۔ انھیں تمام مذاہب پر عبور حاصل ہے۔ بہت سے لوگوں کی تقریریں سنی ہیں مگر خدا کی پناہ اس کے مقابلے میں سب ہیچ ہیں۔"[2]

ایک اچھے مقرر کی بڑائی اس میں ہے کہ جب وہ تقریر کرے تو اکتاہٹ کی بجائے لوگ لمحہ بہ لمحہ اس میں دلچسپی محسوس کرنے لگیں اور یہ صلاحیت خلیفہ صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اسی کا اعتراف ڈاکٹر محمد باقر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"گلشن گاہ پنجاب میں مولانا روم کا دن منایا گیا۔ خلیفہ صاحب نے مجھے بتایا ہوا تھا کہ پانچ دس منٹ میں آپ صدارتی تقریر ختم کر دیں گے لیکن جب آپ تقریر کے لیے اٹھے تو مسلسل ایک گھنٹہ تک گل افشانی گفتار سے سامعین کو نوازتے رہے۔ تقریر کا یہ عالم تھا کہ بیٹھنے والوں کے سکوت میں سانسوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دیتی تھی۔"

ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں آگے یوں فرماتے ہیں خلیفہ صاحب جب تقریر شروع کرتے تو سننے والا اس حد تک آپ کی تقریر میں محو ہو جاتا کہ سوال کرنا بھول جاتا۔ وہ ایک دلچسپ واقعہ بتاتے ہیں کہ لاہور ریڈیو سٹیشن سے "مثالی فلاحی ریاست میں اسلامی تعلیم کا حصہ" پر مجھے اور خلیفہ صاحب کو بحث کے لیے دعوت دی گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دو سوال کیے تو خلیفہ صاحب یوں محو گفتگو ہوئے کہ مجھے سوال کرنے یا جواب دینے کی مہلت ہی نہ ملی اور تقریر کا وقت ختم ہو گیا۔ باہر نکلے تو خلیفہ صاحب بولے آپ سے تو میں نے سوال ہی نہیں کیا بلکہ ساری میری ہی تقریر ریکارڈ ہو گئی۔ باقر صاحب

۱۔ خلیفہ صاحب کے مذہبی عقائد از ظہیر الدین صدیقی، ثقافت، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۱۱

۲۔ انٹرویو میاں شمس الدین صاحب

۳۔ دنیائے عزیز کی خوش گفتار، از محمد باقر، اقبال ریویو، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۱۱

بولے اچھا ہوا کہ آپ کی تقریر سننے میں جو لذت حاصل ہوتی ہے۔ وہ آپ کے سامنے تقریر کرتے سے حاصل نہیں ہوتی اور پھر جب آپ تقریر کرتے ہیں تو آپ کو سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

خدیجہ بیگم صحیفہ میں شوہر نامدار کے زیر عنوان مقالے میں خلیفہ صاحب کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

"تقریر کرتے تو ایسا خاموشی کا عالم چھا جاتا کہ سوئی گرنے کی آواز سنائی دے۔ خیالات کا ایک سمندر تھا جو بہتا چلا جاتا تھا۔"[1]

بیگم رفیعہ حسن بھی اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

"خدا نے انھیں ملکہ خوش گفتاری اور انواع و اقسام کے مضامین پر فی البدیع تقریر کرنے کی ایسی خصوصیت دی ہوئی تھی کہ گھنٹوں جا ہے کسی مضمون پر بولتے چلے جائیں مجال ہے کہ سامعین میں سے کوئی اکتا جائے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ان کے دماغ میں واقعات، معلومات، موزوں اشعار و دلائل، اس روانی سے آتے چلے جاتے کہ معلوم ہوتا تھا علم و فضل کا ایک چشمہ ہے۔"[2]

پروفیسر محمد عثمان کا کہنا ہے کہ "رسینڈنٹ ہال میں خلیفہ صاحب نے تقریر کی موضوع تھا اقبال عاشقی کا گناہ ہے کیا نہیں۔ تقریر اتنی زوردار تھی کہ لوگ متاثر ہوئے بنا نہ رہے۔"[3]

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے دوران جب آپ نے برہمو سماج کے جلسے میں انگریزی میں تقریر کی تو اپنے حسن تکلم اور سحر گفتاری کا وہ عالم دکھایا کہ حیدر آباد کے چوٹی کے علمی اور ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ مزید برآں عثمانیہ یونیورسٹی کا وقار بھی بڑھ گیا۔ عزیز احمد علیہ ثقافت کے شمارے میں خلیفہ صاحب کی وہ تقریر جو انھوں

1۔ شوہر نامدار از خدیجہ بیگم صحیفہ جون، جولائی، اگست نمبر ۱ سال پہلا شمارہ ۱ ص ۲۹۱، ۲۹۲۔

2۔ خلیفہ عبدالحکیم اور ان کا نظریۂ حیات از بیگم رفیعہ حسن ایضاً ص ۳۰۱

3۔ انٹرویو پروفیسر محمد عثمان۔

نے لبنان میں پہلی مسیحی کانوکیشن میں کی تھی سننے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میں موصوف کی تقریر سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا اور اس اثر کا سبب یہ تھا کہ مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ اسلام اور مسیحیت کے اصولوں میں کتنی ہم آہنگی ہے۔"[1]

باہر کے ممالک میں جو تقاریر آپ نے کیں ان کو وہاں کے ادبی حلقوں میں خاص اہمیت دی گئی۔ امریکہ میں فورسٹ ولیم یونیورسٹی کی دعوت پر آپ نے اسلام میں دستوری قانون کے موضوع پر تقریر کی تو اسے بہت پسند کیا گیا اور دوسرے اکابر کی تقریروں کے ساتھ اسے کتابی شکل میں شائع بھی کر دیا گیا۔

ایران میں یوم اقبال کے موقع پر جو تقریر آپ نے فارسی زبان میں کی اس کے سامعین میں عبدالحمید عرفانی صاحب بھی تھے وہ لکھتے ہیں:

"خلیفہ صاحب کی فارسی زبان میں پہلی تقریر تھی اس دوران میں انھوں نے نہایت دلچسپ لطیفے اور داستانیں بیان کیں اگرچہ ان کا تلفظ اور لہجہ ایرانی نہ تھا لیکن الفاظ نہایت صاف اور علیحدہ علیحدہ ادا کرتے تھے جس سے حاضرین کو سمجھنے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ یہ تقریر باقی پروگرام کے ساتھ ریڈیو تہران سے تمام ملک میں سنی گئی۔ پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔"[2]

ایک اچھا مقرر اپنے انداز اور دلائل سے سامعین کا دل موہ لیتا ہے۔ ڈاکٹر گروان بام آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بحث و مذاکرہ میں آپ کا رنگ زیادہ کھلتا تھا بحث و مباحثہ میں بات کو تہ تک پہنچ جانا، مشکل سے مشکل موضوع پر سادہ الفاظ میں گفتگو کرنا اس شان سے کہ لطف ادا میں بھی فرق نہ آنے، وہ اپنے عقائد کے سلسلے میں مفاہمت کیے بغیر اپنے مخاطب کا دل موہ لیتے۔ اختلاف رائے کے باوجود وہ مخالفین سے بدمزگی کا موقع نہ آنے دیتے۔"[3]

---

۱ ڈاکٹر خلیفہ کے حکیمانہ تصورات از ڈاکٹر م ع ریاض خلیفہ ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۳۳

۲ خلیفہ صاحب ایران میں از عبدالحمید عرفانی صاحب ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۶۴

۳ مقالہ از ڈاکٹر گروان بام ثقافت جون جولائی ۱۹۶۰ء ص ۲۵

خلیفہ صاحب نے مختلف اوقات میں جو خطبات پیش کیے۔ ان کی ایک فہرست درج ذیل ہے۔ ان خطبات میں ان کی نشری تقریریں بھی شامل ہیں اور وہ خطبات بھی جو بعض خاص تقاریب میں پڑھے گئے۔ آخر میں اقبال ریویو (جنوری ۱۹۶۶ء) کے حوالے سے ان تقریروں کے عنوانات بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ جن کی تاریخ اور تقریب دریافت نہیں ہو سکی۔

فہرست خطبات خلیفہ عبدالحکیم

(۱) کردار پر ماحول کے اثرات

۱۹۱۲ء زمانہ طالب علمی، فسٹ ائیر کلاس، کالج کے ایک مقابلے میں، فی البدیع تقریر۔

(۲) دُنیا میں آئندہ مذہب کیا ہوگا؟

۱۹۲۵ء لاہور کا ایک جلسہ زیرِ صدارت لیڈی عبدالقادر۔ اس جلسے میں فلورنس ہالینڈ بھی شریک تھیں۔

(۳) اقبال عاشقی کا گنہگار نہ تھا۔

۱۹۵۰ء سینٹ ہال لاہور۔ یومِ اقبال کے موقع پر جلسہ عام سے خطاب۔

(۴) صدارتی خطبہ یومِ اقبال

۱۹۵۱ء آرٹ کونسل، لاہور

(۵) بنیادی انسانی حقوق

خطبہ صدارت، پولیٹیکل سائنس کانفرنس،

پشاور ۱۹۵۱ء

(۶) "اقبال"

۲۱ اپریل ۱۹۵۲ء۔ سفارت خانہ ایران میں یوم اقبال کے موقع پر خطبہ جس میں بتایا کہ اقبال نے ملا پر اس کی گمراہی کے سبب سے نکتہ چینی کی ہے۔

(۷) اسلام میں تصورِ قانون

۱۹۵۲ء۔ نورے ولیم یونیورسٹی کے ایک مذاکرے میں۔

یہ تقریر بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کر دی گئی۔

(۸) نئی پود کے لیے روحانی اقدار کی ضرورت

۱۹۵۴ء لبنان میں بحمدون کے مقام پر پہلی مسلم مسیح کانوکیشن سے خطاب۔ اس میں آپ نے کہا۔ قدرت کا ہم سے مطالبہ ہے کہ ہم دنیا کو اپنی کوشش سے بہشت بنانے میں اس کے ساتھ تعاون کریں۔

(۹) اسلامی تہذیب کا تصور

۱۹۵۴ء ایک علمی مباحثہ منعقدہ ریڈیو پاکستان لاہور زیر صدارت جناب جسٹس ایس۔ اے رحمان۔ شرکائے بحث: مولانا عبدالمجید سالک، جناب مظہرالدین صدیقی، مولانا حامد علی خاں اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔

اس تقریر میں آپ نے اسلامی تہذیب کے بارے میں بتایا کہ اسلام کا ماخذ قرآن اور اس برگزیدہ ہستی کا کردار ہے جس نے اپنے قول و فعل سے تہذیب کا ایسا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔

(۱۰) خطبہ تقسیم اسناد

آغاز ۱۹۵۶ء انڈیانا یونیورسٹی امریکہ۔

اس خطبے کو امریکہ کے علمی اور ادبی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

(۱۱) اسلام اور انقلاب

۱۹۵۶ء مسلم کرسچین کانوکیشن۔

(۱۲) مذہبی مسائل

دسمبر ۱۹۵۶ء بین الاقوامی مجلس مذاکرہ منعقدہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

اس مذاکرے میں ایران کے علماء ڈاکٹر رضازادہ شفق پروفیسر سعید نفیسی اور پروفیسر فیروز النفر بھی شریک تھے۔

(۱۳) ثقافت

فروری ۱۹۵۷ء پاکستان اورنٹیل کانفرنس

اس میں ثقافت کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے اسلامی ثقافت کا تصور پیش کیا گیا۔

(۱۴) تصور وحی

جولائی ۱۹۵۸ء مسلم کمیونیز کی نوکیشن۔

(۱۵) باہمت قوموں کا شیوہ (صدارتی خطبہ)

۱۰ مارچ ۱۹۵۸ء جلسۂ تقسیم اسناد اسلامیہ کالج لاہور

خلیفہ صاحب نے اس خطبے میں کہا "باہمت قوموں کا شیوہ یہ نہیں کہ حالات کی مرثیہ خوانی کریں اور یہ سوچیں کہ ایک آدمی کے کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے ایک شخص کے نفس کا انقلاب دوسروں میں انقلاب پیدا کرتا ہے نفس کی نیکی اور بدی متعدی نہیں۔ دیانتداری اور خودداری کی مثال قائم کریں تنگ نظروں کو نشانۂ ملامت بنانے کے بجائے اپنے اندر وسعت نظر پیدا کریں۔ رفاہ خلائق کو دین کا اہم جز بنائیں۔ پاکستان جلتے وقت جو وعدے کیے گئے تھے کہ آزاد ملک میں اس کی معیشت معاشرت و سیاست کو پاکیزہ اور عادلانہ اسلامی اخلاق میں ڈھالیں گے اور یہی باہمت قوم کا شیوہ ہے۔

(۱۶) مثالی تعلیم میں اسلامی تعلیم کا حصہ

۲۸ دسمبر ۱۹۵۸ء

ریڈیو مذاکرہ منعقدہ لاہور شرکا خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر محمد باقر

(۱۷) اسلام اور دنیائے جدید کے تقاضے

جنوری ۱۹۵۹ء بین الاقوامی مذاکرہ منعقدہ کراچی

اسلام پر مغربی علماء کے اعتراضات کے جواب

(۱۸) اسلام کس طرح نئی پود تک اپنی روحانی اور اخلاقی اقدار پہنچا سکتا ہے

۱۹۵۹ء بحمدون، لبنان، بین الاقوامی مجلس مذاکرہ

(نشست اول)

مندرجہ ذیل خطبات کا صحیح زمانہ دریافت نہ ہو سکا۔ بعض پر قیاساً سنین درج کر دیئے گئے ہیں۔

(۱۹) روح اور ذاتِ خداوندی (انگریزی زبان میں)

برہمو سماج کا جلسہ دورانِ ملازمت عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۴ء

(۲۰) علامہ اقبال سے میری ملاقات

ریڈیو پاکستان غالباً ۱۹۴۸ء کے بعد

(۲۱) اسلام کا تصورِ ریاست (انگریزی زبان میں)

گورنمنٹ کالج لاہور (غالباً ۱۹۴۹ء کے بعد)

(۲۲) فطرتِ اسلام نشر کا گو

(۲۳) اقبال کا فلسفۂ خیر و شر

سن نامعلوم ۔ بحوالہ اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۶ء

(۲۴) اقبال کے ہاں تقدیر کا تصور

ایضاً

(۲۵) اقبال اور تصوف

ایضاً

(۲۶) اسلام کا موقف دوسرے مذاہب کے مقابلے میں بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ

منگل ۷ جنوری ۱۹۵۸ء

(۲۷) یوم رومی ۱۷ دسمبر ۱۹۵۰ء خطبہ صدارت سینٹ ہال

(۲۸) آزادی کی نفسیات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی یہ تقریر ۱۹۴۶ء کے اوائل میں دکن ریڈیو حیدرآباد سے نشر کی گئی تھی۔ (آج کل دہلی جون ۱۹۴۶ء)

(۲۹) ملائیت (تقریر)

(ریڈیو پاکستان لاہور)

(۳۱) لاہور (تقریر)

ریڈیو پاکستان لاہور

ج ۔ مقالات

مستقل تصانیف کے علاوہ خلیفہ صاحب کے مقالات بھی وقتاً فوقتاً مختلف علمی و ادبی مجلسوں میں شائع ہوتے رہے ۔ یہ مقالات سیاسی ۔ ادبی فلسفیانہ اور مذہبی مسائل سے متعلق ہیں ۔ ان میں سے متعدد مقالات (مثلاً رومی اور اقبال سے متعلق مقالے) ان کی تصانیف کے جزو بن گئے ۔ تاہم ان کے مقالات کی ایک مفصل فہرست مختلف رسائل کے حوالے سے یہاں درج کی جاتی ہے ۔ یہ فہرست جامع یا مکمل نہیں کہی جا سکتی لیکن میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان کا کوئی اہم مقالہ چھوٹنے نہ پائے ۔

فہرست مقالات خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

مجلہ اقبال (بزمِ اقبال ۔ لاہور)

(۱) اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم اکتوبر ۱۹۵۲ء

(۲) اقبال اور مُلّا اکتوبر ۱۹۵۳

المعارف

(۳) پاکستان ۔ چند سوال اور ان کا جواب اگست ۱۹۶۸ء

مجلہ ثقافہ (مجلس ترقی ادب لاہور)

(۴) تشبیہاتِ رومی مارچ ۱۹۵۸ء

رسالہ ماہِ نو کراچی)

(۵) اقبال اور تصوف اپریل ۱۹۵۱ء

(۶) مولانا روم اور اقبال اپریل ۱۹۵۲ء

(۷) اقبال کا تصورِ ملت اپریل ۱۹۵۳ء

(۸) اسلامی ثقافت کی روح اپریل ۱۹۵۴ء

رسالہ ہمایوں (لاہور)

(۹) فلک پیما — ستمبر ۱۹۵۱ء

(۱۰) اقبال اور افلاطونی فلسفہ — اپریل ۱۹۵۲ء

(۱۱) عہدِ نو (کیا کیا کچھ) — مارچ ۱۹۵۵ء

(۱۲) اقبال (کیا کیا کچھ) — اپریل ۱۹۵۵ء

(۱۳) رومی اور فلسفہ جبر و قدر (کیا کیا کچھ) — جون ۱۹۵۵ء

(۱۴) عالمِ ارواح میں ابنِ سینا سے ملاقات (کیا کیا کچھ) — ستمبر ۱۹۵۵ء

(۱۵) اسلام میں مادی ترقی کا مفہوم — نومبر ۱۹۵۵ء

(۱۶) انسان — سالنامہ ۱۹۵۸ء

مجلہ ثقافت (ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور)

(۱۷) (الف) وحدتِ ملی — جنوری ۱۹۵۵ء

(۱۷) ایک پورٹریٹ — جنوری ۱۹۵۵ء

(۱۸) عہدِ نو — فروری ۱۹۵۵ء

(۱۹) رومی کا تصورِ آدم — مارچ ۱۹۵۵ء

(۲۰) قرآن حکیم میں حکمت کا مفہوم — اپریل ۱۹۵۵ء

(۲۱) رومی اور مسئلہ جبر و قدر — مئی ۱۹۵۵ء

(۲۲) تعددِ ازدواج — جون ۱۹۵۵ء

(۲۳) پیغمبرِ اسلام اور حدیثِ انسانی — جولائی ۱۹۵۵ء

(۲۴) ابن سینا سے ملاقات — اگست ۱۹۵۵ء

(۲۵) اسلام اور آزادیٔ فکر — ستمبر ۱۹۵۵ء

(۲۶) اسلام میں مادی ترقی کا مفہوم — اکتوبر ۱۹۵۵ء

(۲۷) انڈونیشیا (INDONESIA) — نومبر ۱۹۵۵ء

یہ جیمز کے مضمون INDONESIA کا ترجمہ ہے۔

(۲۷ الف) انفرادی اور اجتماعی اخلاقیات	دسمبر ۱۹۵۵ء
(۲۸) انقلاب	جنوری ۱۹۵۶ء
(۲۹) اسلام اور جمہوریت	فروری ۱۹۵۶ء
(۳۰) اسلام اور جنگ و امن	مارچ ۱۹۵۶ء
(۳۱) اسلام کا تصور مملکت	اپریل ۱۹۵۶ء
(۳۲) رومی اور مسئلہ وحدت الوجود	مئی ۱۹۵۶ء
(۳۳) اسلام کا سیاسی و معاشی تصور	جولائی ۱۹۵۶ء
(۳۴) عیسائی اسلامی کانفرنس اور اس کے مقاصد	اگست ۱۹۵۶ء
(۳۵) ممالک متحدہ امریکہ میں مذہبی زندگی	ستمبر ۱۹۵۶ء
(۳۶) تشبیہات رومی	اکتوبر ۱۹۵۶ء
(۳۷) تشبیہات رومی	نومبر ۱۹۵۶ء
(۳۸) سابق گورنر جنرل غلام محمد	دسمبر ۱۹۵۶ء
(۳۹) نبی کریمؐ کی تعلیم کے بنیادی عناصر	جنوری ۱۹۵۷ء
(۴۰) جاوید نامہ	مارچ ۱۹۵۷ء
(۴۱) اسلام اور ضبط ولادت	اپریل ۱۹۵۷ء
(۴۲) رومی کی چند تشبیہات	مئی ۱۹۵۷ء
(۴۳) اسلام کا بنیادی عقیدہ	جون ۱۹۵۷ء
(۴۴) رومی کی چند تشبیہات	اگست ۱۹۵۷ء
(۴۵) اصول و اوامر	دسمبر ۱۹۵۷ء
(۴۶) رومی کی چند تشبیہات	اکتوبر ۱۹۵۸ء
(۴۷) تجدید و احیا	نومبر ۱۹۵۷ء
(۴۸) تجدید و احیا	دسمبر ۱۹۵۷ء
(۴۹) رومی کی چند تشبیہات	فروری ۱۹۵۸ء

(۵۰) اسلام اور مذہبی رواداری — مارچ ۱۹۵۸ء

(۵۱) اقبال کی زندگی — مئی ۱۹۵۸ء بحوالہ آثار اقبال

(۵۲) رومی کی چند تشبیہات — جولائی ۱۹۵۸ء

(۵۳) رومی کی چند تشبیہات — اگست ۱۹۵۸ء

(۵۴) رومی کی چند تشبیہات — ستمبر ۱۹۵۸ء

(۵۵) رحمت اللعالمین — اکتوبر ۱۹۵۸ء

(۵۶) رومی، نطشے اور اقبال — دسمبر ۱۹۵۸ء

(۵۷) رومی، نطشے اور اقبال — (رسالہ اردو اقبال نمبر ۱۹۳۸ء) جنوری ۱۹۵۹ء

(۵۸) رومی، نطشے اور اقبال — فروری ۱۹۵۹ء

(۵۹) وحدت انسان اور عقیدہ توحید — مئی ۱۹۵۹ء

(۶۰) رواقیت — جولائی ۱۹۵۹ء

(۶۱) اپی قوریت — اگست ۱۹۵۹ء

(۶۲) تشکیک — اکتوبر ۱۹۵۹ء

(۶۳) فنون لطیفہ — فروری ۱۹۶۰ء

(۶۴) مادیت انیسویں صدی میں — مارچ ۱۹۶۰ء

(۶۵) فطرت کا مفہوم — اپریل ۱۹۶۰ء

(۶۶) فلسفہ کا آغاز — مئی ۱۹۶۰ء

(۶۷) ایمان کیا ہے — جون جولائی ۱۹۶۰ء

(۶۸) آزادی کی نفسیات — نومبر ۱۹۶۰ء

(مقالہ مذکور حصہ دوم رسالہ آج کل دہلی — جنوری ۱۹۴۶ء)

(۶۹) افادیت رومی — دسمبر ۱۹۶۰ء

(۷۰) رومی اور اقبال — اپریل ۱۹۶۲ء

(۷۱) علم اور عشق مشمولہ کتاب "درس زندگی" (مرتبہ تالیف، احمد شاہ و پطرس بخاری، ادارہ ادبیات اردو)

(۷۲) اقبال اور ان کی شاعری — سب رس حیدرآباد دکن اقبال نمبر جون ۱۹۳۸ء

(۷۳) اقبال کی شخصیت — نقوش لاہور شخصیات نمبر ۱۹۵۲ء

(۷۴) اقبال کا تصورِ خودی — ماخوذ از ترجمان اسرار

(۷۵) اساسِ اسلام — مشمولہ کتاب اسلام کی بنیادی حقیقتیں شائع کردہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

(۷۶) وحدتِ مغربی پاکستان کی نظریاتی بنیاد — یہ مقالہ سولہ صفحات پر مشتمل کتابی صورت میں ہے۔

خلیفہ صاحب نے انگریزی میں متعدد مقالات لکھے جو پاکستان کوارٹرلی اور مجلہ اقبال کے انگریزی شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے انگریزی مقالوں میں سے ایک مقالہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جو سائنس اینڈ کلچر سیریز Moral Principles of Action) کی کتاب میں شامل کیا گیا مقالے کا عنوان یہ ہے۔ (ONE GOD ONE WORLD ONE HUMANITY)

اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۶ء میں خلیفہ صاحب کے انگریزی مقالوں کے حوالے مختلف مقامات پر درج ہیں اور مقالہ نگاروں نے انھیں غیر مطبوعہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن یہ چاروں انگریزی مقالے دراصل ان کی زیرِ تصنیف انگریزی کتاب کے مختلف اجزا ہیں خلیفہ صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں مذہب اسلام پر ایک جامع اور مبسوط کتاب لکھ رہے تھے۔

اس کتاب کے ابتدائی حصے میں بعثتِ نبوی سے پہلے یعنی دورِ جاہلیت کے حالات اور پیغمبرِ اسلام کی حیاتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد ازاں مذہب اسلام کی بنیادی خصوصیات پر جدید علوم اور جدید حالات و نظریات کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے اسلام کو ایک ابدی اور آفاقی دین ثابت کیا گیا ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ لکھا جا چکا تھا۔ لیکن افسوس کہ موت نے اس کی تکمیل کی مہلت نہ دی۔ مگر کتاب موجودہ صورت میں بھی نہایت بصیرت افروز ہے۔

آج کل یہ کتاب خلیفہ صاحب کے ایک فاضل اور قابلِ قدر شاگرد پروفیسر حمید احمد خاں کے ہاتھوں تکمیل کی آخری حدوں کو پہنچ رہی ہے۔ پروفیسر صاحب کے خیال میں اس کتاب میں رسولِ اکرم کی زندگی کی تعبیر اس طرح کی ہے، کہ نئے ذوق کے لوگ اسے موجودہ حالات میں قبول کر لیں۔ اس کے علاوہ موجودہ رجحان اور موجودہ زندگی کے تقاضوں کی روشنی میں رسول اللہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات جو نظر انداز کر دیے گئے تھے۔ انھیں اس طرح پیش کیا ہے جس سے دورِ جدید کے لیے رسول اللہ کی زندگی سرچشمہ حیات بن جاتی ہے۔

تعددِ ازدواج پر اکثر کمزور عقیدے کے لوگ بحث میں گھبرا جاتے ہیں مگر خلیفہ صاحب نے بہت عمدہ بحث کی ہے۔

حقیقتِ اسلام پر جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً دینی ادب میں اضافہ ہے۔
غیر اسلامی دنیا کے لیے یہ کتاب قابلِ قدر اور مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ یقیناً خلیفہ صاحب کا اس کتاب کا انگریزی میں لکھنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ نے یہ کتاب جدید رجحان رکھنے والے مسلمان اور غیر مسلموں کی دلچسپی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے لکھی ہے۔

کتاب کے جو ابواب لکھے جا چکے ہیں۔ ان کے عنوانات کی فہرست درجِ ذیل ہے۔
اقبال جنوری ۱۹۶۲ء میں مقالہ نگاروں نے جن مضامین کے حوالے دیے ہیں۔ ان پر درجِ ذیل فہرست میں یہ نشان (✳) لگا دیا ہے۔

CONTENTS

ADINA

6. Political Struggle
7. Compelled to Fight
8. Morals and Manners : Religion and Morality
9. The Religion of Love
10. Rights and Duties
11. The Ethical Teachings of Islam under Specific Headings : (i) Truthfulness, (ii) Charity, (iii) Moderation, (iv) Justice
12. Islam's Ideal Man
13. How Islam Revolutionised Arabic Society
14. Is Universal Religion Possible ? The Eternal Truth of Islam
15. Evolution
16. Religion and Symbolism; Islam and Symbolism; al-Ghazali and Shah Wali-Ullah
17. Islam and Democracy
18. Law and Islam ; Law in Earlier Societies

ENGLISH SPEECHES

1) "Fundamental Human Rights," Read as Presidential Address at the Political Science Conference, Peshawar, 1951.
2) "The Role of Religion in Social and Political Development in Pakistan," New York, 8 January 1952.

(3) "The Role of Islam between the Ideas of Communism and Democracy," Boston, 11 January 1952.

(4) "Impact of Communism on Islam," Cleveland, 18 January 1952.

(5) "Development in the Moslem World, with Particular Reference to Pakistan," Minnesota Club, St. Paul, 29 January 1952.

(6) "Stirrings in the Moslem World," University of Minnesota, St. Paul, 30 January 1952.

(7) "The Moslem Sheds His Bonds: What is his ideology?" St. Paul, 31 January 1952.

(8) "Islamic Culture and Ideology" (With Special Reference to Pakistan), University of Utah, 13 February 1952.

(9) "Moslem Culture and Its Influence on Present World Affairs," Seattle World Trade Club, 14 February 1952.

(10) "The Place of Pakistan in World Affairs," Seattle, 15 February 1952.

(11) "Pakistan," Junior High School, Eureka, San Francisco, California, 19 February 1952.

(12) "World Affairs Are Your Affairs" (Radio Talk, Radio Station K.N.B.), San Francisco, California, 21 February 1952.

(13) "Islamic Culture and Social Life," Sacramento State College and Sacramento Junior College, Sacramento, 26 February 1952.

(14) "Contrast in Islamic and Hindu Philosophical Tendencies," University of New Mexico Philosophical Society, Albuquerque, New Mexico, 5 March 1952.

(15) "Islamic Culture and Ideology With Special Reference to Pakistan," Mitchell Hall, University of Mexico, 4 March 1952.

(16) " Cultural Heritage of Pakistan," Dallas, 7 March 1952.

(17) " Pakistan, Islamic Democracy," University of Houston on Campus, 12 March 1952.

باب ششم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم شاعر کی حیثیت سے

خلیفہ عبدالحکیم کی شاعری کا آغاز بعض روایات کے مطابق اُس زمانے سے ہوا، جب وہ میٹرک میں پڑھتے تھے۔ ان راویوں میں خلیفہ صاحب کے دو دوستوں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں پہلے نجم الدین صاحب اور دوسرے ایم ایم شریف صاحب۔ یہ دونوں حضرات خلیفہ صاحب کے سکول میں ہم درس تھے۔ پروفیسر ایم ایم شریف مرحوم کا کہنا ہے کہ خلیفہ صاحب جب ساتویں جماعت میں تھے اُس وقت اُنھوں نے ایک نظم لکھی تھی جو کشمیری میگزین لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ خلیفہ صاحب کے ساتویں جماعت میں زیرِ تعلیم ہونے کا سال غالباً ۱۹۰۷ء ہے۔ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے جس کے ضعیف ہونے کا غالباً بہت کم امکان ہے تو اس بات کو تسلیم کرنے سے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ کہ ۱۹۰۷ء میں خلیفہ صاحب کے اندر شعری ذوق پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے بعض ہم جماعتوں نے یہ بھی کہا ہے کہ خلیفہ صاحب اُن دنوں سکول کی بزمِ ادب کے روحِ رواں تھے۔

۱۹۰۷ء کو خلیفہ صاحب کی شاعری کا نقطۂ آغاز سمجھ کر اگر اُس زمانے کی لاہور کی ادبی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس کا خاکہ کچھ اس طرح سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔

حکیم احمد شجاع مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ "۱۸۹۰ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین نے اُردو زبان کی روز افزوں اور ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر ایک اُردو بزمِ مشاعرہ انجمن اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ جب تک میرے والد زندہ رہے، یہ بزمِ مشاعرہ قائم رہی۔ مرزا ارشد گورگانی دتی سکول کے بیرد تھے۔ میر ناظر حسین ناظم لکھنوی

زبان کے دلدادہ۔۔۔ دونوں ٹولیاں جب اس بزم مشاعرہ میں اپنا رنگ جمانے کے لیے مصروف غزل خوانی ہوتی تھیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی روایات کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ ۱۸۹۶ء کے آخر میں میرے والد ماجد نے اس جہانِ فانی سے رحلت کی۔ میرے بھائی حکیم امین الدین نے میرے دوسرے بھائی حکیم شہباز الدین کے ساتھ مل کر شور محشر (بزم مشاعرہ) کو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ مگر جو بات ایک بار بگڑ چکی تھی نہ بنی۔۔۔ وہ صاحبانِ ذوق جنھیں اس بزم مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی۔ اب ہر روز ہمارے مکان پر جمع ہو جاتے تھے۔ سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گل عابد، مولوی احمد دین، مولوی حسن، میاں نذر محمد، منشی معید الله لونگی اور سید محمد شاہ وکیل ان لوگوں میں سے تھے جو قریب قریب ہر روز شام کو اس دیوان خانہ میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اس ادبی محفل میں شعر و سخن کی کئی محفلیں معرض وجود میں آئیں تھے۔[1]

اس مقالے میں حکیم احمد شجاع صاحب نے اس دور کی ادبی زندگی کو ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے۔

"۱۹۱۲ء میں جب ذوالفقار علی خاں پٹیالے سے آ کر لاہور میں مقیم ہوئے تو ان کی اقامت گاہ کو زر افشاں کے محبوب نام سے موسوم ہے ایک اور ادبی محفل کا مرکز بن گئی۔ جناب اقبال کی آمد و رفت بھی اس طرف شروع ہو گئی تھی۔"[2]

اس ادبی مضمون پر مفصل روشنی حکیم احمد شجاع نے اپنی تصنیف خوں بہا میں بھی ڈالی ہے اور عبداللہ قریشی نے اپنے مضمون حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں مطبوعہ اقبال اکتوبر ۱۹۴۲ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ان ادبی مجالس کا تعلق بھاٹی دروازے

---

[1] اردو شاعری میں لاہور کا حصہ از گوہر نوشاہی مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری بحوالہ "لاہور کی پرانی ادبی مجلسیں" مطبوعہ ماہنامہ ادب لطیف لاہور شمارہ ۱۹۷۵ء

[2] ایضاً۔

کے اندر بسنے والے گھروں سے ہے ۔ اس زمانے میں بھاٹی دروازہ شعر و ادب کا اہم مرکز تھا۔ آپ کے اس شعر سے ان ادبی محفلوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

بھاٹی دروازے کی جانب ایک دن جاتا تھا میں
شام کو گھر بیٹھے رہنا قابلِ الزام ہے

بھاٹی دروازے سے یہ ادبی صحبتیں نکل کر مختلف محلوں میں پھیل گئیں ۔ کشمیری بازار اور موچی دروازہ ان محفلوں کے مرکز بنے ۔ اقبال کا اسی غزل کا دوسرا شعر ہے ۔

موچی دروازے میں ہیں محشر الاطبا زماں
اُن سے امیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے

اس روداد کے پس منظر میں خلیفہ صاحب کی شاعری کی ابتدا ہوئی ۔ خلیفہ صاحب نے ۱۹۰۷ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس اعتبار سے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک کے چھ سال اُن کی شعری تربیت سے تعلق رکھتے ہیں جن پر بھاٹی دروازے کی ادبی اور شعری صحبتوں کا اثر قرینِ قیاس ہے ۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۷ء تک خلیفہ صاحب نے لاہور سے باہر رہ کر تعلیم حاصل کی ظاہر ہے اس زمانے میں ان کی شعر و سخن سے بے تعلقی نہ تھی ۔ بی اے کے زمانے کی شاعری کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ۔ ۱۹۱۷ء میں خلیفہ صاحب دوبارہ لاہور آ گئے اور ایم اے میں داخلہ لیا ۔ لیکن اس زمانے سے پہلے ہی وہ لاہور کی شعری محفلوں میں برابر شریک ہوتے رہتے تھے جس زمانے میں خلیفہ صاحب ایم اے میں پڑھتے تھے اور دہلی میں ان کا قیام تھا ۔ لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں خلیفہ صاحب نے امیر مینائی کی زمین میں ایک غزل کہہ کر سنائی ۔ اس زمانے میں دہلی اور لاہور کے درمیان بُعدِ مکانی بہت کم تھا ۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء تک کا خلیفہ صاحب کا قیامِ لاہور خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ مرزا ذوالفقار علی کے گھر کی ادبی محفلیں جن کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے ۔ اس زمانے میں عروج پر تھیں اور اقبال ان محفلوں کی روح تھے ۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ابتدا میں خلیفہ صاحب علامہ اقبال کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے

کیا نغمہ وصا مثنوی مولانا روم سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اقبال کی طرح وہ بھی رومی کو اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔ خلیفہ صاحب کا طبعی رجحان صوفیانہ یا حکیمانہ تھا۔ جو اول تا آخر ان کے کلام پہ چھایا رہا۔ رومی اور اقبال کی طرح خلیفہ صاحب بھی ارتقائی فلسفی ہیں۔ اقبال اور ان کے افکار و رجحانات میں بڑی حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔ دونوں نے مشرقی و مغربی علوم کو کھنگالا۔ دونوں کا فلسفہ رجائی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اقبال نے اپنا ایک مستقل نظام فلسفہ مرتب کیا۔ خلیفہ صاحب اپنے کلام میں حکمت و فلسفہ کے موتی رولتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی انفرادی مستقل فلسفہ نہیں ہے دوسرے یہ کہ خلیفہ صاحب کے دل و دماغ پہ تصوف کا گہرا اثر ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں وحدت الوجود پر مشتمل اشعار بکثرت ملتے ہیں۔

خلیفہ صاحب کی شاعری کے بارے میں ان کے معاصرین کی آرا

آغا حشر ایک مرتبہ لاہور آئے، برکت علی محمڈن ہال میں مشاعرہ ہوا خلیفہ صاحب نے "دیدہ تر" والی غزل پڑھی۔ آغا حشر بہت محظوظ ہوئے اور دوستوں کو کہا اسے پکڑ کر میرے سامنے لاؤ۔ جب آپ حاضر ہوئے تو انھوں نے کہا۔

"کہ اس عمر میں میں اس سے اچھی غزل نہیں کہہ سکتا تھا"[1]

اس غزل پر بقول میاں بشیر صاحب علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

"خلیفہ صاحب نے قوم کو زندگی بخشنے والی نظم پڑھی ہے"[2]

عبداللہ قریشی صاحب اور تاریخ اقوام کشمیر میں محمد الدین فوق لکھتے ہیں۔

"اس نظم کو اقبال نے بہت پسند کیا اور جب آغا حشر تک اس کی گونج پہنچی تو آپ نے خلیفہ صاحب سے فرمایا یہ اشعار میرے دماغ میں گونجتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ اس زمین میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ اس پایہ کے اشعار نہ نکل سکے اس

۱۔ انٹرویو خلیفہ عبدالغنی صاحب

۲۔ انٹرویو میاں بشیر صاحب

سے بڑھ کر تھیں اور کیا داد دوں؟[1]

اور دیکھیں زیرِ تحریر یہ غزل واقعی ان آرا پر پوری اُترتی ہے۔

کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر	بارشِ تیر جوادث میں جگر پیدا کر
گرمِ رہ ہو کر جہاں نقشِ قدم ہو تیرا	اس کفِ خاک میں بھی برق کے پر پیدا کر
تو اگر چاہے کہ گم ہو شبِ تاریک تری	سینۂ چاک پہ اندازِ سحر پیدا کر
قطرہ آغوشِ تلاطم میں گہر بنتا ہے	آبرو چاہے تو طوفاں میں گہر پیدا کر
خواہش تیغ کو ہے قوتِ بازو کی بھی شرط	آرزو تاج کی ہے تجھ کو تو سر پیدا کر
تیغِ ہستی کے لیے سنگِ فساں ہے پیکار	راہ ایمن ہے تو خود اس میں خطر پیدا کر

مخزن کے ایڈیٹر مولانا تاجور نجیب آبادی خلیفہ صاحب کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"خلیفہ صاحب پنجاب کے اُن قابلِ قدر ہونہار نوجوانوں میں ہیں جن پر علمی دنیا ناز کرے گی۔۔۔ قدرت کی فیاضیاں دیکھیے کہ خلیفہ صاحب کو شاعری کی دنیا میں بھی وہی مرتبہ حاصل ہے جو جہانِ فلاسفی میں، ڈاکٹر اقبال کے بعد پنجاب بھر میں آپ سے بہتر کوئی شاعر نہیں ہے۔"[2]

تاجور صاحب نے خلیفہ صاحب کی غالب والی نظم دیکھنے کے بعد کہا۔

"آپ نے غالب مرحوم پر نظم غالب کے ہی رنگ میں لکھی ہے۔ الفاظ کا شکوہ اور خیالات کی فلک پروازی اس نظم میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جس نظر سے انھوں نے غالب کو دیکھا ہے وہ نظر ہر ایک کے پاس نہیں۔"[3]

---

[1] مقالہ از عبداللہ قریشی اقبال ریویو ۶-ش-۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱۲۸

نیز تاریخ اقوامِ کشمیر جلد سوم ص ۷۰۔

[2] تبصرہ از مولانا تاجور نجیب آبادی مخزن نومبر ۱۹۱۸ء ص ۲

[3] ایضاً ص ۲

ہوئے کلمۂ حق کہہ گزرنا، جابر اور ظالم کے سامنے سپر نہ ڈالنا، ارتقائے انسانی پر نظر رکھتے ہوئے حیات اور کائنات کے رموز سے پردہ اٹھا کر "حیات" کو ماندگی کا وقفہ سمجھنا خیر و شر کی حقیقت کو اس مقام سے واضح کرنا جہاں ہر جرم سزا کی دارو گیر سے باہر ہو جائے، یہ اور اس قبیل کے دیگر عناصر جو انسانیت کو "خوب سے خوب تر" کا درس دیتے ہیں، خلیفہ صاحب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ خلیفہ صاحب بنیادی طور پر رجائی شاعر ہیں۔ ان کے ہاں افسردگی نام کو نہیں اور ان کی شاعری اوّل تا آخر نشاطیہ لب و لہجہ لیے ہوئے ہے۔ وہ فلسفہ غم کی ہر گتھی سے آشنا ہیں۔ ایک سچے فہیم فنکار اور انسان کی طرح خلیفہ صاحب بھی انسانی زندگی میں غم و اندوہ کی کارفرمائی کا دل سے یقین رکھتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ انسانوں کے ہاتھوں اسی کی نوع پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ وہ اقبال کی طرح خوب سمجھتے ہیں کہ بندۂ مزدور پر اس کے شب و روز تلخ ہیں۔ وہ اس سے بھی آگاہ ہیں کہ فطرت انسانی اپنی سادہ روی ترک کر کے تہذیب نو کی آغوش میں اپنی ہئیت بگاڑ چکی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ انسان میں ایک جوہر ایسا چھپا ہوا ہے جو ہر وقت ان عناصر سے برسرِ پیکار ہو کر ان کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ خلیفہ صاحب کی شاعری اس امر کو بروئے کار لاتی ہے۔ مگر اس طرح کہ اس پر بالادستی، عظمت اور رفعت کے ساتھ ساتھ ان کا خندۂ زیر لب بھی قوس قزح کی تمثیل میں جزو لاینفک کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے۔ خلیفہ صاحب کے اشعار میں اقبال کے فلسفہ و افکار کا پرتو جا بجا نظر آتا ہے۔ یہاں میں خلیفہ صاحب کی غزلوں کے چند فلسفیانہ و حکیمانہ اشعار پیش کرتی ہوں جن میں اقبال کا طرزِ فکر نمایاں ہے۔

بھیس .... کا مل

بُت کا کعبے سے نکلنا تو ہے آسان بہت
مردِ مومن ہے دل سے بھی نکالا ہوتا

سعی و عمل جہدِ پیہم

غرض ہے زندگی سے سعیِ پیہم
اسی سے ہے حصولِ ہر دو عالم

تمنا و آرزو

تمنا ہی اس زندگانی کی خو ہے
کوئی جستجو ہے کوئی آرزو ہے
وہی ذوقِ ہستی وہی عشق و مستی
نوا عندلیبوں میں پھولوں میں بو ہے
لالہ کہتا تھا گلِ تر سے کہ اے زادۂ حسن
تیرے سینے میں کوئی زخمِ جگر ہے کہ نہیں
ساحلِ آسودگی جہاں میں سکوں کا طالب
موج کہتی ہے کہ کچھ ذوقِ سفر ہے کہ نہیں

حرکاتِ ہستی، ارتقائے نمو

کوئی ہستی نہیں یہاں جس میں
ہے گراں گنجِ تمکنت ساکن نہیں

ہے شوخی دانۂ نخل آفریں میں
نہ ٹھہرے گا یہ آتش گلشن زمیں میں
یہ سب جلوے ہیں اسی دل کی حرارت
سے معمور ماہ کا مرکز زمیں میں
گناہوں سے جگر کی آگ میں ہے پیدا
نہیں شوخی وہ جبریلِ امیں میں

پیکارِ تخلیق و تجدید - اجتہاد

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ذوقِ تقلید تو ہے دونیِ ہمت کا ثبوت
راہ اپنی دلِ زندہ کوئی ایجاد کرو
دعوتِ ہمتِ مردانہ ہے جورِ افلاک
خامیِ دل ہے اگر شکوہ بیداد کرو

اشک بہا کے کیوں گھٹوں جب یہ سب بے ثبات ہے
ذوقِ تغیرات میں تازگیِ حیات ہے
شغل مرا صنم گری اور کبھی حرم گری
دل یہ کبھی تو کعبہ ہے اور کبھی سومنات ہے

سوز و گدازِ عشق

اے بے خبر ہے غیرتِ صد کیمیا یہ عشق
مٹی کو زر بنائے اگر اک نظر کرے

نہیں ہے تربیت جانوں کی بے سوز و گدازِ دل
جو پہلے دل پگھلتا ہے تو پھر سانچوں میں ڈھلتا ہے

بے عشق ہستی ہے تشنہ کامی
بے عشق دل ہے بے آب ماہی

ان موضوعات و مضامین کے علاوہ خلیفہ صاحب کے ہاں کچھ مسلسل غزلیں ہیں جو طرزِ اقبال کا نمونہ ہیں۔ مثلاً ایک غزل کے کئی اشعار میں غم کی حقیقت بیان کی ہے اور اس کا عنوان "دو غم" رکھا ہے۔ دو شعر بطورِ نمونہ کے درج ہیں۔

ایک وہ غم کہ جاں نواز ایک وہ غم کہ جاں گداز
ایک وہ غم کہ کارسوز ایک وہ غم کہ کارساز

گہرائی ہے زندگی میں غم سے
انسان عمیق ہے الم سے

ایک غزل کے کئی اشعار میں معنوی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس غزل کا مطلع درج ذیل ہے

فریاد گر دہر نہ کر تلخ نوائی
کرتے نہیں ارباب ہمم نوحہ سرائی

ایک غزل میں اس طرز کے مسلسل چار شعر فقر کے موضوع پر ہیں۔

اِک فقر ہے جس سے سر جبریل ہوا خم
اِک فقر ہے جس سے کہ ہے تذلیل گدائی

خلیفہ صاحب کے فلسفیانہ و حکیمانہ کلام میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں انھوں نے وسیع المشربی کا اظہار کیا ہے یا اخلاقی نفسیاتی اور دیگر موضوعات پر خیال آفرینی کی ہے۔ وہاں اُن کا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں

دہر میں راہ بتانا نہیں کافی اے خضر
کوئی کانٹا کسی پاؤں سے نکالا ہوتا

یوں عشق کو آشکارہ کرنا
دشمن کو بھی دل سے پیار کرنا

طواف کعبہ و بُت خانہ تا کے
بنا لے اپنے اندر ایک معبد

اگر تیری حقیقت سرمدی ہے
تو لازم ہے کہ طالب بھی ہو سرمد

نشاط آباد میں ڈھونڈا نہ پایا
جو گوشہ تھا دلِ اندوہگیں میں

تغیر کا شوق بھی ہے دل کو
اور ذوقِ حیات جاوداں بھی

سمجھا ہے جس کو خاک ہے یہ بھی جہانِ پاک
انسان کو حکم ہے اسے پاکیزہ تر کرے

دُوری دنیا میں ہیں لذت سے محروم
جو پیچھے دوڑتے ہیں ہر طرب کے

خلیفہ صاحب کی غزلوں میں عارفانہ وصوفیانہ اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ عشقِ حقیقی کی کیفیات، وحدت الوجود کا نظریہ گوناگوں پیرایوں میں بیان کیا ہے۔

کسی حُسن باقی سے کر عشق پیدا
جو چاہے کہ داخل نہ ہو نا بوداں میں

مجھے اس کی جستجو ہے جو قریب تر ہے جاں سے
نہ کبھی سمجھ میں آیا یہ ہے وصل یا جدائی

ترے حسن نے کیے ہیں مہ و آفتاب پیدا
کہ ہے عشق کی بدولت یہ ظہورِ خود نمائی

خلیفہ صاحب کی غزلوں میں طنز و مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

محوِ حور و قصور رہتا ہے
شیخ دنیا سے دُور رہتا ہے

جب سکون روح کو نہ ہو حاصل
خاک پتھر ہیں ڈھیر سونے کے
شیخ صاحب ملک بنیں تو بنیں
آدمی تو نہیں یہ ہونے کے

اے شیخ مجھ کو شوق ہے تنقیدِ واعظ
منبر کے واسطے تجھے انسان چاہیئے

(ب) نظمیں

غزلوں کی طرح نظموں میں بھی خلیفہ صاحب اقبال کے خیال و افکار کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ خلیفہ صاحب کے اکثر موضوعات بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ جس نوعیت کے اقبال کے ہیں۔

اقبال کی طرح خلیفہ صاحب بھی انسانی ارتقا کو برگساں کی نگاہ سے دیکھتے ہیں حرکت محض کا دہی تصور جس کے بارے میں خلیفہ صاحب نے کہا تھا۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اور

نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

خلیفہ صاحب کے ہاں بھی موجود ہے۔ اقبال کی طرح خلیفہ صاحب بھی خیر و شر، جبر و قدر، حیات و موت، کی حقیقتوں کو محض ادبی سطح سے نہیں جانچتے انھوں نے بھی فطرت کے اس رموز کی نقاب کشائی اپنے شاعرانہ ادراک سے کی ہے۔ اور ان حقیقتوں کو وسیع تر مفاہیم سے آشنا کیا ہے۔ خلیفہ صاحب کے ہاں موضوعات کی شاعرانہ تاویل میں گوناگونی اور بوقلمونی ہے کہ ان کی توضیح و تشریح میں ایک عظیم الشان عمارت کی تعمیر بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ لیکن بہ خوفِ طوالت ان کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تجزیہ نظموں کے متعلق ہے۔ لیکن پھر بھی مثالوں میں ایک

آدھا شعر کسی غزل کا آجانا ناگزیر ہے۔

خلیفہ صاحب کی کئی نظموں کو موضوع و خیال کے اعتبار سے کئی حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ عرفانیات

وہ نظمیں جن میں زندگی اور کائنات کے بارے میں عارفانہ و صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان نظموں میں وحدت الوجود کا فلسفہ اور وجودی نقطہ نظر پایا جاتا ہے۔ اس قبیل کی نظموں کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

(۱) حسنِ مطلق (۲) ایک صوفی کا وجدان (۳) شیخ و صوفی (۴) وحدت الوجود کا گیت (۵) ساقی نامہ (۶) بحرِ حیات (۷) دورانِ حیات (۸) زندگی (۹) بقا (۱۰) کائنات (۱۱) ایک خواب (۱۲) خاک اور افلاک (۱۳) موت (۱۴) دیدہ ور (۱۵) من کا دیا (۱۶) جہنم (۱۷) حقیقتِ گناہ۔

۲۔ فلسفہ و حکمت

خلیفہ صاحب کی فلسفیانہ نظموں میں اقبال کا فلسفہ خودی اور فلسفہ ارتقا کے مختلف پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے عنوانات درج ذیل ہیں

۱۔ اپنے آپ سے ملاقات
۲۔ انسان بھی ایک طرح کا خالق
۳۔ تعمیر و تقدیر
۴۔ تقدیرِ آدم
۵۔ وارثِ حیات
۶۔ کرم یا ستم
۷۔ خاک
۸۔ قوتِ آرزو
۹۔ عقاب
۱۰۔ خیالات کی تعمیری قوت
۱۱۔ غلامی
۱۲۔ زوال و کمالِ آدم
۱۳۔ انسان (تصویر کے دو رخ)
۱۴۔ بقا
۱۵۔ باقی
۱۶۔ انسانِ کامل
۱۷۔ بد دعا
۱۸۔ بڑھے چلو، بڑھے چلو (ترجمہ لانگ فیلو)

۲۰۔ زندہ شہید۔

۲۔ اِنقلابی شاعری

متعدد نظموں میں انقلاب اور تغیر کا فلسفہ پیش کیا ہے اور ایک نئی دنیا اور نئے دور کی آمد کا مژدہ سُنایا گیا ہے۔ انقلاب کا اصول زندگی اور کائنات میں ہر جگہ جاری و ساری رہتا ہے۔ اس موضوع کے متعلق مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت نظمیں دیوان میں موجود ہیں۔

۱۔ عہدِ نو
۲۔ گوزہ گر دھر
۳۔ ذوقِ طلب
۴۔ سالِ نو
۵۔ ماضی اور حال
۶۔ تغیر
۷۔ ماضی پرست
۸۔ ملّتِ مردہ
۹۔ حال سے بیزاری
۱۰۔ مردہ پرستی
۱۱۔ تقلید
۱۲۔ لفظوں کی پُوجا
۱۳۔ فنا و بقا

۳۔ مشاہدات و تجرباتِ زندگی

خلیفہ صاحب کے مجموعۂ کلام میں کثیر التعداد نظمیں ایسی ہیں جن میں خلیفہ صاحب نے اپنے تجربات و مشاہدات بیان کیے ہیں۔ رومی اور اقبال کی طرح خلیفہ صاحب بھی عشق کو ایک ارتقا کرش جذبہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی متعدد نظموں میں عشق کی تخلیقی قوتوں اور کارفرمائیوں کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان نظموں کے عنوانات یہ ہیں

۱۔ محبت
۲۔ عشق (مثنوی)
۳۔ سوز و گداز
۴۔ عشق اور ہوس
۵۔ عشق (قطعہ)
۶۔ عشق کی ایک تخلیق
۷۔ سورج اور زمین
۸۔ عشق بھی شناسائی کا نام ہے
۹۔ عشق مطلوب تک پہنچاتا ہے۔
۱۰۔ عشق (مختصر مثنوی)

زندگی کے عام محسوسات و تجربات مندرجہ ذیل نظموں کا موضوع ہیں۔

۱۱- حسرتِ بے نام
۱۲- شباب
۱۳- ضبط
۱۴- اے کاش
۱۵- انسان کی بیداری
۱۶- من کا روپ
۱۷- مستی
۱۸- دکھ اور سکھ
۱۹- دل کی کھیتی
۲۰- اپنا اپنا بدن
۲۱- شہد کی مکھی
۲۲- راستہ وا ہے دل واپس آ
۲۳- گھر

اور دیگر بے عنوان نظمیں ہیں

۲۴- تربیتِ غم
۲۵- گہری خوشی اور گہرا غم
۲۶- دل کی دنیا
۲۷- بڑھاپے کی عقل
۲۸- بڑھاپا آیا
۲۹- جوانی گئی
۳۰- دن اور رات
۳۱- زندگی اور وقت
۳۲- میرا بدن
۳۳- خاموشی
۳۴- زندگی کا گیت
۳۵- درویشی
۳۶- سکونِ موت

۵- مناظرِ فطرت

خلیفہ صاحب جمالِ فطرت کے شیدائی تھے متعدد نظموں میں فطرت کے حسن کی تصویر کشی کی ہے اور اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ ان نظموں کے عنوانات قابلِ ذکر ہیں

۱- صبح
۲- ذوقِ نظر
۳- سکوتِ سحری فردوس
۴- شہر سری نگر
۵- کالی گھٹا
۶- قدرت
۷- جو مایہ ہے تو وہ آشنا سا کیا ہوگا۔
۸- سبزۂ کشمیر
۹- کیفِ بہار
۱۰- شبنم

کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

اے راہزنِ حیاتِ انساں
اے قلب کی موت لفظِ بے جاں

الفاظِ کہن کی بحث پرستی — ہے موت کی جاں پہ چیرہ دستی
الفاظ کے دام میں نہ آنا — اس چیزِ حرام میں نہ آنا

خلیفہ صاحب کے نزدیک شعر کی روح وہ جذبہ ہے جو خونِ جگر کی آمیزش سے شاعری میں معنی آفرینی پر منتج ہوتا ہے۔ اس جذبے میں ایسے عناصر کا پایا جانا ضروری ہے۔ جو قاری کے دل پر اثر انداز ہو۔ شعر میں اگر یہ بات نہیں تو وہ اپنے مقام سے گر جائے گا۔ بلکہ اسے شاعری کے زمرے سے خارج سمجھنا چاہیے۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں ؎

لفظوں میں حُسن کاریٔ فن ہے نظر فریب
لیکن وہی ہے شعر جو دل پر اثر کرے
بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں گوہر
ہے ہر اک شعر میں خونِ جگر گم
یہاں ہر قطرۂ خونِ جگر لعلِ معانی ہے
جگر کاری نہیں ہوتی تو حسنِ فن نہیں ہوتا
بہت اشعار کی آمد ہے جذبات کی شدت سے
اسی امرت کی بوندیں پی کے دل کو سر اٹھانا ہے

"غالب" پر ایک نظم میں اس معنی آفرینی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لفظ و معنی کا رشتہ اور فنی محاسن از خود آشکار ہو جاتے ہیں کہتے ہیں ؎

ہم کو بخشا ہے تری کانِ جگر نے کیا کیا
لعلِ معنی ہوئے خونابۂ مژگاں تیرا
پوششِ حرف میں ہے نالۂ عریاں کی جھلک
تیرے ہر حرف میں پوشیدہ نیستاں تیرا

ہر جا ہے عرش تک نشاں ہستی ہے وہ بے مکاں ہستی
اس جہاں سے کہیں اونچا ہے جہاں معنی

بقول سلیم واحد سلیم:

"خلیفہ صاحب فن کو محض فطرت کی نقالی نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک، فنونِ لطیفہ فطرت کی ایسی تعبیریں ہیں جو انسانی تخیل و تفکر سے جلا پا کر اتنے حسین سے حسین تر بنا دیتی ہے۔ بلا شبہ فطرت سادہ و حسین ہے۔ مگر اس کے حسن کی نشاندہی (وہ) ہو بہو بیان کر دینے یا رنگوں کی تجسیم تک نہیں۔ یہ فنونِ لطیفہ کا کمال ہے کہ وہ صاحب فن کی باطنی قوتوں سے مل کر فطرت سے ایسا تال میل کر لیتے ہیں کہ "نقش" "نقشِ جمیل" بن جاتا ہے[1]"

اگر فنونِ لطیفہ یہ فریضہ ادا نہیں کرتے تو ان کی کارکردگی ایک ایسے گلشن کی مانند ہے۔ جو کاغذ کے پھولوں سے آراستہ ہو سکتے ہیں۔

فقط فطرت کی نقالی ہو جب فن
تو وہ کاغذ کے پھولوں کا ہے گلشن
مصور ہو کہ شاعر، ہو جو نقال
تو ہے اک دھندلا سا اک آئینہ حال
فن اپنے رنگ سے خالی نہیں
ہے تخلیق نقالی نہیں
نہیں نغمہ کسی الفاظ کی نقل
دل انسان نہیں ہے ساز کی نقل

خلیفہ صاحب اس نظم "حسنِ فطرت" اور حسنِ فطرت انسانی کے لطیف فرق کی جانب اشارہ کرکے بالآخر فنونِ لطیفہ کے فرائض معنی یوں واضح کر دیتے ہیں۔

ہے فطرت میں جمال اور کبریائی
مگر انسان کے اندر ہے خدائی

اِدھر مذکورہ بالا لوازم شاعری کے ساتھ ساتھ خلیفہ صاحب شاعری میں "خونِ گشتہ آرزو"

---

[1] انٹرویو سلیم واحد سلیم

اور "دل گداختہ" کو اولیں شرط قرار دیتے ہیں - ان کے نزدیک فن کا فریضہ محض فطرت کی نقاب کشائی نہیں بلکہ اقبال کی طرح اسے خونِ جگر سے سیراب کر کے اپنے آغوش میں لانا اور جہانِ معنی میں حشر برپا کرنا ہے - ایسے عظیم الشان عمل کے لیے ضروری ہے کہ فطرت کے ان اشارات اور رموز سے رابطہ پیدا کیا جائے جس سے فن کار کی باطنی دنیا جاگ اٹھتی ہے - جہاں اس کی "تحریکِ تخلیق" ایک عالمِ زندہ کا روپ دھار لیتی ہے - چنانچہ ہر بڑے فن کار نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب تک فطرت سے کامل ہم آہنگی نہ ہو یا یہ الفاظِ دیگر اس کے مخزونہ خواہش دل میں تحریک پیدا نہ کریں - فن کی تکمیل سے گریز بہتر ہے - غالب نے ایک شعر میں اس کا اظہار یوں کیا ہے -

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

بعینہٖ خلیفہ صاحب بھی ایک شعر میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں

دلنشیں قول حقیقت میں ہے فطرت کی نوا
جو ادھر سے ہو اشارہ ، وہی ارشاد کرو

عقل و دل

انسان ازل سے حقیقت کا متلاشی رہا ہے یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اپنے دل و دماغ کی وہ تمام صلاحیتیں بروئے کار لائے جن سے گوہرِ مقصود حاصل ہو - انسان کی صدہا برس کی مسلسل جستجو سے اب یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ محض عقل پر بھروسہ کر لینا نہ صرف غلط ہے ، بلکہ گمراہ کن ہے - عقل کا دائرہ عمل ایک مقید حد سے آگے نہیں بڑھتا - اس کے مقابلے میں دل کی دنیا بیکراں ہے - بیشتر حکما اور دانشور عقل کے مقابلے میں دل کی عظمت پر زور دیتے ہیں - مولانا روم نے اسی دل اور وجدان کی مدد سے حیات و کائنات کے ایسے ایسے ادق مسائل حل کر کے رکھ دیے ہیں ، جن کا دیگر دانشوروں کے ہاں سرے سے فقدان

ہے۔ دورِ حاضر کے مفکر شاعر علامہ اقبال نے بھی اپنے مرشد رومی کی تقلید میں عقل کے بارے میں قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

ادھر خلیفہ صاحب بھی انہیں حکما کی روش پہ چلتے ہیں اور اپنی نظم بعنوان "ورثہ" میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مرے سینے میں اک خلوت کدہ ہے
یہاں سے ہے جہاں کا شور و شر دور
ہے پرواز محبت لامکاں تک
اڑا کر لے گئے یہ بال و پر دور

پھر ایک غزل میں اسی کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

یہ سب جلوے ہیں اس دل کی بدولت
ہے مہر و ماہ کا مرکز بجلی میں

دل کیا ہے موج نور ازل کی ہے اک گرہ
جتنا ہے جو صدف میں وہ گوہر بھی ہوں میں

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
نہیں عالم یہ ہفت کشور میں

اس کے اندر ہیں سب زمان و مکاں
جیسے افعال سارے مصدر میں

پھر عشق کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

ہونے اُن کے اِن سنے اور مختلف پیرایہ ہائے اظہار معرضِ وجود میں آتے ہیں کہتے ہیں

ہے نمود شہود مظاہر بود — ذات سے کچھ الگ صفات نہیں

کل سے نکل رہا ہے ہر جزو — ہر جزو بنے گا ایک دن کل

ہے فنا اور بقا زیر و بم موج موجود

جس کا ساحل ہی نہیں ہم نے وہ دریا دیکھا

ہاں آئینہ تیرا تو ہے خود بیں

ہستی ہے تری سراسر تمثیل

گر نہیں توحید تعدد اصنام گر

کیوں بنایا دہر کا بتخانہ ہے

فلسفہ خیر و شر

خیر و شر کی حقیقت کے بارے میں خلیفہ صاحب کا مسلک بھی وہی ہے جو عموماً صوفی شعرا اختیار کرتے ہیں۔ اہلِ طریقت کے ہاں محض مادی حواس کی مدد سے خیر و شر کی کنہ تک نہیں پہنچا جا سکتا ہے۔ باطن میں اس کی حقیقت بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ اور اس میں تمیز و امتیاز کھینچنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ ظاہر پرست اشخاص جو محض ایک ہی روش پر چلتے اور بندھے ٹکے عقلی اصولوں سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے۔ اس پر اصرار کرتے رہتے ہیں کہ ہر دو قدروں میں قطعیت موجود ہے اور یہ کہ ان میں حدِ فاصل کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ ادھر باطن پرستوں کا دعویٰ ہے کہ "خیر و شر" ایک ہی حقیقت کے پرتو ہیں۔ یہ ہماری ادراکی قوت کی بے اثری ہے کہ وہ حقیقت کی تلاش میں محض ابتدائی منزلوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ

ہاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

انسانی اعمال اور اس کے دیگر کوائف کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ جب اس کی حقیقت روح کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے۔ تو شاعر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا — غالبؔ

خلیفہ صاحب کہتے ہیں ؎

نظر گاہِ صفت میں خار اور گل
ہے عینِ ذات میں سب مشتاب و ترنگ

وہ انسان کو اس حقیقت کے پیشِ نظر ایسی زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں جس میں نفرت کا شائبہ تک نہ ہو۔ ایک غزل میں یوں فرماتے ہیں

یوں عشق کو آشکار کرنا — دشمن کو بھی دل سے پیار کرنا

موت کی حقیقت

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جسے از آدم تا ایں دم، علم کی ہر سطح پر سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انبیا، حکما، علما اور سائنس دانوں نے اس کی وضاحت کی ہے۔ صدیوں تک انسانی شعور کو موت کے بھیانک تصور نے ایک دہشت تک لپیٹے رکھا، اس سے نکلنے نہ دیا اور وہ حیات کو نباتات، حیوانات کی طرح منقطع اور فنا ہونے والی شے سمجھتا رہا۔ لیکن جب اس کے شعور نے ترقی کی اور اس نے اپنی روح میں جھانکا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے اندر ایک ایسی شے موجود ہے۔ جو ازلی اور ابدی ہے۔ نہ اسے زوال آسکتا ہے اور نہ وہ فنا ہو سکتی ہے۔ انسان کا مادی وجود اس کی ہلاکت کا موجب نہیں ہو سکتا۔ ادھر زمانہ حاضرہ میں ماہرینِ حیاتیات بھی اپنی تحقیق میں اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ موت کے واقع ہونے سے نظامِ زندگی کا جو شیرازہ بکھر جاتا ہے وہ مادہ میں موجود رہتا ہے۔ اگرچہ ہمارے حواسِ خمسہ اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہ اس کی شیرازہ بندی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ گویا موت زندگی کی عظیم شاہراہ پر موت ایک معمولی تغیر کے سوا کچھ اور نہیں۔ اور خلیفہ صاحب تو موت کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم ایک لباس اتار کر دوسرا پہن لیتے ہیں۔

میر تقی میر نے موت کی حقیقت کو اپنے شعری تجربے میں یوں محسوس کیا تھا۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

بعینہٖ خلیفہ صاحب کا موت کے بارے میں کہنا ہے۔

اے مرگ تیری کیا ہے حقیقت
پوشاک کہنہ ہم نے اتاری

یہ زندگی ہے اک جل چلاؤ
دریا کی صورت ساحل بھی جاری

یہ خاک و آب و باد ہیں بازیچۂ جہاں
اس خاک و آب و باد کا پیکر نہیں ہوں میں

فلسفۂ زندگی

خلیفہ صاحب کے نزدیک زندگی ایک ازلی جدوجہد کا نام ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ مصائب کے سامنے سینہ سپر ہو کر فرائض کی بجا آوری سے منہ نہ موڑے۔ گر گر کر اٹھے راہ پیما ہو اور ہمت نہ ہارے۔ اس کے عزائم بلند اور اس کے مقاصد جلیل ہوں، مشکلات میں خندہ جبیں ہو۔ علم اور دولت کی ثروت سے دوسروں کو بہرہ مند کرے۔ بخل سے کوسوں دور ہو اور بقول اقبال "نرم دم گفتگو" اور گرم دم جستجو ہو۔ جب کوہ بیاباں اس کے راستے میں آئیں تو وہ "سیلِ تند رو" کی طرح ان کی سلوں اور رکاوٹوں کو چیرتا ہوا گزر جائے اور جب اسے گلستاں سے واسطہ پڑے تو "جوئے نغمہ خواں" بن جائے۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں خلیفہ صاحب زندگی کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

موجِ رواں ہے زندگی گر کے بھی سر اٹھائے جا
لعل و گہر کا بن چراغ بادہ میں جگمگائے جا

گُل نے کہا کہ عندلیب میں بھی ہوں چاک پیرہن
تو بھی مری طرح سے تب، درد میں مسکرائے جا
چھوڑ دے فکرِ بیش و کم کیا ہے جہاں کا رنج و غم
عشق سے دل میں نور کر حسن سے لو لگائے جا
ثروتِ رنگ و بو میں رکھ لذتِ انکسار بھی
صورتِ شاخِ میوہ دار سر کو ذرا جھکائے جا
فیض کا در نہ بند کر، حوصلہ کچھ بلند کر
دے کے یہاں پہ لے حیات کھو کے یہاں پہ پائے جا
مثلِ صدف چھپا نہ رکھ ہے ترے پاس گر گہر
ابرِ بہار بن برس، اپنے گہر لٹائے جا
لطف و کرم ہے سرمدی، جور و ستم ہے عارضی
لطف و کرم کو یاد رکھ، جور و ستم بھلائے جا

جہاں تک سماج زندگی میں اپنا اپنا حق استعمال کرنے کا تعلق ہے خلیفہ صاحب انسان کو تلقین کرتے ہیں کہ محض چپ سادھ کر انتظار کرتے رہنا کہ اس کے حقوق از خود اس کی جھولی میں آگریں گے، مناسب نہیں۔ خلیفہ صاحب شاد عظیم آبادی اور یگانہ چنگیزی کے ان خیالات سے پوری طرح متفق ہیں۔

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے — شاد

خواہ وہ پیمانہ ہو، یا نوالہ ہو
بن پڑے تو جھپٹ لے بھیک نہ مانگ — یگانہ

خلیفہ صاحب اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں

زمانہ کچھ نہ دے گا سیدھے ہاتھوں

ملا کچھ تو ملے گا لڑ جھگڑ کر
اپنے سے یا غیر سے ہے کشمکش
زندگی پیکار ہی کا نام ہے

اخلاق

خلیفہ صاحب کی شاعری میں اخلاق کے مضامین بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مضامین جہاں ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ وہاں اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ خلیفہ صاحب اخلاق کے بارے میں اس کے بندھے ٹکے ضابطوں کے برعکس آزادانہ روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ محض فروعی باتوں کو اخلاق کی حدود میں لا کر ان پر فیصلے صادر کرنا ان کے نزدیک درست نہیں۔ ان کا اخلاق زندگی اور فطرت کی طرح کشادہ ہے۔ رجعت پسندی ان کے ہاں نام کو نہیں۔ اخلاق کے مضامین بیان کرتے ہوئے وہ خطیبانہ انداز کہیں بھی اختیار نہیں کرتے۔ ان کی بات ان کی طبیعت کی طرح دل نشیں انداز لیے ہوئے ہوتی ہے۔ جو دلوں پر اثر کرتی ہے۔ مہر اور ہمدردی کی مدح کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں۔

ہے نیکی سرمدی، ہیں نیک زندہ
یہی رازِ حیاتِ جاوداں ہے
بڑی عظمت ہے مقصد کی بلندی
ستاروں میں ہما کا آشیاں ہے
جو اوروں کو بڑا کر دے بڑا ہے
دگرنہ عظمت اک وہم و گماں ہے
نہ ہمت جانفشانی بے اثر ہے
نہ ہمت جاں نثاری رائیگاں ہے
نہیں نیکی تو عظمت کیمیا ہے
نہیں ہمت تو دولت رائیگاں ہے

ملے گر سلطنت ایمان دے کر
تو انساں کے لیے سوداگراں ہے
گر ہے زندگی بیکار کا نام
بہادر اس تیغ کو سنگِ فساں ہے
بڑی مشکل سے ملتی ہے بزرگی
بہا اس چیز کی آرامِ جاں ہے

خلیفہ صاحب انسان کو بجا طور پر تلقین کرتے ہیں کہ وہ لہو و لعب زمانہ سے درگزر کرے۔ دولت و ثروت کے نشہ میں چور نہ ہو۔ غربا کی مدد کرے جلیبیت یعنی ایثار اور انکسار کی خصوصیات کو مردہ نہ ہونے دے۔ غرضیکہ ہر قسم کے تکلفات اور زندگی کو پست کر دینے والی اشیا سے اجتناب کرے۔ اپنے ایک شعر میں بڑی سادگی سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔

زندگی دل کی سادگی سے ہے
اس میں رسمِ تکلفات نہیں

انسان کو منع کرتے ہیں کہ وہ چشم و دل سے غیریت کا پردہ اٹھا دے اور دوسروں کو حسد کی آنکھ سے نہ دیکھے۔ غیر کو غیر سمجھنا ان کے ہاں دائرۂ اخلاق سے باہر ہے اس کی تلقین اس طرح کرتے ہیں۔

غیر میں بھی نظر آتی تجھے اپنوں کی جھلک
سرمۂ وحدت کا کبھی آنکھ میں ڈالا ہوتا

دنیا میں وہ لوگ ہر لمحہ فرحت و انبساط کے متلاشی رہتے ہیں اور اس کے حصول میں جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں۔ خلیفہ صاحب کی نظر میں وہی لوگ حقیقی خوشی سے محروم رہتے ہیں۔

وہی دنیا میں لذت سے ہیں محروم
جو پیچھے دوڑتے ہیں ہر طرب کے

انسان کو اس کی عجلت پسندی سے منع کرتے ہوئے اسے تلقین کرتے ہیں کہ متحمل مزاج ہو صبر کا دامن نہ چھوڑے۔ جب تحمل مزاجی اور صبر کی دولت اسے مل جائے گی تو اس کا کام اس کی منشا کے مطابق ہو جائے گا۔

ہے آدمی بہت عجلت پسند ورنہ یہاں
درست ہوتا ہے ہر اک حساب آخر میں

نیکی اور برائی کی افراط و تفریط کے بارے میں نہایت بلیغ پیرایۂ اظہار اختیار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی نیکی جو بالآخر غرور اور انا پرستی پہ منتج ہو ہلاکت آفریں ہے۔ اور ایسی برائی جو انسانوں کا درجہ حیوانوں سے بھی پست کر دے ناقابلِ قبول نہیں۔ درمیانی راستہ مناسب اور معقول ہے۔ انسان سے غلطی کا ہونا لازمۂ بشریت ہے۔ لیکن نیکی کا حد سے بڑھ کر اس کی فطرت کو داغ دار کرنا اسے لازم نہیں آتا۔ اس لطیف فرق کو اس طرح واضح کرتے ہیں۔

کانٹے ہیں چمن میں ہر گُلِ تر کے قریب
رہتے ہیں یاں خزف بھی گوہر کے قریب
نیکی سے خبردار رہے بندۂ نیک
ہے خیر کی افراط بہت شر کے قریب

دوزخ اور بہشت کا فلسفہ

دُنیا میں انسان کے اعمالِ حسنہ اور افعالِ قبیحہ کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ اسے اس کے نتائج کا ثمرہ دیا جاتا۔ ایک اچھا کام بجائے خود اپنا حاصل یا ثمرہ ہے۔ اس طرح ایک بُرا فعل بجائے خود بُرے اثرات کا حامل ہے۔ لیکن فطرتِ انسانی کا تقاضا یہی ہے کہ بُرے افعال سے درگزر کرتے ہوئے۔ اسے اس کے اچھے اور نیک اعمال کا ثمرہ ملے۔ چنانچہ دوزخ و بہشت کا تصور مختلف اقوام میں زمانۂ قدیم سے مختلف صورتوں میں پایا جاتا رہا ہے۔ انبیائے کرام نے بھی دوزخ اور بہشت کی حقیقت کو انسانوں پہ آشکارا کیا ہے۔ دوزخ و بہشت کا تصور انسانی اعمال پہ

زبردست کردار ادا کرتا رہا ہے۔ لیکن اہلِ بینش کے نزدیک محض بہشت کے حصول اور دوزخ کے ڈر سے نیکی کرنا، نیکی کے عمل کو ہلاک کرنے کے برابر ہے۔ ایک نیک کام روح میں پاکیزگی اور بالیدگی پیدا کرتا ہے اور اس کا بہترین ثمرہ یہی ہے۔ اسی طرح بُرے کام سے رُوح داغ دار ہو جاتی ہے اور انسان پست ہو جاتا ہے۔ غالب نے اس خیال کو اس طرح بیان کیا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لا کر بہشت کو

دوزخ اور جنّت کے بارے میں خلیفہ صاحب کے افکار و خیالات بھی اسی نہج پر واقع ہوئے ہیں۔

کس نے کہا کہ تا بہ مرگ خلد کا انتظار کر
خاک کی ہے یہ آرزو خلد مجھے بنائے جا
سمجھا ہے جس کو خاک ہے یہ بھی جہانِ پاک
انساں کو حکم ہے اسے پاکیزہ تر کرے
جنّت سے بھی نکل کے بنا لے ہزار خلد
انساں جو اپنی خاک کو آنکھوں سے تر کرے
ذرا دیکھ آنکھوں سے پردہ ہٹا کر
ہیں حوریں یہاں اور کوثر یہیں ہے

دوزخ بھی اس کی اور ہے جنّت بھی اور ہے
ہر ایک کے لیے ہے جزا اور سزا الگ

خلیفہ صاحب بعض متصوفین کی طرح پکے وحدت الوجودی نظر آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دوزخ و جنّت بھی مختلف کیفیات باطنی و ذہنی ہیں اور وہ اس کائنات کو نہ صرف مظہرِ ذات سمجھتے ہیں۔ بلکہ عین ذات بھی سمجھتے ہیں۔ خلیفہ صاحب کی بیشتر

بعض نظموں میں ایسے استعارے ملتے ہیں اور کتب سماویہ میں بھی دوزخ اور جنت جزا اور سزا سب تشبیہاتی اور استعاراتی ہیں جیسے ان کی نظم خدا اور استعارہ ہے۔ ایک اور نظم "یہاں اور وہاں" میں یوں فرماتے ہیں۔

فردوس بھی نہیں ہے کوئی دور کا مقام
سو بار ہم نے دیکھا ہے اسے صبح دم یہاں
دو عالموں میں رہتا ہے انسان ایک دم
یعنی کہ اک قدم ہے وہاں اک قدم یہاں

غلام مسلمانوں کو آزادی کی تلقین اور روح عصر کا پیغام

خلیفہ صاحب کی شاعری اپنے موضوعات کے لحاظ سے ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں افکار و خیالات کی عظیم عمارتیں نظر آتی ہیں۔ وہاں انھوں نے اپنے دور کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور دیگر حالات کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام میں کئی نظمیں ایسی مل جاتی ہیں جو انگریزوں کے عہدِ غلامی میں مسلمانوں میں جذبۂ آزادی کی تحریک پیدا کرتی ہیں۔ خلیفہ صاحب "نوید آزادی" کے عنوان سے ایک نظم میں غلام مسلمانوں سے یوں ہم کلام ہیں۔

پھونکی گئی ہے سینہ میں ترے روحِ الٰہی — اے حق کے سپاہی
فطرت نے عطا کی ہے تجھے کو زمین کی شاہی — از ماہ تا ماہی
اس پر بھی پسند آئی تجھے کیسی غلامی — اے مردِ گرامی

"وا سے وطن — اسے وا سے وطن" اور فریادِ وطن میں انھوں نے قوم کو درس آزادی دیا ہے۔ یہ نظمیں خلیفہ صاحب کے سیاسی شعور کی گہرائی آشکارا کرتی ہیں۔ "ہندی مسلمان" کے عنوان سے ایک نظم میں مسلمانوں کی معاشی حالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

جیب میں اس کے دام نہیں — سرمائے کا نام نہیں
کام سے اس کو کام نہیں — دل میں ذرا اسلام نہیں
ٹھیک ہے اس کی یہ پہچان — یہ ہے ہندی مسلمان

انگریزوں نے ہمارے ملک کی تہذیب اور اس کی روایات کو جس طرح مسخ کیا تھا اور اپنا اقتدار قائم کیا تھا۔ اس سے ہر پڑھا لکھا انسان واقف ہے۔ علامہ اقبال نے انگریزوں کی اسی ذہنیت کے بارے میں کہا تھا۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

مجلس آئین اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

خلیفہ صاحب بھی انگریزوں کی تاہری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اے چمن آرا کہاں ہے وہ چمن
جس جگہ سبزے کی پامالی نہیں

لیکن اقبال کی طرح خلیفہ صاحب بھی اپنی قوم سے مایوس نہیں خلیفہ صاحب بھی اقبال کے اس قول سے متفق ہیں کہ

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

کہتے ہیں

گو نہیں اقبال اور حالی نہیں
پر نوا گر سے چمن خالی نہیں

نہیں مایوس اپنی قوم سے میں
بسے گی پھر یہ بستی بھی اُجڑ کے

مناظر فطرت

خلیفہ صاحب کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں مناظر قدرت پر کئی اچھی نظمیں مل جاتی ہیں اور شاعری کے کل سرمایہ کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ" مناظر فطرت"

پر شعرا نے بہت کم توجہ دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف اقوام کی شاعری کے مقابلے میں اس زاویۂ نگاہ سے ہماری شاعری کا درجہ کم ہو گیا ہے۔

اُردو میں سب سے پہلے نظیر اکبر آبادی، آزاد، حالی، اقبال اور چکبست کے چند اور شاعروں نے مناظر قدرت پر نظمیں کہی ہیں۔ دیگر شعرا نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی لیکن وہ ان شعرا نے بھی جو نظمیں کہی ہیں وہ کسی طرح بحیثیت مجموعی ورڈز ورتھ اور ٹینی سن کے مقابلے میں نہیں رکھی جا سکتیں۔ مناظر قدرت کو من و عن بیان کر دینا اگرچہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ مگر جب تک ان مناظر میں شاعر کی روح مدغم نہ ہو اور اسے اس کیفیت کے اظہار میں کامل قدرت نہ ہو، اعلیٰ شاعری کے نمونے معرضِ شہود پر نہیں آ سکتے۔ خلیفہ صاحب کی نظموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مناظر قدرت نے ان کی روح اور متخیلہ کو خاص متاثر کیا ہے۔ ان کے ہاں مناظر قدرت کا روکھا پھیکا بیان نہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری بیان کردہ منظر سے خود محظوظ ہو رہا ہے۔ امیجری سے جو کام لے سکتے ہیں خلیفہ صاحب کی ان نظموں میں اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ انھوں نے "سبزۂ کشمیر" کے عنوان سے ایک اعلیٰ پایہ کی نظم لکھی ہے۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

سب برگ و بار سبز ہیں اور شاخسار سبز
یعنی کہ نغمہ سبز ہے اور ساز و تار سبز
پانی اس طرف ہے سبز ادھر کوہسار سبز
یاں فوج سبز پوش، وہاں ہے حصار سبز
مانند سایہ نقش قدم کے نشان ہیں
جادہ کے خط کو دیکھ سرِ رہگذار سبز
آنکھوں میں ہے تصور گیسوئے پُر شکن
سنبل کے عکس سے ہے کوئی آبشار سبز
طائر سمجھ کے ریشہ دانہ اُلجھ گیا

تھا دانہ سبز در رشتہ دام شکار سبز
خامہ تھا چوب خشک جو محوِ بیاں ہوا
ذکرِ بہار سے ہوا پھر ایک بار سبز

"ڈل بھری نگر" پر "گلشن آب میں" "گلخن آب میں" کے ردیف و قوافی میں مناظر کے ایسے ایسے دلکش مرقع بنائے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں۔

شام کو رنگِ شفق سے جلوہ افگن آب میں
سخت حیراں ہوں یہ گلخن ہے کہ گلشن آب میں

وہ چھپا پانی میں ہے، رشتہ اگر گم کیجئے
ڈھونڈ لائے گی نگاہ چشم سوزن آب میں
مہر و ماہ و اختر چراغ بزمِ رقاص ہیں
نور کے رامشگروں کا دیکھ آنگن آب میں
بازی موج نسیم ایسی نشاط انگیز ہے
یاد آجاتا ہے بوڑھوں کو بھی بچپن آب میں

"کیفِ بہار" کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے، جس کا مطلع ملاحظہ ہو۔

بادل سیاہ فام اٹھا جھومتا ہوا
مستی میں کوہسار کا منہ چومتا ہوا

"شبنم" پر ایک نظم میں کہتے ہیں۔

پتوں پہ پڑی ہوئی ہے کچھ اوس
اپنے لب تر سے ہے چمن بوس
چمکائے فلک نے شب کو تارے
تھوڑے سے زمیں پہ ہیں اتارے

"کالی گھٹا" میں کہتے ہیں۔

آ گئی وُہ جھومتی کالی گھٹا
خُوب پی کر مست متوالی گھٹا
رحمتوں کی گود کی پالی گھٹا
بجلیوں اور چشمکوں والی گھٹا
آ گئی وہ جھومتی کالی گھٹا

اے گھٹا نت برس جھم جھم برس
نغمہ زن ٹپ ٹپ برس چھم چھم برس
بن گئے جان و روح کی محرم برس
آ مٹا دے سارے نقشِ غم برس
آ گئی وہ جھومتی کالی گھٹا

پانی پر ایک نظم کے چند اشعار قابلِ توجہ ہیں جو خلیفہ صاحب کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری کا ثبوت دیتے ہیں۔

میں چھپ کر گل میں رہتا ہوں
مٹی کے دل میں رہتا ہوں
بحر اور ساحل میں رہتا ہوں
میں ہر منزل میں رہتا ہوں
تخلیق ہے لالہ زار مری
ہر جا پر دیکھ بہار مری

ہر جان کو میری پیاس رہی
خشکی کو میری پیاس رہی
بن میرے جان اداس رہی
اور رُوح بھی میرے پاس رہی
تکتے ہیں راہگذار مری
ہر جا پہ دیکھ بہار مری

انگریزی شعرا کے تراجم

خلیفہ صاحب کے ہاں چند انگریزی شعرا کے تراجم بھی ملتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت محض تراجم ہی کی نہیں رہ جاتی بلکہ ان میں وہ نکھار اور حسن موجود ہے جو خلیفہ صاحب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے بانگِ درا میں "ماں کا خواب" کے عنوان سے ولیم بارنس کی نظم کا ترجمہ کر کے اُسے اپنا لیا ہے۔ "دکھیا ماں" کے عنوان سے خلیفہ صاحب نے بھی اسی نظم کا ترجمہ کیا ہے۔ اقبال نے اس نظم کی پیشانی پر لکھا تھا "ماخوذ" لیکن خلیفہ صاحب نے اس کا براہِ راست ترجمہ کیا ہے۔ خلیفہ صاحب کی اسی وقت کے پیشِ نظر ان کے تراجم کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ یہ نظم اگرچہ اقبال کی نظم سے ہرگز لگا نہیں کھاتی۔ تاہم اپنی جگہ کامیاب نظم کہی جا سکتی ہے۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

دیکھا کل رات ایک سادہ خواب — مجھ پہ گویا کھلا ہے خلد کا باب

میرا بچہ جو دے گیا تھا داغ — اس کا جنت میں ڈھونڈتی تھی سراغ

ہاتھ میں اس کے بجھ گیا تھا دِیا — فقط اس کا ہی بے ضیا تھا دیا

شکوہ سنجی میں اس نے منہ کھولا — روٹھی آواز میں وہ یوں بولا

میری اماں نہ اب کبھی رونا — آنسوؤں سے کبھی نہ منہ دھونا

نہ رُکا تیرے آنسوؤں کا جوش

اس سے میرا چراغ ہے خاموش

لونگ فیلو کی مشہور نظم "EXCELLCIAR" کا ترجمہ ایک مترنم بحر میں یوں کرتے ہیں:

وہ خوفناک ظلمتیں — اور اس پہ برف باریاں

مثالِ برقِ گرم رو — گذر رہا ہے نوجواں

ہے اس کے ہاتھ میں علم — اور اس علم پہ ہے رقم

بڑھے چلو بڑھے چلو

ساقی نامہ

خلیفہ صاحب نے ایک ساقی نامہ بھی لکھا ہے جس میں ظلم کی چیرہ دستیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا ہے اور مختلف حالات و کوائف کی نشان دہی کی گئی ہے اس کا آغاز یوں ہے۔

پلا ساقیا آج ایسی شراب
کہ ساغر ہیں جس کے مہ و آفتاب

وہ مے جس میں ہیں غم کے ماروں کے اشک
وہ مے جس پہ کوثر کو آتا ہے رشک

حیا ہے کبھی حسنِ مستور میں
تو شوخی کبھی دیدۂ حور میں

وہ مے جس سے مے خانہ ہے آب و گل
دھڑکتا ہے جس میں فطرت کا دل

جو آجائے اس مے کے پینے کا ڈھنگ
سمجھ جاؤں مر کر بھی جینے کا ڈھنگ

خلیفہ عبدالحکیم کی شاعری فنی نقطہ نظر سے

شوخی کلام و رندانہ مضامین

اس کے بارے میں حسرت موہانی اپنی کتاب "نکات سخن" میں لکھتے ہیں کہ اکثر اوقات حسن سخن میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے مضامین زیادہ تر تعریف مے اور زاہد و واعظ کی تضحیک پر مشتمل ہوتے ہیں۔ خلیفہ صاحب کے کلام میں بھی کم و بیش انہی موضوعات پر اشعار ملتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ذہانت کے باوصف بذلہ سنج اور ظریف الطبع واقع ہوئے ہیں۔ ان کی طبع کے یہ عناصر ان کی نجی گفتگو سے لے کر تحریر و تقریر تک اپنی جھلکیاں دکھائے بغیر نہیں رہتے۔ قریباً قریباً ان کی ہر نظم میں ایک آدھ شعر ایسا

ضرور نکل آتا ہے۔ جس میں شیخ و واعظ کی تضحیک کی گئی ہو۔ ان کے دیوان کی پہلی نظم ہی جو انھوں نے "شاعر اور جنت" کے عنوان سے کہی ہے ان کی شوخ طبعی کا اچھا نمونہ ہے۔

خلد میں کیا مزا جو ہوں نیک ہی نیک خلد میں
رونق بزم چاہیے رند بھی ایک خلد میں
چاہیے گر بہشت میں دخل ملے نہ رنج کو
بھیج وہاں پر سب سے قبل شاعر بذلہ سنج کو
دیتا ہے جن کو دہر میں فکر بلند سے سرور
وہ نہیں چاہیں گے فقط جام مے طہور و حور
ذوق سخن سے حور کو درس لوا گری ملے
شاعر خوش بیاں کو بھی داد سخنوری ملے

شیخ و واعظ کی تضحیک سے اشعار میں عجب شوخی پیدا کرتے ہیں۔

اے شیخ تیری تسبیح مہمل
اس سے ہے بہتر اختر شماری

در جنت کھلا ہے دل میں اے شیخ
یہ افضل ہے تیرے باغ جناں سے

شیخ حرم نشیں مری تسبیح دیکھنا
کتنے حسیں ستارے ہیں تارنگاہ میں

محو فکر و قصور رہتا ہے
شیخ دنیا سے دور رہتا ہے

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

حُسنِ بیان

تشبیہہ و استعارہ

کسی شاعر کے عظیم ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں تشبیہہ و استعارہ کا ایسا قرینہ اختیار کرے کہ "شعری تجربہ" عام روش سے ہٹ کر بالکل نیا اور اچھوتا معلوم ہو، خیالات و تصورات کی نئی دُنیا آباد ہو جائے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تفکر و ادراک کے لحاظ سے اعلیٰ قوتوں کے مالک ہیں ان کے ہاں احساسات و جذبات کی فراوانی ہے۔ وہ خشک قسم کے فلسفی نہیں۔ ان کا مزاج عقل کی بہ نسبت دل سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔ شاعری کو وہ عطیہ ربانی سمجھتے ہیں۔ ان کا شاعرانہ تفکر ان کے فلسفیانہ ادراک تفحص کی بنا پر قلب و روح کے لیے وہ سامان فراہم کرتا ہے اور ایسے ایسے مناظرِ فطرت سامنے لے آتا ہے کہ واقعتاً حیرت ہوتی ہے۔ انگریزی سے جیسے اردو میں محاکات کہتے ہیں خلیفہ صاحب کے کلام کی خصوصیات میں سے ہیں بعض نظمیں اوّل تا آخر تشبیہات و استعارات میں ڈوبی ہوئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی متخیلہ سحرِ حلال بن کر دلوں کو تسخیر کرتی چلی جاتی ہے۔ "آمد بہار" پر ان کی ایک نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

پیدا کیے چنار نے کیا بے شمار ہاتھ
پھر دعا زمین نے اُٹھائے ہزار ہاتھ
خورشید تیری راہ میں ہے اِک گدائے نور
پھیلا کے بیٹھتا ہے سرِ رہگذار ہاتھ
بادِ صبا کچھ اس طرح کلیوں کو چھو گئی
جیسے حسین طفل کو کرتے ہیں پیار ہاتھ

دُعائیہ شعر کے بعد ذاتِ اقدس کی توصیف و حمد کا پیدا ہو جانا ضروری تھا قوتِ متخیلہ نے یہاں بھی استعارات سے نئی دنیا تعمیر کر ڈالی ہے۔ پہلے مصرع میں خلاقِ کی وسعتِ بے کراں کو "آس کی راہ" کہہ کر خورشید کو "گدائے نور" سے موسوم کرنا اور پھر اس کے عمل کو جو کرنوں کی صورت میں تمام روئے زمین کا احاطہ کر لیتا ہے، اس طرح بیان کرنا کہ

پھیلا کے بیٹھنا ہے سرِ رہگذار ہاتھ[9]

استعارہ کی ندرت اور شاعر کے فنکارانہ کمال کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ سبزۂ کشمیر پر خلیفہ صاحب کے یہ اشعار استعارے کی اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

سب برگ و بار سبز ہیں اور شاخسار سبز
یعنی کہ نغمہ سبز ہے اور ساز و تار سبز
آنکھوں میں تصورِ گیسوئے پُر شکن
سنبل کے عکس سے ہے کوئی آبشار سبز

زبان و بیاں

خلیفہ صاحب کا کلام جہاں اپنے موضوعات کی گوناگونی اور اعلیٰ افکار کی فراوانی کی بنا پر نہایت وقیع اور جامع واقع ہوا ہے۔ وہاں اس میں زبان و بیان کے نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ صاحب نے شاعری کو بطور فن کبھی اختیار نہ کیا۔ شاعری کی زبان میں جسے شعری کاوش کہا جاتا ہے۔ ان کے ہاں اس کا شائبہ تک معدوم ہے۔ جہاں بندشیں ڈھیلی اور عروض کا خیال نہیں رکھا گیا۔ وہاں الفاظ کی تراش خراش پر بھی زور نہیں دیا گیا۔ گویا ان کی جولانیٔ طبع نے زبان و بیان کی پابندیوں کو درخورِ اعتنا سمجھا ہی نہیں۔ خلیفہ صاحب اگر اس طرف توجہ کرتے تو بلا شبہ ان کا شمار صفِ اوّل کے شعرا میں ہوتا۔ مگر وہ دوسرے ادبی کاموں میں ایسے مصروف تھے کہ یہ جگر کاوی ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ بہر کیف ان کا سارا کلام افکار و جذبات کا ایسا مرقع ہے جسے ناتراشیدہ جوہر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور تو اور زبان کے بارے میں خود ان کا اعتراف ہے۔

شعر سن کر کہتے ہیں اہلِ زباں
ہے زباں اچھی یہ ٹکسالی نہیں

غیر مدوّن کلام

خلیفہ صاحب کا مجموعۂ کلام مرتب ہو چکا ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس کی اشاعت

کی نوبت نہیں آئی۔ راقم السطور کو اپنے تحقیقی کام کے دوران کچھ ایسی نظمیں ملی ہیں جو اس مجموعے میں شامل نہیں۔ ان میں سے بعض نظمیں مختلف رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ مطبوعہ نظموں میں سے بعض نظموں کے عنوانات، مجموعہ کلام میں دیے ہوئے عنوانات سے مختلف ہیں مثلاً۔

۱۔ ماہِ نو جنوری ۱۹۶۶ء میں جو نظم "خطۂ کشمیر" کے نام سے چھپی، دیوان میں یہ نظم تو موجود ہے عنوان نہیں ہے۔

۲۔ دستور جلد نمبر ۲۔ شمارہ نمبر ۸ میں جو نظم "آج کل" کے عنوان سے چھپی دیوان میں یہ نظم بغیر عنوان کے ہے۔

۳۔ اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۶ء میں ایک نظم "جامہ زندگی" کے نام سے چھپی ہے لیکن دیوان میں عنوان کی جگہ نظم کا پہلا مصرعہ دیا ہوا ہے۔ "دل یہ کبھی تو کعبہ ہے اور کبھی سومنات ہے"

۴۔ اردو نامہ کراچی میں جو نظم "حسرت بے نام" کے عنوان کے تحت آئی ہے۔ دیوان میں اس کا عنوان موجود نہیں نظم کا پہلا مصرعہ ہے

"گو آدم کو انسان کو اس دنیا میں نعمت بخشی ہے ربِ اکرم"

مندرجہ ذیل مطبوعہ نظمیں مجموعہ کلام میں موجود نہیں۔

۱۔ خلیفہ صاحب کے دیوان میں ص ۲۵ پر عنوان "چاند" کے ایک نظم ہے لیکن اسی عنوان کے تحت خلیفہ صاحب کی ایک اور نظم ہے جو دیوان میں شامل نہیں۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے مخزن میں "چاند" نظم چھپ چکی ہے۔

۲۔ نظم بعنوان "شاعری" اردو نامہ کراچی میں چھپ چکی ہے لیکن یہ نظم خلیفہ صاحب کے دیوان میں شامل نہیں۔

۳۔ "کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر"

یہ نظم خلیفہ صاحب کے دیوان میں موجود نہیں۔ لیکن تاریخ اقوام کشمیر از محمد الدین فوق جلد سوم اور اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۶ء اور ہمایوں کے پرچے میں یہ نظم چھپ چکی ہے اور

ہمایوں کے پرچے میں اس کا عنوان "پیغامِ عمل" دیا ہوا ہے۔
۳۔ "ترانۂ حیات" ترجمہ سام آف الالف، مطبوعہ دو آتشہ، مرتبہ شیخ محی الدین مخمور
لاہور ۱۹۲۴ء

غیر مدون نظمیں

چاند

گوہر صدف میں چمکتے ہیں تیری طرف کیا آب ہے
تیرے ہی جذبِ عشق سے موجوں میں پیچ و تاب ہے
بامِ فلک پر جب ترن سیمیں دکھا دیتا ہے تو
دنیا کے بام و در پہ سب چاندی چڑھا دیتا ہے تو
میرے دلِ تنہا کو کیا بھاتی ہے تنہائی تری
قسمت کی گردش کی طرح ہے ہر طرح پیمائی تری
تیری طرح سے دہر میں ملتا نہیں مجھ کو سکوں
دل میں چھپا لے تو مجھے ہیں بھی سراپا داغ خوں
تھی روح پہلے سے مگر تیری ضیا سے آشنا
طفلی میں دستِ شوق تھا کیسے تری جانب بڑھا
دل کو یہ تیری شکل ہرگز بھولنے والی نہیں
نورِ محبت سے ہے پُر اور داغ سے خالی نہیں
دل میں ہے شورِ زندگی محروم سوز و ساز سے
ہے چاندنی کی خامشی لبریز حسن و راز سے

(۲)

جب جسمِ زمیں تار کو حائل اگر پاتا ہے تو
تو فرقتِ خورشید سے گھبرا کے گھٹتا ہے تو
ایسے ہی اک اندھیرے میں مجھ کو بھی فکرِ آب و گِل

چھپتا ہے جب نورِ ازل اس سے گہنا تا ہے دل
ملی ہی سے دل کو راہ گر اس گنبدِ گرداں میں ہے
کھلتا ہے دل پہ رازِ جو اس جلوۂ پنہاں میں ہے
ہاں سچ بتا دے سینۂ ہستی میں کیا تو دل نہیں
اور حسن پیدا اور نہاں کے ناز کا بسمل نہیں

(۳)

واقف ہے حالِ دہر کی تیری نگاہِ دور بیں
اپنی مسافت زندگی بھی تجھ سے چھپ سکتی نہیں
حالِ زبوں ہے جانتا پستی کی اس بستی کا تو
اور دیکھتا طوفاں ہے اس قلزمِ ہستی کا تو
دیکھا دلِ انساں میں بھی ہے جزرو مدا امید کا
یعنی کہ تو ناظر ہے شامِ غم کا صبحِ عید کا
اس بحر میں کیا ہستیاں مثلِ حباب اٹھتی رہیں
اور صورتیں کیا کیا مثالِ نقشِ خواب اٹھتی رہیں
ہنگامِ جہاں میں ہے اگر یا کاسۂ سرِ جم کا ہے
مثلِ حباب اس بحر میں مہمان کوئی دم کا ہے

(۴)

اس زندگی کا راز تو انساں کو سکھلاتا رہا
اور پڑھ کے فطرت سے ہمیں نسخہ یہ بتلاتا رہا
سرِ زوالِ ہستی و رازِ کمالِ زندگی
بڑھ بڑھ کے ہی جائے گا بدر اک روز ہلالِ زندگی
پر زیرِ چرخِ چنبری ہرگز سکوں ممکن نہیں
اس میں تیری ہدایت کی اک رات بھی ضامن نہیں

تو گھٹتے گھٹتے آنکھ سے اک شب نہاں ہو جائے گا
اور فلک کے اس گردش سے پھر منہ ڈھانپ کر سو جائے گا
چھپنا نگاہوں سے تیرا لیکن فنا ہونا نہیں
یعنی کہ موت دائمی سے آشنا ہونا نہیں

(۵)

آیا نکل پھر ہاتھ میں تھامے بقا کے جام کو
پھر تو نے بام چرخ سے ابرو دکھایا شام کو
گردش تری آغاز مثل آسماں پھر ہو گئی
دریائے اخضر میں تیری کشتی رواں پھر ہو گئی

شاعری

دم تکوین جو جاری ہوا انعام ازل
کہہ رہا تھا یہی ہر روح سے قسام ازل
یہ ہے اب دولت صد نوع سے گنجینۂ رب
ہم سے لے جائے وہ جس چیز کی ہے جس کو طلب
شاعر سادہ طبیعت یہاں ہشیار رہا
طالب حال بہت احمق و لاچار رہا
کہا قاروں نے خدا سے کہ خزانے دے دو
بولا شاعر مجھے دل دوز ترانے دے دو
ایک پر بوجھ ہے ایسا کہ زمیں گڑ جائے
ایک وہ چرخ پر جو اور ستارے جڑ جائے
پر پرواز ملے اس کو سبکساری سے
اور اسے غرق کیا زر کی گرانباری سے

صاحب زر جو ہے ڈرتا ہوا اک چور ہے وہ
حسن باطن پر نظر اس کی نہیں کور ہے وہ

ایک وہ ساز میں پیدا جو سدا سوز کرے
حسن مطلق کی تجلی کو دل افروز کرے

ہاتھ میں اس کے ہے فطرت نے دیا ساز اپنا
ذرے ذرے نے بنایا اسے ہم راز اپنا

اشک غم آنکھ میں اک گوہر نایاب بنا
داغ سینے میں جو ابھرا تو وہ مہتاب بنا

کبھی تبدیلی ہیئت پہ اگر یہ ٹھن جائے
اس کو دوزخ میں بھی ڈالو تو وہ جنت بن جائے

رنج دنیا کو بدل کر یہ تبسم کر دے
شور ہستی کو جو چھو جائے ترنم کر دے

پیغام عمل

کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر
بارشِ تیر حوادث میں جگر پیدا کر

گرم رو ہو کہ جہاں نقشِ قدم ہو تیرا
اس کفِ خاک میں بھی برق کے پر پیدا کر

تو اگر چاہے کہ گم ہو شبِ تاریک تری
سینۂ چاک بہ اندازِ سحر پیدا کر

قطرہ آغوشِ تلاطم میں گہر بنتا ہے
آبرو چاہے تو طوفاں میں گہر پیدا کر

خواہشِ تیغ کرے قوتِ بازو کی بھی شرط

آرزو تاج کی ہے تجھ کو تو سر پیدا کر
تیرے سینے میں اگر آتشِ خود داری ہے
چوٹ تجھ پر جو پڑے اور شرر پیدا کر
تیغ ہستی کے لیے سنگِ فساں ہے پیکار
راہ ایمن ہے تو خود اس میں خطر پیدا کر

ترانۂ حیات

مجھ سے نہ کہہ اس درد و الم سے ہستی ہے مثلِ خواب مری
کام ہے نقش بر آب مرا امید طلسم سراب مری
نیند کی ماتی روح ہے مردہ ، مردہ ہے جو بیتاب نہیں
چہرۂ بود بارنگِ نمودِ دہر بغیر حجاب نہیں
ہستی اصلی خلعتِ پوچ قبر نہیں انجام اس کا
خاک کا پتلا خاک ہے آخر روح نہیں پر نام اس کا
رنج و محن مقصود نہیں اور عیش نہیں معراج ترا
جہد و جہد میں ایسے بسر کر کل سے ہو بہتر آج ترا
کام ہے بھاری وقت بگولہ جان ہے پا بہ رکاب تری
عمرِ رواں کو بانگِ جرس آواز دلِ بیتاب تری
جنگ کا ہے میدان یہ دنیا دیکھ مصافِ ہستی تو
چھوڑ دے عجز پرستی کو اور ڈھونڈ نہ راہ پستی کو
یادِ زمانِ رفتہ کو تو پائے دل کی زنجیر نہ کر
اور فضا سے فردا ہی میں قصرِ طلا تعمیر نہ کر
ماضی ہے مردہ اور مستقبل اب تک بطنِ عدم میں ہے
حال ہے زندہ اس میں تکا کچھ دم باقی گر دم میں ہے

کام مشاہیرِ دنیا کے اب بھی کر سکتے ہیں ہم
یاں سے گزر جائیں تو چھوڑیں دہر پہ اپنے نقشِ قدم
نقشِ قدم رہ گم کردہ کو دستِ خضر بن جائیں جو
یاس کی شب میں بحرِ مسافر نجم سحر بن جائیں جو
اٹھ میرے ہمدم باندھ کمر اور صبر سے گرم کار ہو تو
پھر تیرے سر پہ جو آئے سہنے کے لیے تیار ہو تو

غیر مطبوعہ و غیر مدوّن کلام

خلیفہ صاحب کی ذہانت اور حاضر جوابی کا اندازہ خلیفہ صاحب کے درج ذیل فی البدیہہ اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جو موقع و محل کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک نظم اور سہرا بھی اسی طرح تحریر میں لایا جاتا ہے۔ جو نہ تو خلیفہ صاحب کے دیوان میں موجود ہے اور نہ ہی کسی رسالے میں چھپ سکے تھے۔

خلیفہ صاحب کے بچپن کے دوست میاں شمس الدین صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے خلیفہ صاحب کو ایک مصرع پر گرہ لگانے کے لیے کہا تو خلیفہ صاحب نے فوراً ہی شعر وہیں موزوں کر دیا۔

تم چلاؤ وہ عاشق دلگیر پہ

خلیفہ صاحب نے اسے یوں گرہ کیا

ناز ہو جس تیغ پہ جس تیر پہ

پھر کہنے لگے

کوہ کن کی داد ہمت ہے بجا
ہر زباں محو ہے جوئے شیر پہ

ہے مجھے ہمدم یہ ہر دم آرزو
دم نکل جائے دمِ شمشیر پہ

علی گڑھ میں خلیفہ صاحب کا ایک دوست تربھون کرشن پڑھتا تھا۔ نہایت حسین جمیل، ماتھے پر قشقہ کھینچے رہتا تھا۔ خلیفہ صاحب نے یہ شعر اس کے حسن کی تعریف میں کہا۔

ماتھے پہ قشقہ، قشقے پہ ٹیکا ٹیکے پہ موتی ہے بیم کا
شاخ شجر پہ شاخ پہ گل اور گل پر موتی شبنم کا

بقول میاں شمس الدین صاحب[1] پانی والا تالاب پر سکھوں کا جلسہ ہوا۔ انھوں نے خلیفہ صاحب کو مجبور کیا کہ ان کے جلسے کے لیے وہ کوئی نظم حاضرین کو سنائیں۔ خلیفہ صاحب نے ان سے وعدہ کر لیا اور بیٹھے بیٹھے ایک نظم لکھ ڈالی۔ جب جلسے میں نظم سنائی گئی تو سکھوں نے انھیں پھولوں سے لاد دیا۔ چند شعر درج ذیل ہیں۔

ہے رتبہ بالا بس اُن کا
جو کام کریں گے مردانہ
چڑھتے ہیں اوج ثریا پر
کیا شان ہے ان کے زینوں کی

نذرِ حیدری

زباں ہلکی سی اِک موجِ بیاں ہے — مگر دل ہے کہ بحرِ بیکراں ہے
رُخِ فطرت پہ پیدا تازگی ہے — یہ کشور آج کشتِ زعفراں ہے

چلی ہے آج کیا بادِ بہاری
چمن کا ذرّہ ذرّہ نغمہ خواں ہے

ہے جسمِ انساں کا اِک جامِ سفالی — یہ دھرتی ایک تیرہ خاکداں ہے
مگر انساں کے مقصد ہیں فلک سیر — جو گردِ راہ ہے وہ کہکشاں ہے

---

[1] میاں شمس الدین صاحب انٹرویو

عروج ابنِ آدم کی نہیں حد
زمیں سے آسماں تک نردباں ہے

جسے تو عرش سمجھا وہ بھی ہے فرش
فرازِ آسماں اور آسماں ہے

کہاں جاتی ہے عمرِ ارتقا کُش
ترے مقصود کی منزل کہاں ہے

اڑا شبنم کا قطرہ سوئے خورشید
ادھر دریا سمندر کو رواں ہے

ابھی آگے ہیں باقی کیا مدارج
ابھی تقدیر میں کیا کیا نہاں ہے

اگر پوچھو ہے درجہ کوئی باقی
ہے برجستہ جواب اس کا "کہاں ہے"

بڑی عظمت ہے مقصد کی بلندی
ستاروں میں ہما کا آشیاں ہے

بہت مشکل سے ملتی ہے بزرگی
بہا خونِ جگر آرام جاں ہے

بڑے خطرے ہیں یاں اک اک قدم پر
سیاست بھی عبورِ ہفت خواں ہے

بڑا انساں حسد کا ہے نشانہ
کھنچی ہر ایک کی اس پر کماں ہے

بڑھوں کا دوست اک اور سو ہیں دشمن
بڑائی بھی بہت سودا گراں ہے

جہاں پر ہے کمال اس جا حسد ہے
جہاں پر آگ ہے واں پر دھواں ہے

مگر ہے زندگی پیکار کا نام
جہاد اس تیغ کو سنگِ فساں ہے

شناور پر بڑے طوفاں کی کشتی
گیا وہ راہ کو اس سے اماں ہے

بہت ہے چاند پر کتوں کی عف عف
مگر وہ خامشی میں ضو فشاں ہے

بڑا انسان ہے مینارِ ہستی
صدا ہے خیر ہمرنگِ اذاں ہے

نظامِ سلطنت میں کوہکن ہے
مگر شیریں زباں شیریں دہاں ہے

دلوں کو ایک رشتے میں پرو کر
امامِ سلطنت تسبیح خواں ہے

ادھر دل پر ہے داغِ دردِ انساں
ادھر ماتھے پہ سجدوں کا نشاں ہے

ہے حسنِ سیرت و فطرت کا عاشق
کمالِ علم و فن کا قدرداں ہے

جس انسان کی بلندی پر نظر ہے — زمیں پر چلتا پھرتا آسماں ہے
جسے تاریخ کہتے ہیں وہ کیا ہے — کمال اور ہمتوں کی داستاں ہے
ہو بے جوہر ہے رستے کا ہے کنکر — ہنرور ہے تو اک سنگِ نشاں ہے
پھڑک دے جان تو مرتا نہیں وہ — برس کر بھی کہیں پانی رواں ہے
مبارک ہے جسے ہو کامیابی — جہاں کی زندگی اک امتحاں ہے
نہیں نیکی تو عظمت سیمیا ہے — نہیں تقویٰ تو دولت رائیگاں ہے
ملے گر سلطنت ایمان دے کر — تو انساں کے لیے سودا گراں ہے
بڑا وہ ہے جو چھوٹوں کا ہے خادم — بڑائی ورنہ اک وہمِ گراں ہے
ہیں اک وہ خانداں پر ہے جنھیں فخر — مگر تو ہے کہ فخرِ خانداں ہے
جو فخرِ اجداد پر کرتا ہے اس نے — گدائی اک دکانِ استخواں ہے
تری عظمت نہیں منت کشِ غیر — یہ خورشید اپنی ضو سے زرفشاں ہے
کمال انسان عہدے کی ہے زینت — مکیں کی شان سے شانِ مکاں ہے
جو اوروں کو بڑا کر دے بڑا ہے — وگرنہ خود غرض ہر انس و جاں ہے
ہے جاہ و سلطنت حق کی امانت — امیں جب تک ہے دنیا میں اماں ہے
ہر اک صورت سے گھاٹے میں ہے انساں — بھلائی سے فقط جو بے زیاں ہے
نہ بیچی جاں نثاری بے اثر ہے — نہ بیچی جانفشانی رائیگاں ہے
ہے نیکی سرمدی، ہیں نیک زندہ — یہی رازِ حیاتِ جاوداں ہے
بہت ہے ابھی ایام کم ٹھٹ — جو ضبطِ نفس ہو تو خوش عناں ہے

ابھی ہے منزلِ مقصد بہت دور
حدی تو تیز کر محمل گراں ہے

نظیرِ آصفِ سابع نہیں ہے — وزیر اس کا ہے جو صاحبقراں ہے
تیرا دفتر ہے اس کا دفترِ عدل — اگر شاہِ دکن نوشیرواں ہے

ہے اب اس شہر پر دہلی کو بھی رشک
دکن اب مرکزِ ہندوستاں ہے

مسافر محملوں میں چین سے سوئیں
بہت بیدار میرِ کارواں ہے

لنڈھاتا ہے شراب علم کے خُم
بڑا فیاض یہ پیرِ مُغاں ہے

جو ہے اس عزم اور محنت کا حاصل
وہ ٹہنی پر ثمر بن کر عیاں ہے

تری پیری ہے تکبیرِ جوانی
جواں بختی ہے اور ہمت جواں ہے

ترا مشکور ہے ہر پیر دہرنا
ترا ممنون ہر خورد و کلاں ہے

تری گفتار ہے لبریزِ حکمت
خموشی مصلحت کی ترجماں ہے

بڑی قیمت کی صہبائے کہنہ
تری ہم عمرائے پیرِ مغاں ہے

کھلے ہیں گل یہاں ہر رنگ بُو کے
طبیعت ہے کہ گلزارِ جہاں ہے

بجا ہے گر کرے تو ناز اس پر
ترا عاشق حکیمِ نکتہ داں ہے

یہ نظم جامعہ عثمانیہ میں الوداعی تقریب میں پڑھی گئی ۱۹۴۹ء

بس اب رخصت اے دوستانِ قدیم
نئے دبستانِ جہاں الوداع

وہ کیا صحبتیں بذلہ انگیز تھیں
میں اب ان کو ڈھونڈوں کہاں الوداع

جُدائی مری جامعہ سے ہے یوں
کہے جسم کو جیسے جاں الوداع

بہت اس میں کیں زمزمہ سنجیاں
وہ لطفِ زبان و بیاں الوداع

بس اب آگیا پارسائی کا دور
جوانی کی سرمستیاں الوداع

شاعر کی حیثیت سے

میرے سامنے ہے نئی زندگی
پرانا زمان و مکاں الوداع
کہاں دل سے نکلے گا دیرینہ عشق
نہاں شوقِ وصل اور عیاں الوداع
نیا باغ ہو گا نیا اشتیاق
قدیم ہم نوا قمریاں الوداع
وطن بن گئی تھی زمینِ دکن
تھا جس پہ وطن کا گماں الوداع
میں جاتا ہوں کہسار کشمیر میں
بس اب ملک ہندوستاں الوداع
بنائیں گے خلوت میں کاشانہ اب
عماراتِ رفعت نشاں الوداع
زمانے میں کس چیز کو ہے ثبات
بہاروں کو کہہ دے خزاں الوداع
گیا دہر سے دورِ عیش و سکوں
سکون و سکوتِ جہاں الوداع
ہے اب فتنہ انگیزیوں کا ہجوم
گیا آشتی کا سماں الوداع
نہ وہ مے کدہ اور نہ ساقی رہے
فقط ذاتِ حق ہے جو باقی رہے

ھدیۂ تہنیت

بتقریب شادی خانہ آبادی محبّ مومی اشفاق شمس الدین سلمہٗ رب الافاق
از مخلص سراپا تسلیم عبدالحکیم پی۔ایچ۔ڈی

وصلِ جاں افزا تمنا کا ہے دامن گیر آج
گویا ہم آغوش ہے تقدیر سے تدبیر آج

خود شکاری چل رہا ہے پائے در زنجیر آج
ہے مسخر کرنے والا ہو گیا تسخیر آج

اس گرفتاری میں رنگِ قید بھی زینت بھی ہے
اُڑ گئی یعنی تمیزِ زیور و زنجیر آج

ایک مدت تک رہا جو خوابِ لذت آفریں
کیسی خوبی سے ہوئی اس خواب کی تعبیر آج

جس کا خاکہ مدتوں تک سایۂ بے رنگ تھا
رنگ بھرنے کے لیے مضطر ہے وہ تصویر آج

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی دعائے مستجاب
روبرو آکر کھڑی ہونے کو ہے تاثیر آج

کیمیا گر تجھ سے خوش قسمت نظر آئیں گے کم
گھر میں تیرے آپ چل کر آگئی اکسیر آج

بے تکلف کچے دھاگے سے کھچے آتے ہیں وہ
عشق بازی کو کہے گا کون ٹیڑھی کھیر آج

ہم نے اس زاہد کو دیکھا ہی نہ تھا توبہ شکن
مل گئی جنت ہے حور دمے سے دامن گیر آج

پھر کوئی فرہاد شیریں کی طلب میں تیشہ زن

بے ستوں سے کاٹ کر لائے گا جوئے شیر آج
ہے صدائے غم بدل کر نغمۂ شادی بنی
نالۂ زنجیر میں ہے چنگ کی تقریر آج
ہو گیا مفتوں زمیں پر دیکھ کر رنگِ شباب
ہوش کھو کر کھا رہا چکر ہے چرخِ پیر آج
یاں گلو اور داشترو وو کی شرحِ زیرِ غور ہے
اور وہاں ہے فانکِحُوا ما طاب کی تفسیر آج
شمس سے کرتا ہے جو ماہِ فلک کسبِ ضیا
ایسے نوشہ سے ہے کوئی طالبِ تنویر آج

دانہ

یہ پوچھا دانے سے زندہ در گور کس لیے خاک پوش کیوں ہے
ذرا سا جسم تیرا اٹھائے زمیں کو بالائے دوش کیوں ہے
ہے روشنی آگہی کا منبع عدم ہے سامانِ ہوش کیوں ہے
فضائے ہستی میں آ نکل نہ فنا میں بیہودہ کوشش کیوں ہے
کہا یہ دانے نے بن گیا پردۂ حقیقت مجاز میرا
یہ خاک ہو کر رہے گا اک دن ہے دل میں بیتاب راز میرا
تو جانتا ہے زمیں میں گڑھنا میرے لیے مرگِ ناگہاں ہے
یہ میرا ایثار بے ثمر ہے یہ جوششِ اشکِ خاکداں ہے
یہ میرے ایثار کا ہے مقصد کہ ٹہنیاں سبز کھِل کھلائیں
فضا ہو ہو گا مرنگ دلبر کا پرند شاخوں پہ چہچہائیں

حویلی لے گیا لالہ حویلی غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

خدا بھی لامکاں بندہ بھی بے گھر خدا کی اک صفت میں نے بھی لے لی

اپنی وہ آنکھیں نچوڑیں وا نہ انگور دار
ساقیِ جمشید میری آج مے خواری بھی دیکھ

قوتِ سیل جو حاصل ہو تو دیوار نہ بن
قبضۂ غیر میں رہنا ہو تو تلوار نہ بن
دل کی خاطر تو ہے جائز تجھے بے جانا بھی
صرف آنکھوں کا مزا ہو تو خریدار نہ بن

بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ

بھگوت گیتا دنیا کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے تراجم بہت سی زبانوں میں ملتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ سب سے پہلے فیضی نے اسے زبانِ فارسی میں نظم کیا تھا۔ لیکن زمانہ حال کی تحقیق کی روشنی میں یہ ترجمہ فیضی کا نہیں بلکہ ناظم مسیح پانی پتی کا ہے جو کیرانا ضلع مظفر نگر سے پانی پت آ گئے تھے۔[1]

خلیفہ صاحب نے زمانہ طالب علمی میں اوائل اوائل بھگوت گیتا کا یہی ترجمہ پڑھا تھا اور بقول "ان کے اکثر برجستہ اشعار ان کے لوحِ ذہن پر ثبت ہو گئے تھے۔ اگرچہ وہ اس زمانہ میں بھی اچھے شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کے اپنے کہنے کے مطابق۔ ان میں "طالب علمانہ تابِ سخن" اتنی نہ تھی کہ اس عظیم الشان صحیفے کے ترجمے کی جرأت کر سکتے۔"[2] لیکن خلیفہ صاحب کی طبیعت پر گیتا کے جو اثرات مرتب ہوئے تھے وہ آنی جانی

---

[1] بھگوت گیتا ترجمہ محمد اجمل خاں ص ۱۳

[2] دیباچہ بھگوت گیتا از خلیفہ عبدالحکیم ص ۳

نہ تھے۔ نتیجتاً طلبِ شوق اور تلاشِ حقیقت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اس کے مفاہیم کی گہرائیوں تک پہنچیں اور روحانی آسودگی کا سامان بہم پہنچائیں۔ لہٰذا انھوں نے نہ صرف انگریزی نظم اور نثر میں گیتا کے تراجم دیکھ ڈالے بلکہ گیتا کی تعلیم پر متعدد مضامین اور کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔ جب یہ منزل سر ہوگئی تو گیتا سے مناسبتِ طبعی نے تقاضا کیا کہ اُسے اردو کے قالب میں ڈھالا جائے یہ کام نہایت کٹھن تھا۔ خلیفہ صاحب سے پہلے نثر اور نظم میں بہت سے ترجمے ہو چکے تھے۔ نثر میں بھگوت گیتا کا ترجمہ لالہ کرپارام بھاٹیہ کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ترجمہ گیان پریس گوجرانوالہ سے منشی برج لعل کے اہتمام سے بھی چھپا تھا۔ لیکن سب سے اچھا ترجمہ محمد اجمل خاں کا مانا جاتا ہے۔ اردو کے ان نثری تراجم کے علاوہ منظوم تراجم اثر لکھنوی، منور لکھنوی، مولانا سید حبیب اور خواجہ دل محمد کر چکے ہیں۔ جن میں مولانا سید حبیب صاحب اور خواجہ دل محمد صاحب کے تراجم اچھے تراجم کہے جا سکتے ہیں۔ خلیفہ صاحب سے پہلے جو منظوم تراجم ہوتے ان میں دو نقائص نمایاں تھے۔ ایک نقص یہ تھا کہ بعض حضرات نے لفظی ترجمہ کر کے گیتا کی روح کو پامال کر دیا تھا۔ دوسرا عیب یہ تھا کہ آزاد تراجم ہونے کی بنا پر مطالب و مفاہیم میں افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی۔ خلیفہ صاحب نے پہلا راستہ اختیار کیا۔ لیکن اس طرح کہ لفظی ترجمہ ہوتے ہوئے بھی گیتا کی روح اس سے سرمو انحراف نہ کیا۔ وہ چاہتے تو آزاد ترجمہ بھی کر سکتے تھے۔ لیکن بقول ان کے۔

"بعض وجوہ سے طبیعت نے اُسے گوارہ نہ کیا۔ ایک عظیم الشان الہامی تعلیم کے ساتھ یہ آزادی کچھ گستاخی بھی معلوم ہوئی"[۱]

اب رہیں ترجمے کی دقتیں تو اس کے بارے میں بھی انھوں نے واضح راستہ اختیار کیا یعنی ترجمہ کرتے ہوئے صرف ان الفاظ کا اضافہ کیا جو کلام کو موزوں کرنے کے لیے

۱؎ دیباچہ بھگوت گیتا از خلیفہ عبدالحکیم ص ۴

برائے ضرورت شعری لائے جاتے ہیں۔ اور ان سے مطلب و مقصد میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ کسی نثر کو نظم میں ڈھالتے وقت یہ مرحلہ نہایت نازک اور انتہائی کٹھن ہوتا ہے۔ ایک محتاط مترجم کی طرح خلیفہ صاحب نے یہ منزل طے کی ہے اور دشوار گزار راستوں سے بطریق احسن نکل آئے ہیں۔ دیباچہ میں ان دشواریوں کے بارے میں خود رقم طراز ہیں کہ:

"وزن پورا کرنے کے لیے کچھ الفاظ ادھر اُدھر گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں۔ لیکن تولنے والے کا فرض یہ ہے کہ جس جنس گراں بہا کو تولنا مقصود ہو۔ اس کا کچھ حصہ نہ نکلے نہ سب سے سونے کو بہت کم مائع چیزوں کے ساتھ تولا جاتا ہے۔ اس میں سونے کی کوئی تحقیر نہیں ہوتی بقول عارف رومی:

در ترازو جو رفیق زر شدہ است

"بھگوت گیتا کے سونے کے ساتھ ساتھ اس ترجمے میں میرے الفاظ کے جو بھی شریک ہیں ان کو اصل کے ساتھ ملا کر اس ترجمہ کو پڑھنے والے کو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ جو الفاظ میں نے اپنی طرف سے ڈالے ہیں وہ محض بغرض وزن اور برائے بیت نہیں۔ بلکہ اکثر جگہ پر ان کا مقصد تشریح بھی ہے اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ ترجمہ درست ہونے کے ساتھ تشریح اور شعریت سے ہم آغوش رہے۔"[1]

گیتا کے چند اچھے منظوم تراجم میں مولانا سید حبیب صاحب کا ترجمہ لمبی بحر میں ہونے کی وجہ سے شعریت اور بلاغت کھو بیٹھا ہے۔ حبیب صاحب کی اس بحر کے نقص نے انھیں جا بجا مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہر شعر میں الفاظ کا بے جا اصراف کریں۔ اُدھر منیر لکھنوی نے بھی گلزار نسیم کی بحر میں اس کا ترجمہ کر کے شعری حلاوت اور روانی کو ضعف پہنچایا ہے۔ دونوں مطالب و معانی کو پوری طرح ادا نہیں کر سکے۔ اب رہا خواجہ دل محمد دل صاحب اور خلیفہ صاحب کا ترجمہ تو دونوں نے ایک ہی بحر استعمال

---

[1] دیباچہ بھگوت گیتا ص د

کی ہے۔ مگر حق بات یہ ہے کہ سلاست و روانی، دروبست الفاظ اور چستی تراکیب کے لحاظ سے خواجہ صاحب کا ترجمہ خلیفہ صاحب کے ترجمے پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خلیفہ صاحب نے اس ترجمہ میں بھگوت گیتا کی روح کو آشکار نہیں کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے یہاں بھی بمقابلہ خلیفہ صاحب، خواجہ صاحب زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ بعض مقامات پر خلیفہ صاحب نے ضرورت سے زیادہ اختصار برتا ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جہاں تشریحی مواد ضرورت سے زیادہ ٹھسا دیا گیا ہے۔ یہ نقص خواجہ صاحب کے ترجمہ میں بھی پایا جاتا ہے، مگر کم۔ اگر محمد اجمل خاں صاحب کا نثری ترجمہ سامنے رکھ کر دونوں حضرات کا اس پہلو سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مختلف مقامات پر دونوں اصل سے ہٹ گئے ہیں اور جیسا کہ ترجمہ ہونا چاہیے تھا ویسا نہ ہو سکا۔ بہرکیف خواجہ صاحب کے ترجمے سے قطع نظر خلیفہ صاحب کا ترجمہ اپنی جگہ نہایت وقیع اور جامع ہے۔ ان کے بعض اشعار سلاستِ شعری کی نہایت اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر مطالب کو اس طرح سمیٹا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

بھگوت گیتا کے دوسرے ادھیائے (باب) ہی میں جب سری کرشن ارجن پر روح، جسم اور فنا و بقا کے راز منکشف کرتے ہیں تو خلیفہ صاحب انھیں یوں الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔

"یہ جانیں نہ قاتل نہ مقتول ہیں
جو ایسا سمجھتے ہیں مجہول ہیں
حقیقت ہے جو آفریدہ نہیں
وہ دستِ قضا سے بریدہ نہیں
ہر اک روح ہے نفخِ روحِ ازل
نہ اس میں تغیر نہ اس میں بدل
یہ جوہر نہ ہرگز گھٹے اور بڑھے

نہ کاٹے چھٹے اور نہ اُترے چڑھے
جو اس راز سے آشنا ہو گیا
وہ عارف سراپا بقا ہو گیا
بدن کی یہ سب صورتیں ہیں لباس
بدلتی نہیں جس سے جاں کی اساس
اگر جامہ ناپاک ہو یا کہن
سے بہتر اُتر جائے وہ پیرہن
جو آلودہ ہو پیرہن پھینک دے
اسی طرح جاں یہ بدن پھینک دے"[1]

رُوح کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے سری کرشن پھر فرماتے ہیں۔ اُردو اصل ترجمہ یوں ہے۔

۱۔ وہ ناقابلِ قطع ہے۔

۲۔ نہ جلنے والی ہے۔

۳۔ نہ خشک و تر ہونے والی شے ہے۔

۴۔ وہ دائمی ہے۔

۵۔ ہر جگہ موجود ہے۔

۶۔ منتقل ہے۔

۷۔ غیر متحرک ہے۔

۸۔ قدیم ہے۔

۹۔ نہ تم اُسے محسوس کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ نہ خیال اس کا تصور کر سکتا ہے۔

۱۱۔ وہ غیر متبدل ہے۔ لہٰذا اُسے ایسا سمجھ کر تجھے اُس کے واسطے غم نہ کرنا چاہیے۔

خلیفہ صاحب اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

---

[1] بھگوت گیتا از خلیفہ عبدالحکیم ص ۱۰ - ۱۱

کسی آگ میں پڑ کے جلتی نہیں
کسی آب میں گھلتی گلتی نہیں
نہیں اُس کو چھوتا ہے تار نظر
نہ گرمی سے خشک اور نہ پانی سے تر
یہ باطن ہے ظاہر کی حد سے پرے
ہر ایک تیر و شمشیر و دید سے پرے
نہ ادراک نے راہ پائی وہاں
نہ وہم و گماں کی رسائی وہاں
سمجھ لے اگر اس طرح ارجمند
تو ہر طرح خوف اور غم سے بلند[1]

بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے میں خلیفہ صاحب کی روانی اور بلاغت کلام قابل تعریف ہیں۔ اس کے علاوہ خلیفہ صاحب نے کسی کسی جگہ قابلِ داد اختصار سے کام لیا ہے

روانیٔ کلام

اُبھرتے، سنورتے، گذرتے ہیں سب
عدم کی طرف عود کرتے ہیں سب
اُٹھائی ہے سر جیسے دریا سے موج
گھڑی بھر کا ہے سب غرور اور اوج

بلاغت کلام

مضطرب دل کو لبّ بیان کے پیرایہ میں لاتے ہیں۔

---

[1] ترجمہ بھگوت گیتا خلیفہ عبدالحکیم دوسرا ادھیائے ص ۱۱ - ۱۲

وہ بگڑتا ہے ایسا کہ رُکتا نہیں
جھکائیں جدھر کو وہ جھکتا نہیں
شرارے اُڑاتی ہے ہر سمت آگ
ہوا کی نہیں موڑ سکتے ہیں باگ
بتا نا قسموں کی ہے منزل کہاں
تلاطم زدوں کا ہے ساحل کہاں[1]

اِختصارِ کلام

آٹھویں ادھیائے میں "ذات ابدی" "علم نفسی" اور کرم کے بیان میں ایک جگہ آیا ہے۔

اے کونتیہ! جو شخص اس جسم کے چھوڑنے کے وقت جس چیز کا دھیان رکھتا ہے، اس کے پاس رہ جاتا ہے اور ہمیشہ قدرتاً اسی سے واصل ہو جاتا ہے۔

خلیفہ صاحب اُسے یوں ادا کرتے ہیں۔

دمِ مرگ جس شے کی یاد آئے گی
اسی سمت یہ جاں کھچی جائے گی[2]

مختصر یہ کہ خلیفہ صاحب نے بھگوت گیتا جیسی بلند پایہ فلسفیانہ تصنیف کو نظم کے قالب میں ڈھال کر اُردو کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

---

[1] ترجمہ بھگوت گیتا خلیفہ عبدالحکیم چھٹا ادھیائے ص ۶۱ - ۶۲

[2] ایضاً آٹھواں ادھیائے ص ۷۶

باب ہفتم

انتخاب کلام حکیم

انتخاب دیوانِ حکیم

خلیفہ صاحب کے شعری مرتبے اور فکری مقام پر گذشتہ ابواب میں سیر حاصل مباحث پیش کیے جا چکے ہیں۔ خلیفہ صاحب کی نظموں اور غزلوں پر اس انتخاب کے بارے میں صرف ان باتوں کی وضاحت ضروری ہے جنھیں اس انتخاب کے دوران مدِنظر رکھا گیا ہے۔

خلیفہ صاحب کی زندگی مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کا عکس ان کی شاعری میں موجود ہے۔ وہ سخن فہم، سخن شناس اور صاحبِ فکر آدمی تھے اس کے ساتھ ہی گہرا جمالیاتی شعور رکھتے تھے۔ معیاراتِ زیست کے بارے میں اعلیٰ نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ ان تمام موضوعات پر نظموں کا انتخاب ضروری نہیں سمجھا گیا۔ سبب یہ ہے کہ تمام شخصی خصوصیات کے یا صرف بعض لوگ زندگی کی چند منتخب اقدار کو اس طرح اپناتے ہیں کہ وہ ان کی زندگی کا کل بن جاتی ہیں۔

خلیفہ صاحب کی شاعری کے ان حصوں کا مطالعہ کیا جائے جن میں خلیفہ صاحب کی زندگی کے فکری اور فلسفیانہ پہلو آئے ہیں تو ان حصوں میں بحیثیت شاعر خلیفہ صاحب چنداں باکمال نظر نہیں آتے۔ خلیفہ صاحب کی شعری صلاحیتیں ان کی جذباتی اور جمالیاتی زندگی کے ابلاغ میں نمایاں ہوتی ہیں۔ ان غزلوں اور نظموں میں فکر پر جذبہ غالب ہے۔ اعلیٰ تخلیقی عمل کے لیے لازمی ہے کہ انسان کی فکری صلاحیتیں اس کی جذباتی اور روحانی صلاحیتوں کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہوں کہ شاعری ذہن کی نہیں دل کی آواز معلوم ہونے لگے۔ خلیفہ صاحب کی فلسفیانہ نظموں میں جو ایک بیانیہ اور سپاٹ لہجہ موجود ہے۔ وہ جذباتی شاعری میں اعلیٰ استعاروں کی شکل اختیار کرتا ہے۔

میرا جذباتی نظر سے یہ مقصد نہیں کہ خلیفہ صاحب نے موضوعی رویوں میں معروض کو نظر انداز کر دیا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ معروض کی ہر چیز خلیفہ صاحب کی زیرِ نظر غزلوں اور نظموں میں موضوعی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

ان نظموں اور غزلوں میں خلیفہ صاحب صورتِ حال میں ذاتی طور پر داخل بھی ہوتے ہیں۔ اور صورتِ حال کو معروض کی حیثیت سے دور کھڑے ہو کر بھی دیکھتے ہیں۔ اس لیے کسی جگہ تعریفِ حسن میں رومانوی جھلک نظر آتی ہے، تو دوسری جگہ بعض چیزوں پر بھرپور طنز بھی محسوس ہوتی ہے۔

خلیفہ صاحب اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح علامہ اقبال کی شاعری سے متاثر تھے۔ ان کے ہاں اکثر نظموں میں اقبال کے اشعار کا آہنگ اور لب و لہجہ موجود ہے۔ مضامین بھی اقبال کے فلسفے اور فکر سے متاثر ہیں۔ شخصی انا، انسانی آزادی اور خودی کی مختلف شکلوں میں تفسیر خلیفہ صاحب کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن جہاں تک زیرِ نظر نظموں اور غزلوں کے انتخاب کا تعلق ہے کوشش کی گئی ہے کہ ان اشعار کو منتخب کیا جائے جہاں خلیفہ صاحب انفرادی عملاً حلقوں میں حیثیت ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اس اعتبار سے خلیفہ صاحب اقبال سے متاثر دوسرے ہم عصروں سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر امین سیالکوٹی، میر ولی دارثی اور نفیس خلیلی کی طرح خلیفہ صاحب تمام عمر اقبال کی زمینوں اور بحروں میں طبع آزمائی نہیں کرتے رہے بلکہ اپنے لہجے اور اسلوب میں بھی بہت اچھے شعر کہے ہیں۔

اس تمہید کے ساتھ غزلوں اور نظموں کا انتخاب حاضر ہے۔

غزلیات

سب برگ و بار سبز ہیں اور شاخسار سبز
یعنی کہ نغمہ سبز ہے اور ساز و تار سبز

ماند سایہ نقشِ قدم کے نشان ہیں
جادہ کے خط کو دیکھ سرِ رہ گذار سبز

ہر چیز زیب تن ہے کیے حلیۂ بہشت
میدان و کوہسار یمین و یسار سبز

ہر نخل سبز، سبز زمیں پہ ہے جھومتا
گویا ہے اسپِ سبزہ کے اوپر سوار سبز

ممکن ہے پڑ گئی ہو تنِ مُردہ میں بھی جاں
جوشِ نمو میں ہے رگِ سنگِ مزار سبز

سبزے سے ہے جو خاک کا عنصر بدل گیا
ہے توسنِ نسیم سے اُٹھتا غبار سبز

اس میں ہے حسنِ شاہدِ قدرت چھپا ہوا
گویا کہ ہے نقابِ رخِ پردہ دار سبز

دنیا کا ذرّہ ذرّہ شہیدوں کی خاک ہے
شاید قبا انھیں کی ہے یہ یادگار سبز

جس جا بھی دخل آب ہے سبزہ کی ہے نمود
کیونکر ہر ایک شعر نہ ہو آبدار سبز

خامہ تھا چوبِ خشک جو محوِ بیاں ہوا
ذکرِ بہار سے ہوا پھر ایک بار سبز

—— (۲) ——

ملوث عکس سے آئینۂ روشن نہیں ہوتا
کہ رہ کر بحر میں بھی خضر تر دامن نہیں ہوتا

ہے تسخیرِ خودی تمہیدِ تسخیرِ جہاں اے دل
جو خود افگن نہ ہو پہلے جہاں افگن نہیں ہوتا

عدو تیرا نہ گردوں ہے نہ دشمن عالمِ دوں ہے
تیرا اپنے سے بڑھ کر کوئی بھی دشمن نہیں ہوتا

رہِ جاں میں ہے وابستہ خطر سے دل کی بیداری
وہاں غفلت کی نیندیں ہیں جہاں رہزن نہیں ہوتا

میری طبع رواں ہے ساحل و منزل سے بیگانہ
درونِ بحر موجوں کا کوئی مسکن نہیں ہوتا

یہاں ہر قطرۂ خونِ جگر لعلِ معانی ہے
جگر کاوی نہیں ہوتی تو حسنِ فن نہیں ہوتا

(۴)

آنکھ جس سمت اٹھائی ترا جلوہ دیکھا
ذرے ذرے کو یہاں ناصیہ فرسا دیکھا

ہے تری راہ میں ہر ایک قدم چشمۂ نور
ہم نے ہر نقشِ قدم کو یدِ بیضا دیکھا

جس کو دعویٰ ہے کہ ہوں خلوتِ جاں میں مستور
شوقِ جلوت میں اسے انجمن آرا دیکھا

ہم نے ہر ذرے کو ایک دیدۂ مجنوں پایا
ہر نظر گاہ کو ایک محملِ لیلا دیکھا

شوقِ محمل بھی ہے اور اس پہ کم آمیزی بھی
کثرتِ دہر میں ہم نے اسے تنہا دیکھا

کیا چھپے حسن وہ ہو جس کی نقاب آئینہ
پردہ تیرا صفتِ پردۂ سینا دیکھا

ڈھونڈتی جس کو نظر تھی وہ نظر میں تھا نہاں
جو کسی جا پہ نہیں ہے اسے ہر جا دیکھا

پھول کا رنگ ہو یا طائرِ گلشن کی ترنگ
ہم نے ہر رنگ میں اظہارِ تمنا دیکھا

عشق اور عقل کی پیکار ہے جنگِ زرگر
عشق کامل کو ہے ہم نے خرد افزا دیکھا

ہے فنا اور بقا زیر و بمِ مد و جزر
جس کا ساحل ہی نہیں ہم نے وہ دریا دیکھا

—— (۴) ——

تھی صبوحی سحر کے منظر میں
مے ملی ہم کو کاسۂ زر میں

ہے زمیں نورِ مہر سے روشن
ہے اگرچہ وہ بزمِ خاور میں

یوں تو ہر چیز پہ ہے پرتوِ دل
دل ہے لیکن جہانِ دیگر میں

زندگانی ہے آپ پیکر ساز
کیوں مقید ہو ایک پیکر میں

کبھی ساغر گداز ہے صہبا
کبھی ٹھہری نہ ایک ساغر میں

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
نہیں عالم یہ ہفت کشور میں

عرقِ سعیِ جبینِ حیات
اور کیا ہے نمودِ عنصر میں

تلخیِ بادۂ حیات کا لطف
کس نے پایا ہے شہد و شکر میں

چشمِ پُرنم میں تھے جو کچھ قطرے
جا ملے ہیں وُہ حوضِ کوثر میں
دل کے آئینے میں ہے جو صورت
نہیں آئینۂ سکندر میں
تھی کچھ ایماں سے بڑھ کے دُور رسی
جرأتِ رند و کفر کافر میں
تو ٹھہر جا یہیں پہ اے جبریل
نہ لگے آگ تیرے شہپر میں
حشر دائم کو جس نے دیکھ لیا
اور کیا دیکھ لے گا محشر میں

—— (۵) ——

اے میری جانِ ناتواں تجھ پہ ہے اعتبار کم
جبرِ حیاتِ بیکراں، قدرت و اختیار کم
گل اسی غم سے سینہ چاک لطف یہاں اٹھائیں خاک
درد و غمِ خزاں دراز فرصتِ نوبہار کم
ابر سیاہ دل کے دل چشمکِ برق ایک پل
سنگ کی تیرگی دبیز، روشنیٔ شرار کم
پُر ہے فضائے بوستاں زاغ و زغن کے شور سے
نغمۂ شاخسار کم، زمزمۂ ہزار کم
نشۂ وصل اک گھڑی طولِ خمار ہجر میں
ہو نہ سکی درازیٔ مدتِ انتظار کم
ریگِ رواں کا ہے وفور چشمۂ آب دُور دُور
وسعتِ خار دار بیش کشورِ لالہ زار کم

محمل یار ہو گیا قیس کی آنکھ سے نہاں
دشتِ جنوں میں دیر تک ہو نہ سکا غبار کم
خاک سیہ ہے پر زمیں، لعل و گہر کہیں کہیں
پھیلے ہیں یاں خزف بہت گوہرِ شاہوار کم
خلق خدا بہت مگر محرمِ دل ہیں خال خال
محفلِ ہست و بود میں غیر بہت ہیں یار کم
اہلِ ہوس کا ہے ہجوم، نوعِ مگس کا ہے ہجوم
طالبِ حسن بے شمار، عاشقِ جاں نثار کم
لمحے سکوں کے چند ہیں کشمکشِ حیات میں
کلفتِ دہر بے حساب لذتِ روزگار کم
بحر ہے یا سراب ہے وہم کا پیچ و تاب ہے
زندگی اضطراب ہے جاں کو ملا قرار کم

—— (۶) ——

یہ سوسن و نسترن، یہ سنبل
مَیخوار، بہار لالہ و گُل
گُل سے جو نکل رہا ہے ہر جُز
ہر جُز بنے گا اک دن کل
صہبائے حیات تھی بہت تیز
شیشے بھی شراب میں گئے گھل
کہتا ہے جسے تو شورِ ہستی
مینائے حیات کا ہے قلقل
واقف ہے نوائے راز سے دل
گُل میں بھی نوا ہے مثلِ بلبل

میں آئینہ ترا، تو ہے خود بیں
ہستی ہے ترا مرا تقابل
ہے عشق لطافت آفرینی
جاتی ہیں یہاں کثافتیں دُھل
گو ہیں ندی کے دو کنارے
ہے محبت عبور کے لیے پُل

— (۷) —

یہ فتنے یہ جفائیں یہ بلائیں
غرض یہ ہے کہ مجھ کو آزمائیں
کبھی چھپنا کبھی یک دم چمکنا
یہ ہیں برقِ تجلّی کی ادائیں
اسی ظلمات میں آبِ خضر ہے
بن جائیں رہنما میری خطائیں
چمن میں گل شفق میں رنگ مینا
رنگی سب نے ہیں صہبا میں قبائیں
ملی دردِ جگر میں مجھ کو لذت
یہی ہیں عشق کیا تیری سزائیں
جو ہر اک ذرّے ذرّے کا مکیں ہے
جہانوں میں اگر ڈھونڈیں نہ پائیں

— (۸) —

چند آنسو دیدہ دل میں ہمارے رہ گئے
صبح ہونے کو ہے اک منظور سے ستارے رہ گئے
گوہرِ نایاب نے چھوڑا انھیں آغوشِ موج
جو خذف پارے تھے دریا کے کنارے رہ گئے

تیز گام و گرم رو پہنچے ہیں سب محمل کے پاس
نقشِ پا بن کر مگر ہمت کے ہارے رہ گئے

کس نے عبرت اس سے لی گو روز ہوتا ہے یہی
چل دیا انسان اور سامان سارے رہ گئے

جب صلائے عام تھی تب پینے والے آ گئے
بیٹھے اک گوشے میں ہم قسمت کے مارے رہ گئے

یادِ عہدِ رفتگاں اور شاعری کا سوز و ساز
بے بسوں کے بس یہی دو اک سہارے رہ گئے

—— (۹) ——

رہتے ہیں بے حجاب ہی وہ جلوہ گاہ میں
ہے دیکھنے کی تاب بھلا کس نگاہ میں

حسنِ صنم چراغِ حرم سے الگ نہ تھا
کافر ہوا ہے دل یہ اسی اشتباہ میں

شیخِ حرم نشیں مری تسبیح دیکھنا
کتنے حسیں ستارے ہیں تارِ نگاہ میں

وہ گرم رو ہوں میں کہ یہ دونوں جہان بھی
ذرے سے بن کے رہ گئے ہیں میری گردِ راہ میں

تھا جس کا مال اس کے ہی آخر کیا سپرد
دل کو دیا ہے ہم نے اب اس کی پناہ میں

مغرور میں کبھی ظاہر و باطن ہیں ایک رنگ
دل کی کجی ابھرتی ہے طرفِ کلاہ میں

شانِ کرم کا ظلمتِ عصیاں میں ہے وطن
نورِ سپہر رہتا ہے چشمِ سیاہ میں

ہے تاجِ زر بھی سونے کا کچکول اے حکیم
پایا نہ ہم نے فرق گدا اور شاہ میں

—— (۱۰) ——

دُنیا میں چین اے دلِ مضطر کہیں نہیں
جو زیرِ آسماں نہ ہو ایسی زمیں نہیں
تیرے حریمِ ناز کی چوکھٹ ہے ہر جگہ
ذرّہ ہے کونسا جو سراپا جبیں نہیں
شاید کہ رازِ دہر کی اُٹھنے کو ہے نقاب
اب تو کوئی حسین بھی پردہ نشیں نہیں
انکار اور لیں سے نہ مایوس ہو حکیم
ہاں ہاں کی پردہ پوش ہے ان کی نہیں نہیں

—— (۱۱) ——

گو نہیں اقبال اور حالی نہیں
پر نواگر سے چمن خالی نہیں
ہے ہوس کا نام اب عشقِ مجاز
ہم نے یہ علت کبھی پالی نہیں
ذرّہ ذرّہ حُسن سے لبریز ہے
پیار سے تو نے نظر ڈالی نہیں
اختلالِ دل ہے سب ایمان و عشق
رُوح میں گر ہمتِ عالی نہیں
بے نقابی پر بھی ہیں سو سو حجاب
آنکھ ہی جب دیکھنے والی نہیں
اے چمن آرا کہاں ہے وہ چمن

جس جگہ سبزے کی پامالی نہیں

شعر حسن کر کہتے ہیں اہلِ زباں

ہے زباں اچھی پہ ٹکسالی نہیں

—— (۱۲) ——

عشق کے اضطراب نے مارا

علم کے پیچ و تاب نے مارا

ہے حجاب اِک نظر کی کوتاہی

ہم کو اپنی نقاب نے مارا

دل کی لالی ہوتی ہے ہر آفت

اسی خانہ خراب نے مارا

ہم تو تیرے کرم کے کشتہ ہیں

کس کو تیرے عتاب نے مارا

آرزو نے بہت دیئے دھوکے

اس فریبِ سراب نے مارا

شیخ کرتا کبھی نہ کچھ نیکی

اس کو خوفِ حساب نے مارا

کھوتے جاتے ہیں فکرِ رنگیں میں

شاعری کی شراب نے مارا

(۱۳)

محفل میں اس کی جا کے میں خاموش ہو گیا

جو سوچ کے گیا تھا فراموش ہو گیا

اٹھی وہاں نقاب تو میں بے خبر ہوا

جلوے کی ابتدا تھی کہ بے ہوش ہو گیا

احسان زندگی کا اُٹھاتا کہاں تلک
سر کٹ گیا تو میں بھی سُبک دوش ہو گیا

پردہ تھا شرم کا یہ سیاہی گناہ کی
میں ظلمتِ گناہ میں روپوش ہو گیا

سمجھو کہ جیتے جی ہی وہ پہنچا ہے خُلد میں
تیرے خیال سے جو ہم آغوش ہو گیا

جنت کی لذتوں سے عبادت گزار ہے
زاہد کو کیا یہ شوقِ خور و نوش ہو گیا

اب ہم کو اس کی ہیچ خراشی سے ہے نجات
ناصح سے کہہ دیا میں گراں گوش ہو گیا

(۱۴)

انساں کو ازل سے ملا ہے ستمگار دل
بے تاب برق کی طرح سے بے اختیار دل

اک دل کو آرزوؤں نے صد پارہ کر دیا
سینے میں آدمی کے نہیں ہیں ہزار دل

ہر ذرہ ایک دل ہے ہر اک قطرہ ایک دل
سب بحر و بر میں پھیل گئے بے شمار دل

ناپائیدار حسن ہے اور بے وفا ہے دہر
کس شے پہ اب کرے گا بھلا اعتبار دل

جس شعلۂ ہوس نے جلایا ہزار بار
پروانہ وار اُس پہ گرا بار بار دل

تسخیرِ مہر و ماہ کا رکھتا تھا حوصلہ
اس صید گاہ میں ہوا خود ہی شکار دل

پژمردہ آج ہے تو شگفتہ ہے کل ضرور
گویا کبھی خزاں ہے کبھی تو بہار دل

حق نے اسے بنایا غمِ عشق کے لیے
دھوکے میں کھا رہا ہے غمِ روزگار دل

ہر شے میں دیکھتا ہے جھلک حسنِ یار کی
اب تو ہر ایک چیز کو کرتا ہے پیار دل

(۱۵)

ہوس کے ابرِ سیاہ کی جب ہٹائی رُخ سے نقاب میں نے
حریمِ دل سے ہٹا کے پردہ کیا تجھے بے حجاب میں نے

نئے ستارے نظر پڑے ہیں جو اک نئے چرخ میں جڑے ہیں
ترے تصور میں جب کیا چشمِ دل کو محرومِ خواب میں نے

مری حقیقت تھی ایک ذرہ تھا دل کا سرمایہ ایک قطرہ
بنا کے آئینہ تیرے رُخ کا اسے کیا آفتاب میں نے

نظر پڑی جب سے تیرے رُخ پر نہیں ہے کوئی سوال باقی
سوال اس حال میں عبث تھا تو بند کر دی کتاب میں نے

جواب کیا دلنشیں تھا تیرا سنا جو میں نے سکوتِ شب میں
کلام کا واسطہ ہٹا کر کیا جو تجھ سے خطاب میں نے

میں داد دونگا تری نظر کی، تو داد دے میری چشمِ تر کی
مجھے کیا انتخاب تو نے، تجھے کیا انتخاب میں نے

حساب ہے دوستوں کا دل میں لکھا نہیں دفترِ عمل میں
حساب کے روز سادہ پائی عمل کی اپنی کتاب میں نے

اِدھر کرم بے حساب تیرا اُدھر گنہ بے حساب میرے
حساب کا چھوڑ تو بھی دھندا! کیا نہیں کچھ حساب میں نے

(۱۶)

کام نہ آسکیں مرے عقل کی پاسبانیاں
عشق کی رَو میں بہہ گئیں سب مری نکتہ دانیاں

ختم نہ ہو سکی کبھی عقل و جنوں کی کشمکش
عشق کی ہر روش سے ہیں عقل کو بدگمانیاں

حل نہ سکے وہ زور سے آہ و فغاں کے شور سے
ہار کے کامراں ہوئیں عجز کی ناتوانیاں

سوز و گداز نور ہے ذرہ میں اک سرود ہے
موت کا راز کہہ گئیں شمع کی زندگانیاں

شکوہ جو کچھ نہیں، شکر ہے اور کچھ نہیں
تیرے ستم میں بھی نہاں تھیں تیری مہربانیاں

یادِ سرود رفتہ ہے تیری صدائے بازگشت
دل کو ہیں مایۂ سرور گزری ہوئی کہانیاں

دل پہ بڑھا حجاب اور زباں پہ ہے اضطرابِ دل
روک سکیں شوق کو حسن کی لن ترانیاں

آہ یہ زہدِ نارسا اب ہوئے جا کے پارسا
رندی و میکشی میں جب بیت گئیں جوانیاں

(۱۷)

ہوا پیدا دل و جاں میں قرار آہستہ آہستہ
خوشا آرہی ہے پھر بہار آہستہ آہستہ

تمھارے خال و گیسو کی طرف بڑھتا ہوں رک رک کر
ہے جاتا دام کی جانب شکار آہستہ آہستہ

سنبھالے سے نہ سنبھلا عاشقی میں ضبط مشکل ہے
کہ ہو جاتا ہے دل بے اختیار آہستہ آہستہ

ابھی رفتہ بگردن ہم کھنچے جاتے ہیں پر اک دن
میری جانب کھنچا آئے گا یار آہستہ آہستہ

گرانے میں نہیں کچھ دیر لگتی اس عمارت کو
بناتا ہے جو دستِ روزگار آہستہ آہستہ

---

(۱۸)

نکل رہی ہے سحر، کاسۂ شراب اُٹھا
مثالِ صبح ہتھیلی پہ آفتاب اُٹھا

فضا میں کوندرہی ہیں جو بجلیاں بیتاب
فلک پہ کس کا ہے یہ گوشۂ نقاب اُٹھا

کھڑا کنارے پہ شاید ہے کوئی خانہ نشیں
کہ آنکھ بن کے ہے موجوں سے ہر حباب اُٹھا

کشش سے تیری ہے مد اور جزر دریا میں
دلوں کی موج بھی اے رشکِ ماہتاب اُٹھی

سکونِ جاں ہے جمادات یا فلک کو نصیب
مجھے ہے حکم کہ تو کیفِ اضطراب اُٹھا

اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہوں بحرِ ہستی میں
ہزار بار گرا اور کامیاب اُٹھا

رموزِ دہر کے ہے انکشاف کی کوشش
کتابِ عقل اُٹھائی ہے تو رباب اُٹھا

نیاز مند ہوں لیکن نہیں ہوں بے جوہر
میری طرف بھی کبھی چشمِ انتخاب اُٹھا

---

(۱۹)

دور بھٹکے دلِ حزیں نہ کہیں — چھپ کے بیٹھے ہوں وہ یہیں نہ کہیں
دل کی گہرائیوں میں چھپتے ہو — ڈھونڈ لے چشمِ نکتہ بیں نہ کہیں
تو بھی ہرجائی، ہم بھی ہرجائی — دیکھ لیں گے تجھے کہیں نہ کہیں
بارہا شک ہوا ملائک کو — عرشِ خالق ہو یہ زمیں نہ کہیں
تیری بخشش کی وسعتوں میں کریم — ایک ہی ہوں یہ کفر و دیں نہ کہیں
جس کو جورِ زمانہ کہتا ہوں — پسِ پردہ ہو نازنیں نہ کہیں
جس کو دوزخ سمجھ رہا ہوں میں — ہو ترا روئے آتشیں نہ کہیں
جس کو تاروں بھرا فلک سمجھا — ہو پُر افشاں تری جبیں نہ کہیں

تیرا انکار ہے فزونیٔ ذوق
"ہاں" ہی ہو یہ تری "نہیں" نہ کہیں

(۲۰)

شجر باغ میں کھا گیا آب و خاک — ہوا کو بھی شاخِ شجر کھا گئی
پرند و چرند اور انسان کی بھوک — ہے ترکاریاں اور ثمر کھا گئی
ہے بارش کا پانی زمیں پی گئی — اسے جو ملا خشک و تر کھا گئی
ہر اک بھوک سے بڑھ کے ہے جوعِ ارض — ہے سب کچھ زمیں سر بسر کھا گئی
ہوس نے کئی ایک دریا پیے — صدف میں چھپا کر گہر کھا گئی
کیا شام نے سیبِ خورشید ہضم — ستاروں کو چگ کر سحر کھا گئی
بھرا آگ نے اپنا ایندھن سے پیٹ — ہوا سب اڑا کر شرر کھا گئی
سمندر کو سورج ہے پیتا گیا — تپش بحر کو بے ضرر کھا گئی
دہن موت کا ہر طرف باز ہے — اِدھر آنکھ جھپکی اُدھر کھا گئی
خزاں آ گئی اے بہارِ چمن — تجھے ہائے کس کی نظر کھا گئی

تھی میٹھی بہت معصیت اے حکیم
وہ سب میرا زادِ سفر کھا گئی

(۲۱)

جان و جاناں میں امتیاز ہے کیا
کون کھولے سے یہ راز ہے کیا

یہ تجلی اپنے تک میں مشکل ہے
یہ سفر دُور اور دراز ہے کیا

عشق کو حسن سے ہے کیسا ربط
ناز سے رشتۂ نیاز ہے کیا

ہم تو رس میں ہیں مقیم مست
مے کا اس رنگ میں جواز ہے کیا

ظرفِ ہستی کو توڑ کر نکلی
عشق کی مے قدح گداز ہے کیا

ذرّہ ذرّہ ہوا ترنم ریز
ساری دُنیا ہی تیرا ساز ہے کیا

تُو ہی ظاہر ہے تُو ہی باطن ہے
اس حقیقت میں پھر مجاز ہے کیا

عشق میں امتیازِ جاہ نہیں
اس میں محمود بھی ایاز ہے کیا

تجھ میں پردہ نشیں ہے کون اے ساز
تیری آواز دلگداز ہے کیا

آستانے سے سر نہیں اُٹھتا
عاشقوں کی یہی نماز ہے کیا

خاکساری سے اوج ملتا ہے
اس سے انسان سرفراز ہے کیا

ہم بھی امیدوار ہیں واعظ
درِ رحمت تجھی پہ باز ہے کیا

دہر تیرا طواف کرتا ہے
تجھ میں پوشیدہ اے حجاز ہے کیا

منظومات

کوزہ گرِ دہر

یہ دہر کہ جامِ جم بنائے | ہر روز نئے صنم بنائے
خود اپنے ہی جام پھوڑتا ہے | ہر کہنہ صنم کو توڑتا ہے
انجم و مہ و آفتاب ساغر | ٹوٹے صفتِ حباب ساغر
مے خانے میں جام نو بنو ہیں | دنیا میں نظام نو بنو ہیں
ہستی کی سرشت میں ہے تغیر | ہر روز نئی ہے اس کی تعمیر
گل پچھلی بہار کے کہاں ہیں | سب پہلے حسین بے نشاں ہیں
ہر لحظہ نئی ہے اس کی تحریر | دیتا ہے مٹا بنا کے تصویر
ہر رنگ پہ پھیرتا ہے پانی | اول سے سوا نقشِ ثانی
ہستی کو جمود سے ہے نفرت | آئین و قیود سے ہے نفرت
قائم رہا دیر تک جو اک رنگ | وہ رنگ بدل کے بن گیا زنگ
فرق اس کے خرام میں نہ آیا | دریا کبھی دام میں نہ آیا
مت روک حیات کی روانی | سڑتا ہے ضرور بند پانی
یہ دہر کی سنت کہن ہے | اصلاح ہمیشہ بت شکن ہے

آئین ہے زندگی کا تجدید
یعنی ہے دلوں کی موت تقلید

(۲)

دل کی دنیا

جہاں میرا ہے تو اپنا بنا لے | تقاضا تھا خدا کا یہ بشر سے
بنایا دل نے پھر اک آسماں اور | بنے تارے جہانِ خونِ جگر سے

زمیں بھی اس نے خود اپنی بنائی — دیا پھولوں کو پانی چشمِ تر سے

طرب نے شاخ پر کچھ گل کھلائے — مگر جڑ ہے ہری غم کے اثر سے

گناہوں نے بھی کی کچھ آبیاری — بنے کالی گھٹا اور اس پہ برسے

گرائے شرمساری نے جو آنسو — درخشاں تر تھے وہ لعل و گہر سے

بنایا مرغِ جاں نے آشیانہ — لیے تنکے مگر برق و شرر سے

زماں کا اور مکاں کا اس میں کیا دخل — یہ کشور ہے پرے حدِ نظر سے

جو نور اس میں ہے عالم میں کہاں ہے — نکلتا یہ نہیں شمس و قمر سے

پرے ہے وقت سے یہ دل کی دنیا — نہیں ہے آشنا شام و سحر سے

جنھیں کچھ ایسی دنیا کی خبر ہے
وہ ہیں معلوم ہوتے بے خبر سے

—— (۴) ——

اے کاش

اے کاش میں ہوتا کوئی ساغر — لب ہوتے میرے تیرے لبوں پر

پیتا خود جب تجھے پلاتا — پیاس اپنی اپنے لب سے بجھاتا

یا ہوتا گلے میں تیرے مالا — ہو چاند کے گرد جیسے ہالہ

سینے کے ابھار سے ابھرتا — خود ہی ترے عشق سے سنورتا

دل تیرا کچھ اس طرح دھڑکتا — پنچھی ہاتھوں میں سے پھڑکتا

بندہ تیرے کان کا جو ہوتا — میں دہر میں آبرو نہ کھوتا

بن جاتا جو تیرا پیرہن میں
چھوتا رہتا تیرا بدن میں

———

(۴۷)

دکن اور پنجاب

واے وطن اے واے وطن

یہاں پہ ہیں کثرت سے نواب — جنس وہاں ہے یہ کم یاب
وہاں پہ انسان ایک چٹان — اور یہاں صابن کا حباب
یاں پہ سستی مستی ہے — عورت خاک سے سستی ہے
واں پہ محنت کی پوجا
یاں پر عیش پرستی ہے

یہ رسوائی میں بے خود — وہ عزت سے جیتے ہیں
یاں پر سیندھی ملتی ہے — واں پر لسی پیتے ہیں

گردن اونچی رکھتے ہیں — واں پہ مزدور اور کسان
یاں پر بھوکے اور ننگے — سوکھے اور سڑے بے جان

واں پہ جن پیکر ہیں جاٹ — یاں پہ تلنگے رہتے ہیں
واں پہ خودداری ہے بیکس — یاں پہ ننگے رہتے ہیں

یاں پہ خوشامد سب کا ہے فن — کوئی بڑا یا چھوٹا ہے
یاں پہ جو سکہ ہے رائج — وہ پنجاب میں کھوٹا ہے

بے ہمت بے جوش ہیں یہ — اک ٹولی پاپوش ہیں یہ
نیند میں کیا مدہوش ہیں یہ — آدمی کیا خرگوش ہیں یہ

واں پہ ولولہ اور اُمنگ یاں پہ محنت باعثِ ننگ
جو پچھموں سے جائیں دبک یاں ہیں ایسے بہادر جنگ

ہے پنجاب میں کام بہت اور یہاں آرام بہت
یاں کے امیر اور یاں کے وزیر جان ہے کم اور دام بہت

یاں ہے مسلمانوں کا راج پر لرزاں ہے تخت اور تاج
واں مستقبل تابندہ ہے گرچہ وہ محتاج ہیں آج

مقطع دار اور منصب دار جس کو دیکھو ہے سرشار
یہ بیکاری کا ہے ثمر عیاشی سے ہیں بیمار

لوگ وہاں پیتے ہیں دودھ یاں پہ کھٹا کھاتے ہیں
واں عمریں لمبی ہیں بہت یاں جلدی مر جاتے ہیں

جوشش خوں سے واں بیتاب یاں پہ رگوں میں خوں بھی نہیں
واں پہ تگ و دو ہے دن رات رنگتی یاں پر جوئیں بھی نہیں
وہ تھا وطن اور یہ ہے دکن
وائے وطن اے وائے وطن

— (۵) —

ہائن رش ہائنا جرمن شاعر کی بیوی

بیوی کی کچھ ادائی بھی منظور ہے مجھے

اک دن بھی اس سے مجھ کو گوارہ نہیں فراق
جس زن سے مجھ کو جفت ہے تقدیر نے کیا
منظور ہے مجھے کہ کسی فن میں ہو نہ طاق
میں بے وفائیوں سے بھی آؤں کبھی نہ تنگ
اس کی لڑائیوں سے بھی کم ہو نہ اشتیاق
لیکن جو میرا شعر نہ سمجھے نہ داد دے
از روئے شرعِ شاعری بائن ہوئی طلاق

(۶)

تربیتِ غم

بے کار نہیں ہے درد اور سوز
ہے لطف سے بڑھ کے غم دل افروز
ہر دکھ میں چھپا ہے ایک آنند
در کھلتے ہیں دو جو ایک ہو بند
ہے دہر جب ایک چیز لیتا
ہے اس کے عوض کچھ اور دیتا
ہے یاس سے یاں امید اگتی
اور قفل سے ہے کلید اگتی
ہستی کی کچھ ایسی ہے بناوٹ
ہے جو رستہ فتح ہر رکاوٹ
کیچڑ میں کنول نکل رہے ہیں
مٹی کھا کھا کے پل رہے ہیں
طوفان میں ہیں گہر ابھرتے

ہر چوٹ سے ہیں شرر اُبھرتے
آب تن سود ہے زیاں بھی
آغوش بہار ہے خزاں بھی
گہرائی ہے زندگی میں غم سے
انسان عمیق ہے الم سے

—(۷)—

من کا روپ

اندر من میں سویرا کر لے باہر بھی ہے سویرا
من میں جب ہو جائے اندھیرا باہر بھی ہے اندھیرا
باہر جو کچھ دیکھ رہے ہیں من کی ہیں تصویریں
جو دیکھا ہے تو نے تیرے خواب کی ہیں تعبیریں
جو سنسار میں دیکھنا چاہے وہ ہی دکھائی دیگا
راگ یہاں جو سننا چاہے وہی سنائی دے گا
مایا جگ میں رنگ بدل کر بنتی ہے تیرا روپ
اندر تیرے دھوپ اگر ہے باہر بھی ہے دھوپ
تو میٹھا تو دنیا میٹھی تو کھٹّا تو کھٹّی
من میں گر آنند نہیں تو دنیا ہے اِک بھٹّی

—(۸)—

فریبِ انقلاب

بپا ہے حشر کہ دورانِ اضطراب آیا
وہ سامنے سوا نیزے پہ آفتاب آیا

نہیں ہے خاک کے ذرّوں میں بھی سکون وجمود
کہ ذرّے ذرّے کو پیغام پیچ وتاب آیا

ہے سیلِ وقت کی زد میں کلاہ افسرنگی
بہ ایں خروش بہ ایں جوشش انقلاب آیا

حیات آدمِ خاکی، خموشِ استفہام
حروفِ شعلہ میں لکھا ہوا جواب آیا

نکھر کے نکلے گی اس میں سے رُوحِ آدم کیا
جس آگ کو وہ سمجھتا ہے اک عذاب آیا

ضیائے نو سے ہوئی محفلِ کہن روشن
جہانِ پیر کو پھر نشۂ شباب آیا

نہ امتیازِ نسب ہے نہ افتخارِ حسب
جو آیا بزم میں رندوں کی بے نقاب آیا

مگر فریب نہ ہو، اور ظلم کہنہ اساس
پہن کے عدل کا دلکش رہے جو نقاب آیا

شدید تشنہ لبی کو بجھانے کی خاطر
بجھانے پیاس ہماری (کو خود) سراب آیا

پہن کے حضرتِ ابلیس دلقِ جمہوری
پئے مقابلہ حسنِ انتخاب آیا

اسی بہانے ہوا ہوسبک سروں کو عروج
اُبھر کے سطح پہ ہر ایک جو حباب آیا

---

(۹)

ماضی پرستی

ہر ملت مُردہ ہے یہ کہتی
عہدِ زریں تھا میرا ماضی

ماضی میں تھے سارے لوگ دانا
ہر ایک تھا حکیم اور سیانا

دنیا سے تھے آخرت کے رشتے
آتے تھے زمیں پہ فرشتے

پہلے سے نہیں ہیں لوگ اب نیک
پہلوں سا نہیں ہے اب یہاں ایک

مر کر جو زمیں میں گڑا ہے
زندوں سے سوگنا بڑا ہے

وہ خوبیٔ حال اب نہیں ہے
پہلا سا کمال اب نہیں ہے

کپڑے ہیں جو دہر نے اتارے
وہ ہم نے بدن پہ ہیں سنوارے

مُردہ ہے جو قوم اور منحوس
اس کہنہ لباس میں ہے ملبوس

بوسیدہ رسوم اور روایات
سرمایہ عملِ زندگی کا ہیہات

طاری ہے کچھ ایسی خاکساری
ہیں نقشِ قدم کے سب پجاری

اوہامِ کہن کی ہے اسیری
ہر جا ہے لکیر کی فقیری

جدت ہے بڑا قصور گویا
ہر نو میں ہے کچھ فتور گویا

پیچھے کی طرف مڑی ہے گردن
ماضی میں تھا سارا علم اور فن

تدبیر کرے نہ کچھ خرد مند
دروازے ہیں اجتہاد کے بند

مطرب کا ہے اب یہی ترانہ
پیچھے کی طرف چلے زمانہ

تقلید کی زندگی ہے اک موت
مطلب ہی حیات کا ہوا فوت

یہ حضرت نقش بند کا قول
ہے عارف ہوش مند کا قول

یک گربۂ زندہ اے فسردہ
بہتر ز ہزار شیرِ مُردہ

---

(۱۰)

بڑھے چلو بڑھے چلو

(ترجمہ از لانگ فیلو)

وہ خوفناک ظلمتیں — اور اس پہ برف باریاں
مثالِ برق گرم رو — گزر رہا ہے نوجواں
ہے اس کے ہاتھ میں علم — اور اس علم پہ ہے رقم
بڑھے چلو بڑھے چلو

جبیں پر فکر کی جھلک — ہے دل میں درد کی کسک
چمک ہے اس کی آنکھ میں — کہ اخگروں کی ہے دمک
ہے جبر اپنی جان پر — یہ حرف ہیں زبان پر
بڑھے چلو بڑھے چلو

گھروں میں گرم فرش تھے — انگیٹھیوں میں گرمیاں
محال کیا کہ روک لیں — یہ دل نواز نرمیاں
یہ نوجواں جفا پسند — لبوں پر نعرۂ بلند
بڑھے چلو بڑھے چلو

کہا یہ مردِ پیر نے — کہ پُر خطر طریق ہے
ہے خوف رعد و برق کا — ندی بڑی عمیق ہے
یہ سن کے وہ رواں ہوا — بلند اس نے کی صدا
بڑھے چلو بڑھے چلو

کہا یہ اک حسین نے — کہ اپنی باگ تھام لے
سکون و عیش کے لیے — مرے لبوں کا جام لے
بہ آہ و سردِ چشمِ تر — یہ کہہ کے وہ گیا گزر

بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ رہ اجل کی گھاٹ ہے ڈرایا اِک کسان نے
ہزاروں دفن کر دیے ہیں برف کی چٹان نے
وہ چوٹیوں پہ چڑھ گیا یہ کہہ کے تنگ بڑھ گیا

بڑھے چلو بڑھے چلو

مسافروں کے وہ معین راہبانِ کوہسار
دُعائیں کر رہے تھے جب بہارگاہِ کردگار
انھوں نے یہ صدا سُنی جو دُور سے تھی آ رہی

بڑھے چلو بڑھے چلو

تجھے ہے خبر وہ کون تھا کہاں گیا وہ کب گیا
سگوں نے دیکھا برف میں مسافر ایک دب گیا
تھا سرد ہاتھ میں علم اور اسی (علم) پہ تھا رقم

بڑھے چلو بڑھے چلو

ہے راہ گیر عرش ایک ساکن زمیں ہوا
بہادری کی موت سے وہ اور بھی حسیں ہوا
تھی قدسیوں سے پُر فضا فلک سے آئی یہ ندا

بڑھے چلو بڑھے چلو

—— (۱۴) ——

دُکھیا ماں

(ماخوذ از ولیم)

دیکھا کل رات ایک ایسا خواب
مجھ پہ گویا کھلا ہے خلد کا باب

میرا بچّہ جو دے گیا تھا داغ
اس کا جنّت میں ڈھونڈتی تھی سراغ
دیکھی بچّوں کی اِک قطار کھڑی
نظر افروز موتیوں کی لڑی
ان کے چہروں پر جو تبسّم تھا
گویا خاموش سا ترنّم تھا
ننھّے ہاتھوں میں ایک ایک دیا
رُوحِ معصوم کی تھی جس میں ضیا
دستِ ہر طفل میں چراغ تھا ایک
نورِ پاکیزہ کا ایاغ تھا ایک
انھیں بچّوں میں تھا وہ لختِ جگر
میرے دل کا چراغ نورِ نظر
اس کی صورت تھی کیا اداس اداس
اور چہرے پہ چھا رہی تھی یاس
ہاتھ میں اس کے بجھ گیا تھا دیا
فقط اس کا ہی بے ضیا تھا دیا
شکوہ سنجی میں اس نے منہ کھولا
روٹھی آواز سے وہ یوں بولا
میری امّاں نہ اب کبھی رونا
آنسوؤں سے کبھی نہ منہ دھونا
نہ رُکا تیرے آنسوؤں کا جوش
اِن سے میرا چراغ ہے خاموش

—

(۱۴۳)

شاعر

مہتاب جس طرح ہے تاروں کی انجمن میں
یا بلبلِ نواگر نغمہ سرا چمن میں
اس نے پرو لیے ہیں تارِ نظر میں تارے
شبنم کے جیسے قطرے خورشید کی کرن میں
ہے دیکھتا بہاریں برگِ خزاں میں شعلہ
بیتاب ہیں شرارے پتھر کے بھی بدن میں
فردوس جھومتے ہیں لفظوں کی جنبشوں میں
کوثر کی موج ہے اک گویا زباں دہن میں
جس طرح ہو ہوا سے تارِ رباب لرزاں
یا جیسی بھینی خوشبو پھولوں کے پیرہن میں
لبریز رازِ فطرت، جدت طرازِ فطرت
خاموش تھی ازل سے گویا ہوئی سخن میں
جذبات کی نہ کرتا شاعر جو ترجمانی
گونگوں کی طرح رہتی ہر من کی بات من میں
فطرت ہے حسن کا فن، فن میرا عینِ فطرت
اپنے کو دیکھتا ہوں آئینۂ چمن میں

— (۱۴) —

شبنم

پھولوں پہ پڑی ہوئی ہے کچھ اوس
اپنے لب تر سے ہے یہ چمن بوس
چمکائے فلک نے شب کو تارے
تھوڑے سے زمیں پر اُتارے
ہے گریۂ ساکنانِ افلاک
کیا قابلِ رحم ہے مری خاک
دھویا ہے یہ صبح نے رُخِ گل
یا گل پہ گرے ہیں اشک بلبل
شاید یہ سفیر ہیں عدم کے
مہماں یہاں ہیں کوئی دم کے
کیا نور ہے اس میں کیا صفا ہے
گویا دلِ پاک کی دعا ہے
ہے منتظر نگاہِ خورشید
پیغامِ فنائے لذتِ دید
وابستہ نہیں یہ اس چمن سے
شاید کہ یہ دور ہے چمن سے
بیتاب ہے کس قدر یہ قطرہ
ہے اس کو کشاکشوں سے خطرہ
صاف آئی ہے، صاف اٹھ گئی ہے
پھر اپنے وطن کو مڑ گئی ہے

اُفتاد نے خاک پر اُتارا
پرواز نے پھر اُسے اُبھارا
تھی یادِ وطن سے آنکھ نم ناک
پاکیزہ رہا یہ گوہرِ پاک
پاکیزہ ہے اب اس گہر کی
تعلیم ہے پاکیٔ نظر کی
ممکن ہے یہاں خرام اے دِل
کرنا نہ یہاں قیام اے دِل

---

(۱۵)

صبح

عشق کا یہ شہود ہے اے دل
حسن کی یہ نمود ہے اے دل

شاخیں اٹھتی ہیں اور جھکتی ہیں
یہ قیام و سجود ہے اے دل

ذرّے ذرّے میں انشراحِ صدر
سب میں ذوقِ کشود ہے اے دل

یہ سویرا ہے لہرا مسرت کی
نورِ یزداں کی رود ہے اے دل

زندگی کا حسین ہے پیراہن
رنگ و بو تار و پود ہے اے دل

ہے دل آویز آبشار کا راگ
نغمۂ چنگ و عود ہے اے دل

پتھروں میں بھی زندگی ہے عیاں
سنگ بھی بے جمود ہے اے دل

چشمۂ جود ہے سدا جاری
فیضِ ربِ ودود ہے اے دل

درِ فردوس وا ہے وقتِ سحر
آج جو ذوقِ خلود ہے اے دل

ہے یہ وقتِ صلوٰۃ و ذکرِ حبیب
یہ زمانِ درود ہے اے دل

(۱۶)

سنگ تراش سے

میں سنگِ گراں ہوں، نہ کر پاش پاش
مجھے چھیل کر دیو تا اِک تراش
جو بے کار اجزا ہیں سب کاٹ دے
ہوس کی اُڑا کر کے ایک ایک قاش
پر سے مجھ اُڑا دے غمِ دہر کے
کہ جھڑ جائے فکرِ معاد و معاش
ہے تخلیق سیرت بڑی دِرد خیز
جگر دوز ہے کوششوں کی خراش
اسی سنگ میں میری تصویر ہے
کرو مجھ کو پردہ ہٹا کر تلاش
بکھریں اس میں صنّاع کی شوخیاں
خط و خال میں رُوح کا ارتعاش
مجھی میں چھپے ہیں مرے ممکنات
میرے راز کر میری صورت میں فاش

(۱۷)

خدا اور شاعری

خدا کرتا ہے استعارے میں بات
کبھی شاعرانہ اِشارے میں بات
ہے جس کا ہمیشہ ہی موزوں کلام
جہاں جس کا ہے شاعرانہ نظام

کہیں نظم میں اس کی سکتا نہیں
کہیں کوئی مصرعہ اٹکتا نہیں
اسی سے ہے ساری سخن پروری
تخیّل کی دنیا میں بھی ہے تری
اسی سے ہے شاعر کی دیدہ وری
کہ ہے شاعری جزوِ پیغمبری
وہی بن کے فطرت کی سرگوشیاں
بتاتا ہے شاعر کو رازِ نہاں
ہو بے شعر مذہب تو لذت کہاں
نہ ہو شاعری تو ہے جنت کہاں
یہی ہے خدا کی شرابِ طہور
یہیں پر ہیں فردوس و حور و قصور
جو لذت ہے دل کو تشبیہ میں
نہیں ہے وہ منطق کی توجیہ میں
ہے تشبیہ کثرت میں وحدت کا راز
حقیقت ہے شعر اور کثرت مجاز
حقائق ہیں دنیا میں اِک رنگ سے
انھیں باندھتا ہے وہ سو ڈھنگ سے
بیاں میں نہیں اس کے تکرار کچھ
کہ جدّت ہے مضموں میں ہر بار کچھ

---

(۱۸)

جامۂ زندگی

اشک بہا کے کیوں کہوں جو ہے سو بے ثبات ہے
ذوقِ تغیرات میں
تازگیِ حیات ہے

جامۂ زندگی کا رنگ تازہ بتازہ نو بنو
حسنِ رخِ حیات ہے
عظمتِ کائنات ہے

لحظہ بہ لحظہ شانِ نو ملتی ہے سب کو جانِ نو
نہ یہ فنا کی دستبرد
نہ یہ اجل کی گھات ہے

شمس و قمر ہیں جامہ زیب اختر چرخ دلفریب
گاہ گہہ جمال ہے
جلوہ گہہ صفات ہے

نقطۂ تیز سیر ہے بن گئے دائرے یہاں
لاکھ طرح ہوئی بیاں
اصل میں ایک بات ہے

ہو گئی کیا نظر فروز کثرتِ غم کی ظلمتیں
اتنی ہے تابشِ نجوم
جتنی اندھیری رات ہے

شغل ہے میرا صنم گری اور کبھی حرم گری
دل یہ کبھی تو کعبہ ہے
اور کبھی سومنات ہے

—— (۱۹) ——

بد دُعا

منظرِ دہر پر جس وقت تو آنکھیں کھولے
دامنِ عشق میں سب چرخ کے موتی رولے
پرورشِ دہر میں ہر نازو نعم میں تیری
ایک ساعت نہ بسر ہو کبھی غم میں تیری
تجھ کو فردوس ملے غم کدۂ ہستی میں
ڈگمگا کر نہ قدم جائے ترا پستی میں
راہ ایمن ہو تری ہر خطر و بیم سے دُور
تو ہے کشمکشِ دہر کی تعلیم سے دُور
ہے محفوظ سدا سوز و گداز دل سے
سرِ طرب ہی کے نکلتے رہیں سازِ دل سے
نہ ہو معلوم تجھے دردِ جگر ہے کیا چیز
نالۂ نیم شبی، آہِ سحر ہے کیا چیز
کسی مقصد میں تگ و دو کی ضرورت نہ پڑے
ورزشِ نفس و بدن کی کوئی صورت نہ پڑے
طلبِ علم کے اور کسبِ ہنر کے دھندے
نہ پڑیں تیرے گلے میں کبھی ایسے پھندے
رعب حاصل ہو جہاں میں تجھے سرمائے سے
دُور ہو نکبتِ افلاس ترے سائے سے
بادِ خواہش ہی سے اُمید کے غنچے کھل جائیں
تجھ کو آسانی سے من مانی مرادیں مل جائیں

دست بستہ تیری خدمت میں اِنساں کھڑے
جس طرح بُت ہوں صنم خانے میں بے جاں کھڑے

پتلیوں کی طرح خلقت تیرے تاروں پہ چلے
اور سدا گردشِ ایام اشاروں پہ چلے

تجھ کو جس چیز کی خواہش ہو میسر ہو جائے
تیرے ہاتھوں میں خزف پارہ بھی گوہر ہو جائے

دین و دنیا میں تجھے فکر کی کاوش نہ رہے
اور بِن پورے ہوئے کوئی بھی خواہش نہ رہے

سارے محتاج کریں روز خوشامد تیری
اور انھیں قبلۂ اُمید ہو مسند تیری

شعرا لکھ کر قصیدے تیری تعریف کریں
اور عالم تیری توصیف میں تصنیف کریں

خوفِ نقصاں سے کبھی سچ نہ سُنائیں تجھ کو
اور کبھی تیری حقیقت نہ بتائیں تجھ کو

—— (۱۹) ——

یکجا ہوا سب تری نظر میں

کیا حُسن ہے اختر سحر میں
کیا رنگ ہیں پھول اور ثمر میں

دل کا ہو کا لعل بن گیا ہے
ہے بحر کی آبرو گہر میں

نغمے بلبل کے شاخِ گل پر
جلوہ شبنم کا برگِ تر میں

جو راز کہ دہر نے چھپایا
ہے جس کی خلش دل و جگر میں

ہے ساز کی دلگداز آواز
آہنگ ہے کیا دلِ بشر میں

تارے کرتے ہیں جو اشارے
چشمک ہے جو برق اور شرر میں

یہ حسن یہ راز اور یہ نغمہ
یکجا ہوا سب تری نظر میں

(۲۱)

عہدِ نو

انسان کی بدل رہی ہے تقدیر — ہر جبر کی ٹوٹتی ہے زنجیر

تابندہ جو اس قدر افق ہے — ظالم کے لہو کی یہ شفق ہے

ہے ضربِ کلیم ساحری کش — اعجاز ہوا ہے ساحری کش

زنداں کے تمام در کھلے ہیں — پنچھی اڑتے ہیں پر کھلے ہیں

پیکار یہ عدل اور ستم کی — تمہید ہے اک نئے جنم کی

صیاد کے اب نہیں ہیں بس میں — طائر نہ رہیں گے اب قفس میں

لیلائیں ہیں بے نقاب آزاد — مہتاب اور آفتاب آزاد

شاہی نہ کوئی بھی شہ رہے گا — ہر تخت کا بن گیا ہے تختہ

اب کون ڈرے گا ناکسوں سے — شاہیں نہ ڈرے گا کرگسوں سے

آ پہنچا ہے سخت جان کا راج — مزدور اور کسان کا راج

پہلے کے کہاں حدود باقی
ان کا نہیں اب وجود باقی

—— (۲۲) ——

ساقی نامہ

پلا ساقیا آج ایسی شراب
کہ ساغر میں جس کے ہو مہ آفتاب

جو رخسارِ گل پر بنی موجِ رنگ
جو بلبل کی منقار میں ہے ترنگ

چمن میں صبا بن کے چلتی ہے جو
سحر کی طرح سے نکلتی ہے جو

وہ مے جو برستی ہے وقتِ سحر
ہر اک سبزہ پہ اور ہر اک پھول پر

وہ مے جس سے روشن ہیں چودہ طبق
ستاروں کے خوشوں کا ہے جو عرق

وہ مے جس میں ہر ایک گل کا ہے رس
جو خم میں رہی ہو ہزاروں برس

وہ مے جس میں پیمانہ کے ماہ رخ کے اشک
وہ مے جس پہ کوثر کو آتا ہے رشک

کبھی چھپ کے رہتی ہے انگور میں
تجلی کبھی شعلۂ طور میں

ازل سے ہے روحوں کا جس میں نچوڑ
شکستہ دلوں کو جو دیتی ہے جوڑ

ہے جس مے سے قائم جہاں کا شباب
زمیں کا شباب آسماں کا شباب

حیا ہے کبھی حسنِ مستور میں
تو شوخی کبھی دیدۂ حور میں

وہ مے جس سے میخانہ ہے آبِ گل
دھڑکتا ہے جس مے سے فطرت کا دل

وہی مے جو خونِ رگِ دہر ہے
ازل سے نکلتی ہوئی نہر ہے

رگوں میں پھراتے ہیں جس کو شجر
جسے پی کے پھٹتے ہیں برگ و ثمر

ہے پیدا کشش جس میں صورت پذیر
تھنوں سے بہاتی ہے جو جوئے شیر

وہ مے جو ہے غم سے گزرنے کا پل
وہی مے جو جز کو بناتی ہے کل

جو مایوس دل سے ہٹاتی ہے یاس
بجھاتی ہے لب تشنہ روحوں کی پیاس

نہیں جس میں رہتا غمِ بیش و کم
طرب کو ہے کرتی ہم آغوشِ غم

وہ مستی کا چشمہ وہ نادر شراب
کہ ذروں میں ہے جس کی جگمگ ماہتاب

وہ مے جو گدا کو شہنشہ کرے
خودی کھو کے مجھ کو خود آگہ کرے

کہ ہو جائے جب روح سرشارِ مست — کرائے اسے یاد عہدِ الست
مٹا دے دلوں سے جو بغض و حسد — نہ باقی رہے کچھ من و تو کی حد
جو دوڑے رگوں میں یہ سیال آگ — سمجھنے لگوں میں پرندوں کا راگ
ہے بلبل کی کیا گل سے گفت و شنید — یہ شاہد ہے کیوں اور کیوں وہ شہید
سمندر کی لہروں میں بہتا پھروں — جو فطرت چھپائے وہ کہتا پھروں
ستاروں میں جگنوں چمن میں گلوں — زمانے کے جھگڑے ہوں تن سے ٹلوں
زمیں پہ مہک اور فلک پر چمک — یہاں موجِ گل اور وہاں پر دھنک

سمجھ آجائے اس مے کے پینے کا ڈھنگ
سمجھ جاؤں مر کر بھی جینے کا ڈھنگ

(۲۴)

زندگی

شمس میں نور قمر میں تو سحاب میں تو شجر میں نمو
مظہرِ جلوہ نما میں تو نور میں تو نطفے میں نمو

تیرا نہاں عیاں ہوا تیرا عیاں نہاں رہا
طالبِ ہر ذرہ کوشش ہے ڈھونڈتا یہ کہاں رہا

جس میں تیرا ساز ہے، عشق میں تیرا سوز ہے
اس میں ہے دلگداز تو، اس میں تفکر فروز ہے

ہاں پہ ہر ایک ذرہ طور کھولے ہوئے ہے چشمِ نور
چار طرف ہے روبرو ڈھونڈ نہ اس کو دور دور

عقل میں تیری سردیاں، عشق میں تیری گرمیاں
خار میں تیری تیزیاں، گل میں ہیں تیری نرمیاں

حورِ بہشت کی طرح تیرا شباب سرمدی
تیری رگوں میں ہے رواں بادۂ ناب سرمدی

ذوق ہے کیا نمود کا، شوق ہے کیا شہود کا
جلوۂ نو بہ نو ہے فن کارگر وجود کا

آتش و آب زندگی خاک اور باد زندگی
دیدۂ دل سے دیکھ، ہیں نخل و جماد زندگی

موت کا خوف ہر جگہ یہ بھی ترا فریب ہے
تیری سرشت ہے بقا اور فنا غریب ہے

تیری نمود بھی ہے بود، تیرا فریب بھی ہے جُل
تیری خزاں بھی ہے بہار، تیرا فراق بھی ہے وصل

گوہر جان ہے بے بہا، اس کا صدف کوئی نہیں
لعل حیات ہر طرف، ان میں خزف کوئی نہیں

کہتے ہیں جس کو وقت ہے، زاویۂ نظر ترا
میرا احاطۂ مکاں نقش ترا اثر ترا

آب تری ثواب سے، جلوۂ ترا گناہ سے
گریۂ چشم رازداں ہے تیری گرد راہ سے

تیری روش میں اے حیات کیا یہ تضاد ذوق ہے
شیشہ گری کی ہے دکاں، سنگ زنی کا شوق ہے

رکن ہیں تیرے دین کے بت شکنی صنم گری
سنگ پرست ہے خلیل، بہر بتاں آذری

تیرا ظہور جنگ جو، تیرا بطون صلح خو
چہرہ ترا ہے خوب رو، تیری نقاب دیو رو

رات میں تو سگوں پرست، صبح میں تو جنوں پرست
ورزش ارتقائے جاں جلوہ گر بلند و پست

عنصر لازم حیات صلح بھی ہے ستیز بھی

خندۂ گل کے ساتھ ہے شبنم اشک ریز بھی
مرکزِ جانِ مضطرب ذرۂ آفتاب کوش

جسم میں ہے جہاں سے کم جان میں ہے جہاں سے بیش
وحدتِ زندگی ہے اصل، کثرتِ جلوہ سرسری

تیرا عدو کوئی نہیں، وہ ہے جنگِ زرگری
گوہرِ فرد فرد یہاں وحدتِ حق میں سفتہ ہے

سبحہ دانہ دانہ میں رشتۂ جاں نہفتہ ہے
تیری یگانگی عیاں کثرتِ صد مجاز سے

آنکھ دوئی کی کور ہے سرمۂ امتیاز سے
تیری ہے ابتدا کہیں اور نہ ہی انتہا کہیں

سجدہ کہیں تو ثبت کہیں، بندہ کہیں خدا کہیں
بن کے جمالِ دلنواز ہم سے ہے طالبِ نیاز

رسمِ پرستش و نیاز یہ بھی ہے تیرا ایک ساز
کر نہ فغاں کہ ہیں یہاں حسن و شباب بے ثبات

تازہ بتازہ طرز ہے جدّتِ جامۂ حیات
تخم ہے خاک گیر سعی اگر نخل بلند کوش ہے

برگ و ثمر میں پھر وہی ذوقِ نمو کا جوش ہے
موت ہے زندگی، اگر حسرت و آرزو نہ ہو

لطفِ حصول کیا اگر کاوشِ جستجو نہ ہو
رونقِ آبرو تری خونِ دلِ شہید سے

پرورشِ حسین ہے کافرِ یزید سے
تو نہ سمجھ کہ ہے یہاں تجھ کو بقا قیام سے

رونقِ میکدہ ہے سب گردشِ دورِ جام سے

زندگی دوامِ عیش عشرتِ سوز و ساز کا
جاوداں ہو منتظرِ محشرِ جاں گداز کا

کشمکشِ حیات میں تجھ کو ہے سکوں کہاں
تو ہے چلیپا کی طرح ساحلِ بحر سے رواں

ٹھہر گئی ہے اک جگہ آنکھ جو دید میں نہیں
جلوۂ جاں ہے ہر طرف منزلِ جادہ میں نہیں

آتشِ جاں میں جل گیا خس مرے ہر جوست کا
فکر و خیال کا ہر نظام نامزدِ شکست و ریخت کا

تیرا غزالہ ہے سحاب تشنہ ہے صبح و شام میں
چشمۂ بادۂ الست پھوٹ رہا ہے جام میں

جامِ فلک میں مانگیے حق تو ہے یاں بقدرِ ظرف
ارض و سما میں ہر طرف فیضِ قدیم کا ہے صرف

چشمِ بصیر گر تری ذوق سے کامیاب ہے
قطرے میں بحرِ موجزن ذرّے میں آفتاب ہے

اہلِ نظر کی اک نظر روکشِ جبرئیل ہے
صاحبِ دل کو زندگی کوثر و سلسبیل ہے

کرتا ہوں سیرِ زندگی ذوق کی اک نظر سے میں
گلشنِ کون کی فضا سے پھول دامنِ دل میں بھر لیے

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

(۲۴)

نوحہ آزادی

پھونک گئی سینے میں ترے روحِ الٰہی — اے حق کے سپاہی
فطرت نے عطا کی تجھے کونین کی شاہی — از ماہ بماہی
اس پر بھی پسند آئی تجھے کیسی غلامی
اے مردِ گرامی

زنجیر و سلاسل ہے تجھے تیری ہی تدبیر — کیا ہے تری تقصیر
کیوں دشمنِ حوادث ہوا اے بندۂ تقدیر — خود ہو گیا تسخیر
تو جس کو ملی قوتِ تسخیرِ جہاں کی
تعمیرِ جہاں کی

دنیا بھی ہے زنجیر تو عقبیٰ بھی ہے زنجیر — کھوئی گئی تقدیر
ظلمت کدۂ دہر میں باقی نہیں تنویر — بگڑی تیری تصویر
تو حق نے جسے اپنی ہی صورت پہ بنایا
فریاد خدایا

ہیں عرصۂ ہستی میں تو سنگ و شجر آزاد — برق و شرر آزاد
گلشن کی فضاؤں میں ہے مرغِ سحر آزاد — رکھتا ہے پر آزاد
پھر اشرفِ مخلوق ہی کیوں رشتہ بپا ہے
کس شے کی سزا ہے

یہ جاہ کا طالب کہیں بندہ ہے شکم کا — یا دام و درم کا
پھندا کہیں گردن میں پڑا دیر و حرم کا — وہموں کے ستم کا
زیور ہے سمجھتا اسے پہناؤ جو زنجیر
یہ وہم کا نخچیر

ہے لرزہ براندام سدا خوف و خطر سے — ہر چیز کے ڈر سے

جو چاہے خریدے اسے اب لعل و گہر سے یا رُعب نظر سے
ہر طرح کے انسان ہیں بکتے سر بازار
شیطان ہے خریدار

انسان بنے کس لیے انسان کا بھکاری یا اس کا شکاری
یہ رسم ستم دہر میں کب تک رہے جاری اے خالق باری
انسان کرے کس لیے انسان کی تذلیل
کیوں قصۂ ہابیل

مسجود ملائک کی ہے تقدیر المناک گردوں میں ہے بیباک
افسوس ہوا گوہر تابندہ تہ خاک یہ نیّر افلاک
جو عرش کا تارا تھا وہ ظلمت کا دیا ہے
کیا ہم نے کیا ہے

——(۲۵)——

غالب

رشک تیز شرر آتش پنہاں تیرا
اور خورشید قیامت گل داماں تیرا

تار قانون جہاں رشتۂ جان معنی
ہو نہیں سکتا ہے شیرازہ پریشاں تیرا
تیرے انداز میں تفسیر رموز ہستی
نغمۂ نور ازل مطلع دیواں تیرا
عرق سعی تفکر کے ہیں قطرے اختر
خاک افشاندہ غبار سر داماں تیرا
دیکھنا ابر گہر بار میں بجلی چمکی
کہ سر چرخ تصور ہے خراماں تیرا

دیدۂ مہر میں تو شوخیِ نظارا تھا
دل کے نیرنگ کدہ میں رہا جولاں تیرا

نوکِ خامہ ہے تیری زخمۂ سازِ عرفاں
کہ نوا ریز ہے ہر صفحۂ دیواں تیرا

ہے عجب طرح کی معنی میں تگ و دو تیری
نقشِ پا ہے صفتِ موجِ خراماں تیرا

تیری ہی ذات سے قائم ہے زمینِ سخن
یعنی محور ہے بنا تارِ رگِ جاں تیرا

نظم اردو کی نہ تھی ذرۂ خورشید آشام
تنگ ساغر میں سماتا نہ تھا طوفاں تیرا

شعرِ پابند کو پرواز سکھائی تو نے
فکرِ انساں پہ باقی ہے یہ احساں تیرا

ہم کو بخشا ہے تہیِ کانِ ہنر نے کیا کیا
لعلِ معنی ہوا خونِ سرِ مژگاں تیرا

رگِ ہستی میں رواں ہے جو عیاں تھا تجھ پر
آئینہ دارِ ازل دیدۂ حیراں تیرا

سینہ گو چاک رہا تیرا بھی مانندِ سحر
داغِ دل تھا صفتِ مہرِ درخشاں تیرا

طبعِ عالی میں تھا کہسار کا تمکین و وقار
وضعِ خودداریٔ تھی سرمایہ و ساماں تیرا

پوششِ لفظ میں ہے نالۂ عریاں کی جھلک
تیرے ہر حرف میں خوابیدہ نیستاں تیرا

سرحدِ عرش سے ہے دور مکانِ معنی
اس جہاں سے کہیں بالا ہے جہانِ معنی

شبِ تاریک میں تو صورتِ مہتاب رہا
پیکرِ قوم میں اک دیدۂ بے خواب رہا
جوششِ دل کے تلاطم نے بنائیں آنکھیں
یعنی طوفانِ تخیّل میں تو گرداب رہا
تیری بیتابی تجھے باعثِ نظّارہ بنی
پسِ آئینۂ دل صورتِ سیماب رہا
تجھ کو اک نغمہ تھی آوازِ شکستِ قیمت
شیشۂ عشرت میں مانندِ مئے ناب رہا
جستجو تھی تجھے جس بحر کی وہ اندر ہی تھا
عینِ قلزم میں بھی تو ماہیِ بے آب رہا
جیسے پانی کے تموّج میں ہو سورج کی کرن
تو صفا کیشی میں یوں وقفِ تب و تاب رہا
تھی تری روح کو آزادیِ پروازِ فلک
پاؤں میں سلسلۂ عالمِ اسباب رہا
خود گدازی سے تیری رونقِ بزم ہوئی
صورتِ شمع بساطِ دلِ احباب رہا
شعرا قلزمِ ذخّار سمجھتے تھے جسے
تیری ہمت نے جو دیکھا تو وہ پایاب رہا
تھی جسے سمجھے ہوئے چشمِ غلط بیں خورشید
تیرے آگے صفتِ کرمکِ شب تاب رہا
سطح پر جو رہے خاشاک کی صورت ان کو
معنیٔ نغز تیرا گوہرِ نایاب رہا
"تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام"

اپنے ہر دعوے میں تو صاحب فرتاب رہا
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
سازِ حق کو ترا دِل صورتِ مضراب رہا
کور دل دن کو ہیں یاں رات سمجھنے والے
اور بہت کم ہیں تیری بات سمجھنے والے

پیشِ انساں رہا تا دیر جو منزل ہو کر
تھا فقط سنگِ نشاں تیرے مقابل ہو کر
چشمِ مضطر نے تیری خاک پہ ڈالی جو نگاہ
تپش آمادہ ہوا ذرہ بھی اک دل ہو کر
تیری ہر سطر تڑپتی تھی مرے سینے میں
موجِ بیتابیٔ برقِ دلِ بسمل ہو کر
جیسے ہو گوہرِ تابندہ صدف میں پنہاں
ویسے تو حرف میں پوشیدہ رہا دل ہو کر
شررِ سنگ رہی لیلیٔ معنی کی جھلک
طبع خود دار رہی پردۂ محمل ہو کر
مخزنِ نور تھا تو وہ کہ شعاعوں سے سحر
ہر نے ہاتھ بڑھایا ترا سائل ہو کر
سب نے محسوس کیا ایک نئے رنگ سے تجھے
تیرا جلوہ ہوا بوئے گلِ محفل ہو کر
مژۂ دیدۂ دِل تیری رہی دنیا میں
صورتِ نوکِ سنانِ رگِ باطل ہو کر
اب فلک گرچہ سرِ شانِ بہشتی میں رہا

اپنی دنیا بھی رہے گی تری قائل ہو کر
میں کہاں اور مرے فکر میں پرواز کہاں
شعر سیکھا ترے انداز پہ مائل ہو کر
مدح کے پھولوں کا گلدستہ بنایا میں نے
ترے گلزار کے گلچینوں میں شامل ہو کر
تا ابد ملکِ معانی ہے ترے زیرِ نگیں
تیری خدمت میں یہ حاضر ہے خراجِ تحسین

(۲۶)

علامہ اقبال

سینہ تھا ترا مشرق و مغرب کا خزینہ
دل تھا ترا اسرار و معارف کا دفینہ
ہر شعر ترا بامِ ترقی کا ہے زینہ
مانند مہ نو تھا فلک سیر سفینہ
اس ساز کے پردے میں تھی عرفان کی آواز
کیا عرش سے ٹکراتی ہے انسان کی آواز

سچ تلخ تھا لیکن اسے شیریں کیا تو نے
تلخابۂ غم کو شکر آگیں کیا تو نے
تعلیم خودی دے کے خدا بیں کیا تو نے
کنجشک فرومایا کو شاہیں کیا تو نے
پر ٹوٹے تھے جن کے انھیں پرواز عطا کی
گونگے تھے جو انساں انھیں آواز عطا کی

دل تیرا مے عشق سے لبریز تھا ساقی
اور درد کی لذت سے طرب خیز تھا ساقی
قطرہ تری مے کا شرر انگیز تھا ساقی
ساغر ترا گل بیز و گہر ریز تھا ساقی
تف مے پہ جو سنبھلے ہوئے انساں کو گرا دے
وہ مے تھی ترے خم میں جو گرتوں کو سنبھالے

وہ عشق جو انسان کی ہمت کو اچھالے
وہ عشق جو دنیا میں بگڑتے کو سنوارے
جس عشق سے اغیار بھی بن جاتے ہیں پیارے
جس عشق کے اشکوں سے فلک پر بنے تارے

وہ عشق تھا تیرے دلِ سوزاں میں لگے دبے ہیں

جس طرح شرر سنگ میں ہے اور نغمہ ہے نے میں

منزل ہی نہیں جس کی کہیں پر وہ ترا شوق — سیارۂ گردوں کو نہ ہے تحت نہ ہے فوق

آزادیِ انساں کا ترے دل میں تھا کیا ذوق — زنجیرِ علائق نہ توہم کا کوئی طوق

وہ بحرِ تفکر کہ نہیں جس کا کنارا

سیلاب نہیں ڈھونڈتا ساحل کا سہارا

حکمت سے بھی دی شعر کی صہبا میں ڈبو کر — حق پیش کیا سوزِ نہانی میں سمو کر

جس نخل کا نہ سایہ میں کیا بیج تو بو کر — اک روز رہے گا وہ فلک بوس ہی ہو کر

وہ عشق کہ اس نخل کی رگ رگ میں رچ گیا

ہر سمت دنیا میں وہ پھیلے گا، پھیلے گا پھیلے گا

سمجھایا ہمیں کیا ہے بڑی چیز غلامی — ہے جس سے زوال ہو کوئی کتنا ہی گرامی

محکوم ہے تو، تو تیری فطرت کی ہے خامی — آزادیِ افکار سے انساں ہے گرامی

آزاد ہی دنیا میں ہے اللہ کا شہکار

ہر بندۂ آزاد ہے تقدیر کا معمار

بندے سے غلامی کہ نشے میں بھی مدہوش — تجھے سر پہ نہ کچھ فخر سے اغیار کی پاپوش

حیوانوں کا مقصد تھا فقط خواب و خور و نوش — بے عزت و بے غیرت و بے ہمت و بے جوش

رسوائی میں جو مست تھے ہشیار ہوتے ہیں

صدیوں سے جو سوتے تھے وہ بیدار ہوئے ہیں

فرعون جو غلط تھا تہ و بالا کیا تو نے — دنیا کے اندھیرے میں اجالا کیا تو نے

اس قوم میں کیا کام نرالا کیا تو نے — منہ جھوٹ کا اور مکر کا کالا کیا تو نے

تہذیب و سیاست کی طلسمات کو توڑا

تنہائی سے ہر جھوٹی کرامات کو توڑا

اقبال! ترا پیغام بر عشق و عمل ہے — انساں کی ترقی کا یہ قانون اٹل ہے

یہ نغمۂ جاوید ہے یہ سازِ ازل ہے ہاں زیست کی ہر مشکل کا فقط ایک ہی حل ہے

جاں صرفِ عمل اور ہو دل عشق سے لبریز

اٹھتا ہے یونہی جادۂ ہستی میں قدم تیز

عاقل تھا مگر عقل کے بیباک سے آزاد اور حکمتِ افرنگ کے فتراک سے آزاد

دنیا میں تھا دنیا کے غم و باک سے آزاد خاکی تو وہ بے شک تھا مگر خاک سے آزاد

ہے دل کی جگہ دور کہیں ارض و سما سے

ہوتا ہے جہاں بندہ ہم آغوش خدا سے

ہادی ہے وہ انساں کہ جو آگے کو بڑھا دے تاریکی میں انسان کے ہاتھوں میں دیا دے

جو عقل پہ پردے ہیں پڑے ان کو اٹھا دے صیقل کرے آئینۂ دل اس کو جلا دے

ہر قلب کو نعمت یہ حقیقی نظر آئے

اور آنکھ کو تصویرِ حقیقی نظر آئے

اقوام ہوں جس بانگ سے بیدار وہ پیغام انساں ہوں مئے عشق سے سرشار وہ پیغام

ہو بارِ امانت سے گرانبار وہ پیغام ہر روح حقیقت سے ہو دوچار وہ پیغام

وہ جوش کہ انسان ابھر جاتے ہیں جس سے

کھوٹے میں کھرے یوں کہ نکھر جاتے ہیں جس سے

کہتے ہیں سخنور کہ تھا شاہِ سخن اقبال ظاہر میں فقط شعر میں تھا اہلِ فن اقبال

ہے اصل حقیقت یہ کہ تھا بت شکن اقبال مولا کو وطن کرتا تھا بے وطن اقبال

اس جسم میں تھا روح کی معراج کا طالب

انساں کے لیے دل کے سوراج کا طالب

عارف کی نظر اپنے وطن تک نہیں محدود کیوں اس کی نظر ہو در و دیوار میں مسدود

گو حبِ وطن اس میں بھی تھی اک جذبۂ محمود اقبال نے دھرتی کو بنایا نہیں معبود

خاکی جو نہیں کرتا ہے افلاک کی پوجا

کس طرح سے کرسکتا ہے وہ خاک کی پوجا

عارف کی نظر گاہ ذری اس کا وطن ہے — پورب ہے نہ پچھم ہے نہ اُتر نہ دکھن ہے
ملت کوئی اس میں ہے نہ بدعت ہے نہ بن ہے — نے دیر و حرم کی کوئی تعمیر کہیں ہے

نے شرق کا گرویدہ نہ افرنگ کا عاشق
کس طرح سے ہو وہ چمن و رنگ کا عاشق

کم کوئی ہے اس طرح کا دہر میں آیا — جس نے وطن اپنا دلِ انسان میں بنایا
انسان کی توقیر کا وہ راگ ہے گایا — موسیقیِ جاں بن کے جو جانوں میں سمایا

یہ راگ ہے وہ کون و مکاں ساز ہے جس کا
روحوں میں نہاں اور عیاں راز ہے جس کا

تھا شیخ سے بیزار برہمن سے بھی بیزار — نہ اس کا پرستار تھا نے اس کا گرفتار
دولت کا شکار اور نہ سیاست کا گنہگار — افکار سے مستقبلِ اقوام کا معمار

جن ابلہ فریبوں میں ہے ملت کا اجارہ
تعلیم سے تیری ہے بہت ان کو خسارہ

ہر شعر سے اٹھتا ہے صدا نعرۂ تکبیر — خوں تیری سیاہی ہے قلم تیری ہے شمشیر
اشعار ترے کاتبِ تقدیر کی تحریر — آئینہ بکف جس میں ہے اقوام کی تقدیر

مضراب ترے شعر ہیں انساں کا دل ساز
فطرت ترے نغموں پہ ہے ہمہ گوش بر آواز

یہ شعر ہیں کہتے ہیں جسے جزوِ نبوت — یہ شعر ہیں شاگردیِ رحمان کی آیت
یہ شعر بدل دیتا ہے انسان کی حالت — اس شعر میں ہے عالمِ لاہوت کی دولت

یہ شعر حقیقت میں ہے ورودِ الہام
نعمت ہے بہت خاص مگر فیض بہت عام

جس کا ہو کلام ایسا کلیم اس کو ہیں کہتے — حکمت سے ہو لبریز حکیم اس کو ہیں کہتے
افکار کی جنت ہے نعیم اس کو ہیں کہتے — اے صاحبِ دل! طبعِ سلیم اس کو ہیں کہتے

انسان ہے اللہ کا معشوق اسی سے

خاکی پہ ہوا اشرفِ مخلوق اسی سے

اقبال کے ہیں شعر سخنداں کی زباں پر
اقبال کے اقوال ہوئے نقش ہیں جہاں پر

اقبال کے ہیں تیر سیاست کی کماں پر
تیغوں کو جلا دیتے ہیں اس سنگِ فساں پر

اقبال نے رنگ اپنا ادیبوں پہ چڑھایا
رنگ اپنی خطابت کا خطیبوں پہ چڑھایا

اب دل میں ہے ہر ایک کے پیدا وہی انداز
اب قوم کی آواز بنی ہے تیری آواز

الفاظ میں تیرے ہے کوئی سحر کا اعجاز
بجتا ہے ہر اک رنگ کی محفل میں ترا ساز

اشعار ترے پیر و جواں سب کو ہیں ازبر
محفل کی ہے رونق تو کہیں گرمیٔ منبر

تھے صاحبِ دل رومی و عطار و سنائی
تھی جن کی خودی آئینۂ رازِ خدائی

لے عالمِ ارواح کی انساں کو سنائی
کچھ لذتِ وصل اس میں ہے کچھ دردِ جدائی

ایسے ہی فقیروں کا ہم آہنگ تھا اقبال
مردانِ خدا دوست کا ہم رنگ تھا اقبال

انساں کا کیا قحط ہے اس دیرِ کہن میں
اک مردِ حق آتا ہے کہیں ایک قرن میں

سمجھائے انہیں کون جو یاں مست ہیں دھن میں
دولت جو حقیقی ہے وہ انساں کے ہے من میں

اس دولتِ سرمد کا شہنشاہ تھا اقبال
فطرت کی گواہی ہے حق آگاہ تھا اقبال

کام ایسا جو کرتا ہے وہ مرتا نہیں ہرگز
ایسے جو جیے موت سے ڈرتا نہیں ہرگز

دنیا سے گیا، دل سے گزرتا نہیں ہرگز
اس صفحے سے یہ نقش اترتا نہیں ہرگز

جب تک دل افروز یہ پیغام ہے باقی
عالم کے جریدے پہ ترا نام ہے باقی

—— (۲۷) ——

عشق

جذبۂ عشق، چشمۂ تخلیق ‌ رُوحِ خالق کی طرح ہے یہ عمیق
مصدرِ دہر باعثِ تکوین ‌ اس کو تکوین ہی سے ہے تسکین
تھا عدم ہیچ اور بے مایہ ‌ پڑ گیا اس پہ عشق کا سایہ
عشق نے بن کے اپنا تار و پود ‌ کی عطا نیست کو قبائے وجود
اس سے شمس و قمر ہوئے پیدا ‌ اس سے جن و بشر ہوئے پیدا
حسن بھی اس کی آفرینش ہے ‌ یہ ہی دانش ہے یہ ہی بینش ہے
بحر کے موتی، چرخ کے اختر ‌ ثمرِ عشق کے ہیں سب یہ ثمر
عشق علم و ہنر کا مصدر ہے ‌ عشق تیغِ خودی کا جوہر ہے
عشق ہے سحر، عشق ہے اعجاز ‌ عشق مضراب اور جہاں ہے ساز
عشق سے آفتاب میں ضو ہے ‌ عشق سے دہر میں تگ و دو ہے
حسنِ تعمیر و نغمہ و تصویر ‌ ہے اسی آفتاب کی تنویر
اس سے رنگیں ہوئے مظاہر بھی ‌ یہ مصور ہے اور شاعر بھی
رنگ و بو میں ظہور کرتا ہے ‌ ذرے ذرے کو طور کرتا ہے
جس کو کہتے ہیں گردشِ ایام ‌ وہ بھی ہے عشق ہی کا دورِ جام
جس نے کوئی عظیم کام کیا ‌ عشق ہی نے اسے تمام کیا
عشق ہی ہے ہر ایک دیں کی اصل ‌ آسمانوں کی اور زمیں کی اصل
جب کبھی جوش میں یہ آتا ہے ‌ اپنی تقدیر خود بناتا ہے
جب کبھی انقلاب کرتا ہے ‌ خونِ دل کو شراب کرتا ہے
عشق کا جس میں کچھ نہیں ہیجان ‌ چلتا پھرتا ہے گر ہے بے جان

جذبۂ عشق دل میں پیدا کر
روز دنیا نئی ہویدا کر

—— (۲۸) ——

دیدہ ور

وُہی دیدہ ور اور اہلِ نظر ہے
جو پتھر کے اندر شرر دیکھتا ہے

ملے ہیں جو مٹی میں ناچیز دانے
وہ ان میں شجر اور ثمر دیکھتا ہے

جمادات کو تو سمجھتا ہے ساکن
وہ ذروں میں بجلی کے پَر دیکھتا ہے

تو پھولوں میں بس رنگ و بو کا ہے طالب
وہ کلیوں کا زخمِ جگر دیکھتا ہے

اشارے سمجھتا ہے ہر برگِ گُل کے
رموز آشنا کچھ اِدھر دیکھتا ہے

نگاہوں کی جس تک نہیں ہے رسائی
وہ ہر شے میں اُس کا اثر دیکھتا ہے

تجھے چشمِ بے نم سے رکھنا نہیں ہے
وہ جو حسن با چشمِ تر دیکھتا ہے

سمجھتا ہے تو جس کو شبنم کا قطرہ
وہ اُس میں ضیائے گہر دیکھتا ہے

ہُنر میں بھی کرتا ہے تو عیب چینی
وہ عیبوں کے اندر ہُنر دیکھتا ہے

——

(۲۹)

زندہ شہید

نگاہوں میں ہے کوئی مقصد بلند — ہے سینے کے اندر دلِ دردمند
نہیں اس کو پرواہ آرام کی — نہ خواہش کوئی شہرت و نام کی
وہ اپنے مقاصد سے پھرتا نہیں — زمانہ گرائے تو گرتا نہیں
سمجھتا ہے دنیا کو میدانِ جنگ — فرار اس سے ہے موجبِ عار و ننگ
کبھی ڈگمگائیں نہ اس کے قدم — نہ شوقِ ستائش نہ پروائے ذم
اگر وہ جہاں کی بھلائی کرے — جہاں اس کے حق میں برائی کرے
اصول اپنا پھر بھی بدلتا نہیں — بدل جائے دنیا وہ ٹلتا نہیں
اگر تختۂ مشقِ آلام ہے — سمجھتا ہے نیکی خود انعام ہے
نہ شکوہ ہے لب پر نہ فریاد ہے — وہ زنداں میں بھی ہے تو آزاد ہے
نہیں توڑتی اس کی ہمت شکست — نہ نقصاں سے ہو حوصلہ اس کا پست
ہوس اور طمع جس پہ غالب نہیں — عمل سے ثمر کا وہ طالب نہیں
ہے کام اس کا ذاتی غرض سے بری — طبیعت خودی کے مرض سے بری
لگاتا ہے دنیا میں ایسے شجر — نہ کھائے گا خود جن کے ہرگز ثمر
بناتا ہے اس قفل کی وہ کلید — بہت کم تھی کھلنے کی جس کے اُمید
سدا ساغرِ تلخ پیتا ہے وہ — مسلسل شہادت میں جیتا ہے وہ
مصیبت میں ہے شوق اس کا مزید — یہی ہے حقیقت میں مردِ شہید
بہت سہل ہے جنگ تلوار کی — ہے دشوار پیکار ایثار کی

کیا جس نے یوں زندہ رہ کر جہاد
کہا مرگ نے بھی اسے زندہ باد

کتابیات

(تصانیف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)

اُردو تصانیف

۱- افکارِ غالب ۱۹۵۴ - ۱۹۶۲ء ناشر ایم معین الدین صاحب -

۲- اسلام کا نظریۂ حیات ۱۹۵۷ء (ترجمہ قطب الدین نظر ثانی شاہ حسین رزاقی)
ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور

۳- تشبیہاتِ رومی ۱۹۵۹ء ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

۴- حکمتِ رومی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

۵- داستانِ دانش انجمن ترقی اُردو ( ) دہلی

۶- فکرِ اقبال ۱۹۵۰ء بزمِ اقبال لاہور

۷- مقدمہ ترجمانِ اسرار ۱۹۶۷ء

۸- دیوانِ حکیم غیر مطبوعہ

انگریزی اشاعت

9. ISLAMIC IDEOLOGY 1951-1953 PRINTED BY, INSITITUTE OF ISLAMIC CULTURE LAHORE.

10. MATAPHYSICS OF ROMI 1959 PRINTED BY INSITITUTE OF ISLAMIC CULTURE LAHORE

11. ISLAM AND COMMUNISM 1951 PRINTED BY INSITITUTE OF ISLAMIC CULTURE LAHORE.

تراجم

۱۲- تاریخ فلسفہ ۱۹۴۸ء دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد

HISTORY OF PHILOSOPHY, A. WCHER.

۱۳ - تاریخ فلسفہ جدید ۱۹۳۱ء دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد

HISTORY OF MODERN PHILOSOPHY, H, HOFFDING VOL-1

۱۴ - تاریخ فلسفہ جدید - جلد دوم ۱۹۳۴ء - دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد -

HISTORY OF MODERN PHILOSOPHY VOL II

۱۵ - مختصر تاریخ فلسفہ یونان ۱۹۳۴ء دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

HISTORY OF GREEK PHILOSOPHY, WELHELEM NESSAL.

۱۶ - نفسیات واردات روحانی ۱۹۵۸ء مجلس ترقی ادب لاہور

VARITIEST OF RELIGIOUS EXPERIENCE BY WILLIAM JAMES.

۱۷ - شمرمین بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ - اتحاد پریس لاہور -

تاریخی و تنقیدی کتب

۱۸ - اردو تنقید پر ایک نظر ۱۹۶۵ء کلیم الدین احمد طبع مع جدید اضافہ نامی پریس لاہور -

۱۹ - الکلام طبع اول ۱۹۵۲ء شبلی نعمانی مکتبہ معین الادب اردو بازار اتحاد پریس لاہور -

۲۰ - اے ہسٹری آف مسلم فلاسفی جلد اول ۱۹۶۳ء ایم ایم شریف

۲۱ - بانگ درا اقبال شیخ مبارک علی لاہور اکتوبر ۱۹۵۹ء

۲۲ - تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم - محمد الدین فوق - کریمی پرنٹنگ پریس لاہور

۲۳ - تواریخ اقوام کشمیر - محمد الدین فوق - کریمی پرنٹنگ پریس لاہور

۲۴ - تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ - سید نذیر نیازی - بزم اقبال - کارواں پریس لاہور ۱۹۵۸ء

۲۵ - تاریخ جمالیات حصہ اول - میر احمد ناصر ایم - اے - مجلس ترقی ادب لاہور

۲۶ - تاریخ جمالیات حصہ دوم - 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۷ - تصوف اسلام عبدالماجد دریا آبادی

۲۸ - تعلیمات غزالی مولانا حنیف ندوی صاحب - ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

۲۹ - تنقیدی اشارے آل احمد سرور انجمن حمایت اسلام پریس لاہور ۱۹۶۳ء
۳۰ - حیات اقبال کا جذباتی دور پروفیسر عثمان مکتبہ جدید -
۳۱ - خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن ۱۹۵۵ء
۳۲ - درس زندگی احمد شاہ پطرس بخاری شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۵ء اور اینڈ ورڈ مرد
۳۳ - داستان تاریخ (اردو) حامد حسن قادری لکشمی نارائن گرپال - تاجر کتب آگرہ طبع دوم ۱۹۵۷ء
۳۴ - دل کی گیتا خواجہ دل محمد دل حجازی پریس لاہور ۱۹۴۵ء
۳۵ - دی ورلڈ آف فلاسفی پروفیسر ایم - ایم شریف ایم اے شو (اردو) - اے - نادر
۳۶ - دیوان غالب شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور
۳۷ - ذکر میر (اردو ترجمہ بعنوان میر کی آپ بیتی از نثار احمد فاروقی - مطبوعہ دہلی ۱۹۵۷ء) -

۳۸ - سرو لبراں مقام طباعت و سن ندارد
۳۹ - سرو لبراں طبع انجمن سن طباعت ندارد
۴۰ - عقلیات ابن تیمیہ مولانا حنیف ندوی صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ
۴۱ - کیفیہ طبع دوم پنڈت کیفی مکتبہ [illegible] الادب لاہور
۴۲ - میرامن سے عبدالحق تک ڈاکٹر سید عبداللہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء

رسائل

۴۳ - یادرفتہ رسائل کراچی ۱۹۶۷ء
۴۴ - اقبال ریویو (خاص شمارہ) شمارہ جنوری ۱۹۶۶ء
۴۵ - اقبال اکتوبر ۱۹۵۲ء

۴۶ - اقبال	اکتوبر ۱۹۵۳
۴۷ - ادبی دنیا	ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶
۴۸ - المعارف	اگست ۱۹۶۸
۴۹ - آج کل	مئی ۱۹۶۶
۵۰ - آجکل (دہلی)	جون ۱۹۶۶
۵۱ - سب رس حیدرآباد دکن (اقبال نمبر)	جون ۱۹۳۸
۵۲ - سہ ماہی اردو (اقبال نمبر)	″ ۱۹۳۸
۵۳ - ماہ نو کراچی	اپریل ۱۹۵۳
۵۴ - ماہ نو	اپریل ۱۹۵۴
۵۵ - ماہ نو	اپریل ۱۹۵۹
۵۶ - نقوش (شخصیات نمبر)	۱۹۵[illegible]
۵۷ - نقوش (لاہور نمبر)	
۵۸ - نگار	ستمبر ۱۹۵۵
۵۹ - استقلال	مارچ ۱۹۵۸
۶۰ - استقلال	مارچ ۱۹۵۹
۶۱ - صحیفہ (خاص شمارہ)	جون جولائی اگست پہلا شمارہ تیسرا سال
۶۲ - صحیفہ	ستمبر ۱۹۵۷
۶۳ - ثقافت	جنوری ۱۹۵۵
۶۴ - ″	فروری ۱۹۵۵
۶۵ - ″	مارچ ۱۹۵۵
۶۶ - ″	اپریل ۱۹۵۵
۶۷ - ″	مئی ۱۹۵۵
۶۸ - ″	جون ۱۹۵۵

۶۹ - نقوش جولائی ۱۹۵۵ء
۷۰ - // اگست ۱۹۵۵ء
۷۱ - // ستمبر ۱۹۵۵ء
۷۲ - // اکتوبر ۱۹۵۵ء
۷۳ - // نومبر ۱۹۵۵ء
۷۴ - // دسمبر ۱۹۵۵ء
۷۵ - // جنوری ۱۹۵۶ء
۷۶ - // فروری ۱۹۵۶ء
۷۷ - // مارچ ۱۹۵۶ء
۷۸ - // اپریل ۱۹۵۶ء
۷۹ - // مئی ۱۹۵۶ء
۸۰ - // جون ۱۹۵۶ء
۸۱ - // جولائی ۱۹۵۶ء
۸۲ - // اگست ۱۹۵۶ء
۸۳ - // ستمبر ۱۹۵۶ء
۸۴ - // اکتوبر ۱۹۵۶ء
۸۵ - // نومبر ۱۹۵۶ء
۸۶ - // دسمبر ۱۹۵۶ء
۸۷ - // جنوری ۱۹۵۷ء
۸۸ - // فروری ۱۹۵۷ء
۸۹ - // مارچ ۱۹۵۷ء
۹۰ - // اپریل ۱۹۵۷ء
۹۱ - // مئی ۱۹۵۷ء

۹۲- ثقافت	جون ۱۹۵۷
۹۳- 〃	جولائی ۱۹۵۷
۹۴- 〃	اگست ۱۹۵۷
۹۵- 〃	ستمبر ۱۹۵۷
۹۶- 〃	اکتوبر ۱۹۵۷
۹۷- 〃	نومبر ۱۹۵۷
۹۸- 〃	دسمبر ۱۹۵۷
۹۹- 〃	جنوری ۱۹۵۸
۱۰۰- 〃	فروری ۱۹۵۸
۱۰۱- 〃	مارچ ۱۹۵۸
۱۰۲- 〃	اپریل ۱۹۵۸
۱۰۳- 〃	مئی ۱۹۵۸
۱۰۴- 〃	اگست ۱۹۵۸
۱۰۵- 〃	ستمبر ۱۹۵۸
۱۰۶- 〃	اکتوبر ۱۹۵۸
۱۰۷- 〃	دسمبر ۱۹۵۸
۱۰۸- 〃	جنوری ۱۹۵۹
۱۰۹- 〃	فروری ۱۹۵۹
۱۱۰- 〃	مئی ۱۹۵۹
۱۱۱- 〃	جون ۱۹۵۹
۱۱۲- 〃	جولائی ۱۹۵۹
۱۱۳- 〃	اگست ۱۹۵۹
۱۱۴- 〃	اکتوبر ۱۹۵۹

۱۱۵ - ثقافت فروری ۱۹۶۰

۱۱۶ - // مارچ ۱۹۶۰

۱۱۷ - // اپریل ۱۹۶۰

۱۱۸ - // مئی ۱۹۶۰

۱۱۹ - // نومبر ۱۹۶۰

۱۲۰ - // (خاص شمارہ) جون جولائی ۱۹۶۰

۱۲۱ - // اپریل ۱۹۶۲

۱۲۲ - // جون ۱۹۶۷

۱۲۳ - ہمایوں ستمبر ۱۹۵۱

۱۲۴ - // اپریل ۱۹۵۲

۱۲۵ - // جنوری ۱۹۵۳

۱۲۶ - // جنوری ۱۹۵۵ پہلا شمارہ

۱۲۷ - // مارچ ۱۹۵۵ تیسرا شمارہ

۱۲۸ - // اپریل ۱۹۵۵ چوتھا شمارہ

۱۲۹ - // جون ۱۹۵۵ چھٹا شمارہ

۱۳۰ - // ستمبر ۱۹۵۵

۱۳۱ - // نومبر ۱۹۵۵

۱۳۲ - // سالنامہ ۱۹۵۸

انٹرویو

۱۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب	مشیر مالیات، مرکزی حکومت پاکستان
۲۔ امتیاز علی تاج صاحب	مرحوم، سابق ناظم مجلس ترقی ادب لاہور
۳۔ حکیم احمد شجاع صاحب	مرحوم، سابق سیکرٹری مجلس زبان دفتری
۴۔ عندلیب شادانی صاحب	مرحوم، سابق صدر شعبہ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی
۵۔ شیخ عبدالحمید عرفانی صاحب	سابق مدیر مجلہ ہلال، پرنسپل گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ
۶۔ اشرف ڈار صاحب	ایڈمنسٹریٹو آفیسر ادارۂ ثقافت اسلامیہ
۷۔ ممتاز حسن صاحب	سابق چیئرمین، ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان
۸۔ مولانا غلام رسول مہر	مسلم ٹاؤن لاہور
۹۔ میاں بشیر احمد صاحب	مرحوم، سابق سفیر ترکیہ و مدیر ہمایوں
۱۰۔ ڈاکٹر نذیر صاحب	سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج
۱۱۔ محمود احمد خان صاحب	سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (بھارت)
۱۲۔ حمید احمد خان صاحب	ناظم مجلس ترقی ادب لاہور
۱۴ پروفیسر محمد سعید شیخ	صدر شعبہ فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور
۱۴۔ سید عابد علی عابد صاحب مرحوم	سابق پرنسپل دیال سنگھ کالج، مدیر شعبہ تصنیف و تالیف مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۵۔ ایف، گلبرگ، لاہور
۱۵۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	
۱۶۔ پروفیسر سی۔ اے۔ قادر صاحب	
۱۷۔ عبداللہ قریشی صاحب	(مدیر ادبی دنیا)
۱۸۔ شاہد حسین رزاقی صاحب	مدیر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور
۱۹۔ مولانا حنیف ندوی صاحب	مدیر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور
۲۰۔ ڈاکٹر محمد باقر صاحب	سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور
۲۱۔ مولانا ڈاکٹر صدر الدین	برانڈرتھ روڈ، لاہور
۲۲۔ عبدالحمید ملک صاحب	لیکچرار، لاء کالج لاہور

٢٣- ایس ایچ ناصر صاحب	شارع پہلوی، تہران
٢٤- پروفیسر عثمان صاحب	پرنسپل گورنمنٹ کالج باغبان پورہ، لاہور
٢٥- شیخ محمد شفیع صاحب	
٢٦- شیخ مبارک علی صاحب	یونائیٹڈ پبلشرز، لاہور
٢٧- شمس الدین صاحب	مکتبہ معین الادب لاہور
٢٨- عباد اللہ صاحب	ایمپریس روڈ لاہور
٢٩- نجم الدین صاحب	ڈیورنڈ روڈ، لاہور
٣٠- معین الدین صاحب	مکتبہ معین الادب، لاہور
٣١- اختر باجی صاحبہ	(خلیفہ صاحب کی بھتیجی)
٣٢- نعیمہ بیگم	(بیگم خلیفہ عبدالحکیم)
٣٣ نادرہ بیگم	خواہر نسبتی خلیفہ عبدالحکیم
٣٤- رفیعہ حسن صاحبہ	(خلیفہ صاحب کی بیٹی) ریڈر شعبہ نفسیات پنجاب یونیورسٹی)
٣٥- عارف حکیم صاحب	(خلیفہ صاحب کا بیٹا)
٣٦- خلیفہ عبدالغنی صاحب	(برادر خلیفہ عبدالحکیم صاحب)
٣٧- خلیفہ عبدالواحد	(برادر خلیفہ عبدالحکیم صاحب)
٣٨- سلیم واحد سلیم	برادر زادہ خلیفہ عبدالحکیم
٣٩- منزل افروز انور شیخ صاحبہ	ایبٹ آباد

مکتوبات

۱ - مجید ملک صاحب (سابق ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ لاہور)

۲ - بشیر احمد ڈار صاحب (ایڈیٹر اقبال ریویو کراچی)

۳ - ممتاز حسن صاحب (صدر ترقی اردو بورڈ کراچی)

۴ - ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب (وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی)

۵ - ڈاکٹر عبداللطیف صاحب (سابق استاد عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد)

۶ - اکبر الدین صدیقی صاحب (پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد)

۷ - انور اقبال قریشی صاحب (مشیر مالیات - مرکزی حکومت پاکستان اسلام آباد)

۸ - خلیفہ عبدالغنی صاحب (برادر خورد خلیفہ عبدالحکیم صاحب)

۹ - رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد بھارت

اشاریہ

اشخاص

مقامات

متفرقات (اقوام و مذہب، ادارے)

(آ، ا)

مقالاتِ حکیم

مرتبہ شاہد حسین رزاقی

پاکستان کے نامور مفکر اور بلند پایہ مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نہایت دقیق مسائل اور مشکل موضوعات پر عام فہم انداز اور سادہ الفاظ میں اظہار خیال کرنے پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ اسلامیات، فلسفہ اور اقبالیات پر ان کی نظر نہایت وسیع تھی۔ کئی کتابوں کے علاوہ خلیفہ صاحب نے متعدد موضوعات پر بڑی تعداد میں مضامین بھی لکھے جن کا مطالعہ ان کے افکار و نظریات سے پوری طرح باخبر ہونے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے ان کے اردو اور انگریزی مضامین اور تقاریر شائع کرنے کا ایک جامع پروگرام بنایا ہے۔

خلیفہ صاحب کے اردو مضامین تین جلدوں میں مقالاتِ حکیم کے نام سے شائع کیے گئے ہیں۔ پہلی جلد میں اسلامیات اور دوسری جلد میں اقبالیات سے متعلق مضامین ہیں اور تیسری جلد متفرق مضامین و تقاریر پر مشتمل ہے۔

جلد اول صفحات 216 ۔ قیمت 5.50 روپے

جلد دوم " 284 ۔ " 6.50 روپے

جلد سوم " 219 ۔ " 5.50 روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۔ کلب روڈ ۔ لاہور

سرورق زرین آرٹ پریس لاہور میں چھپا